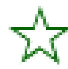
فہرست



پرس رام نے تین دن کی ٹال مٹول کے بعد بدرالزمان کو کوچ کرنے کی اجازت دے دی اور یہ قافلہ مرہٹہ سپاہیوں کی حفاظت میں روانہ ہوا۔ قافلے کے ساتھ تیس بیل گاڑیاں تھیں جن میں سے بعض پر توپیں اور دوسرا سامان لدا ہوا تھا اور باقی زخمیوں اور بیماروں سے بھری ہوئی تھیں۔ بدرالزمان کے علاوہ پانچ بڑے افسر گھوڑوں پر سوار تھے۔ لیگرانڈ کی حالت قدرے بہتر تھی لیکن دو تین میل چلنے کے بعد اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ انور علی نے اس کے قریب آکر اپنا گھوڑا روکا اور اُترتے ہوئے کہا۔ لیگرانڈ اگر تم بیماروں اور زخمیوں کے ساتھ بیل گاڑی پر سفر کرنا پسند نہیں کرتے تو میرے گھوڑے پر سوار ہو جاؤ۔ ابھی تم پیدل چلنے کے قابل نہیں ہو۔

لیگرانڈ نے کچھ دیر پس و پیش کیا لیکن انور علی کے اصرار پر وہ گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد بدرالزمان نے انور علی کی تقلید کی اور اپنا گھوڑا ایک نحیف اور لاغر ساتھی کے حوالے کر دیا۔ اس کی دیکھا دیکھی باقی افسر بھی اپنے گھوڑوں سے اُتر پڑے اور انہیں زیادہ مستحق ساتھیوں کے حوالے کرنے کے بعد قافلے کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔

دوپہر کے قریب مرہٹہ پڑاؤ کی طرف سے کوئی چالیس سرپٹ سوار نمودار ہوئے اور محافظ دستوں کا افسر قافلے کو رُکنے کا حکم دے کر ان کی طرف متوجہ ہوا۔

ان پچاس سواروں میں سے ایک مرہٹہ فوج کا بااثر سردار تھا۔ اس نے قافلے کے قریب پہنچ کر اپنے ساتھیوں کو رُکنے کا حکم دیا۔ پھر آگے بڑھ کر محافظ دستوں کے افسر کے ساتھ کوئی گفتگو کی اور بالآخر بدرالزمان کے قریب آکر کہا۔ آپ کو کچھ دیر

یہاں رُکنا پڑے گا۔

بدرالزمان نے پوچھا۔ یہ آپ کی خواہش ہے یا بھاؤ صاحب کا حکم ہے؟

کچھ سمجھ لیجیے۔

آپ کوئی معقول وجہ بیان کیے بغیر مجھے نہیں روک سکتے۔ یہ معاہدے کی خلاف ورزی ہو گی۔ معاہدہ کی خلاف ورزی آپ کی طرف سے ہوئی ہے۔ ہمیں معلوم ہوا ہے کہ آپ نے قلعہ خالی کرتے وقت بارود کا بہت بڑا ذخیرہ ضائع کر دیا ہے۔

یہ غلط ہے۔ اگر ہمارے پاس بارود ہوتا تو ہم قلعہ خالی نہ کرتے۔

آپ نے صرف بارود ہی ضائع نہیں کیا بلکہ بہت سی فالتو بندوقیں بھی کسی جگہ چھپا دی ہیں۔ انور علی نے آگے بڑھ کر جواب دیا۔ یہ بالکل جھوٹ ہے۔ میں نے تمام فالتو بندوقیں گن کر آپ کے افسروں کے حوالے کی تھیں۔ تم دیکھ سکتے ہو ہمارے کسی سپاہی کے پاس ایک سے زیادہ بندوق یا تلوار نہیں۔

سردار نے کہا۔ بھاؤ صاحب کا حکم ہے کہ آپ اپنی بندوقیں اور تلواریں ہمارے حوالے کر دیں اور یہاں ٹھہر کر ان کے حکم کا انتظار کریں۔ وہ مطمئن ہو جائیں گے کہ آپ نے معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں کی ہے تو آپ کو کوچ کی اجازت مل جائے گی۔

بھاؤ صاحب کا یہ خیال غلط ہے کہ ہم لڑائی میں شکست کھانے کے بعد بے وقوف بھی بن گئے ہیں۔ اگر تمہاری نیت بدل گئی ہے تو میں تمہیں یقین دلاتا ہوں کہ تم صرف لاشوں کے انبار سے بندوقیں تلاش کر سکو گے۔ میرے ساتھی تمہارے آدمیوں کے گھیرے میں ہیں۔ لیکن مرنے سے پہلے وہ آخری بار اپنی بندوقیں اور

تلواریں استعمال کرنے کا موقع کھونا پسند نہیں کریں گے۔

مرہٹہ سردار نے قدرے نرم ہو کر کہا۔ بھاؤ صاحب نے ہمیں آپ سے لڑنے کی اجازت نہیں دی۔

بدر الزمان نے جواب دیا۔ میں بھاؤ صاحب کو بلاوجہ ناراض نہیں کرنا چاہتا۔ لیکن ہمارے لیے سفر جاری رکھنا ضروری ہے۔

آپ کی مرضی لیکن آپ کا فائدہ اسی میں ہے کہ آپ یہاں رُک جائیں۔

اگر بھاؤ صاحب کی نیت خراب ہے تو ہمارے رُکنے یا سفر کرنے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ وہ جب چاہیں ہم پر حملہ کر سکتے ہیں۔

آپ کو بھاؤ صاحب کی نیت کے متعلق شُبہ نہیں کرنا چاہیے۔ وہ صرف آپ سے اس بات کی تسلی حاصل کرنا چاہتے ہیں کہ آپ نے قلعہ خالی کرنے کے متعلق معاہدے کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں کی ہے۔

میں آپ کو جواب دے چکا ہوں کہ ہم نے کسی شرط کی خلاف ورزی نہیں کی ہے لیکن اگر آپ یہ جواب تسلی بخش نہیں سمجھتے تو میں آپ کے ساتھ بھاؤ صاحب کے پاس جانے کے لیے تیار ہوں۔

آپ اس سے زیادہ نیک نیتی کا ثبوت نہیں دے سکتے۔ مجھے یقین ہے کہ آپ سے باتیں کرنے کے بعد بھاؤ صاحب مطمئن ہو جائیں گے۔

انور علی نے مضطرب ہو کر کہا۔ آپ کا یہ فیصلہ درست نہیں۔

لیکن بدر الزمان نے اس کی طرف توجہ دینے کی بجائے مرہٹہ سردار سے مخاطب ہو کر کہا۔ میں آپ کے ساتھ جانے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ پہلے اپنے سپاہیوں سے اس بات کی تسلی کر لیں کہ وہ میرے واپس آنے تک قافلے کو روکنے کی

کوشش نہیں کریں گے۔ بھاؤ صاحب سے ملاقات کے بعد میں فوراً واپس آنا چاہتا ہوں میرے بیس سپاہی میرے ساتھ جائیں گے اور آپ کو ہم سب کے لیے گھوڑے مہیا کرنے پڑیں گے۔

مرہٹہ سردار نے کہا۔ چھ گھوڑے آپ کے پاس ہیں اور پانچ چھ گھوڑوں کا انتظام ہو سکتا ہے۔ آپ کو اس سے زیادہ آدمی ساتھ لے جانے کی ضرورت نہیں۔

بدرالزمان نے جواب دیا۔ مجھے زیادہ آدمی ساتھ لے جانے کا شوق نہیں لیکن میرا محافظ دستہ کسی صورت میرا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کرے گا۔ بہر حال آپ کو کوئی اعتراض ہو تو میں ان کی تعداد کم کرنے کے لیے تیار ہوں۔

مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

تو آپ گھوڑوں کا انتظام کیجیے۔ میں اتنی دیر میں اپنے ساتھیوں کو ضروری ہدایات دیتا ہوں لیکن اس بات کا خیال رکھیے کہ ہمارے پاس جو گھوڑے تھے وہ ان لوگوں کو دے دیے گئے ہیں جو پیدل چلنے کے قابل نہ تھے۔

بہت اچھا آپ تیار ہو جائیں میں گھوڑوں کا انتظام کرتا ہوں۔ سردار نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور مرہٹہ فوج کے افسروں اور سپاہیوں سے باتیں کرنے میں مصروف ہو گیا۔

انور علی نے بدرالزماں کا بازو پکڑ کر سرگوشی کے انداز میں کہا۔ آپ یہ غلطی نہ کریں۔

بدرالزمان نے جواب دیا۔ ان واقعات کے بعد مجھے تمہاری نصیحتوں کی ضرورت نہیں۔ میں جانتا ہوں کہ بھاؤ میرے ساتھ اچھا سلوک نہیں کرے گا۔ لیکن میں تم لوگوں کو موقع دینا چاہتا ہوں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ وہ حملہ کرنے کے لیے تیار

ہیں۔ میں بھاؤ کے پاس اس لیے جارہاہوں کہ تمہیں شام تک سفر کرنے کا موقع مل جائے اور تم رات کی تاریکی سے فائدہ اُٹھا سکو۔ میرے جانے کے بعد مرہٹہ سپاہیوں کو یہ اطمینان ہو جائے گا کہ تم شام کے وقت کہیں رُک کر میرا انتظار کرو گے۔ لیکن تمہاری یہ کوشش ہونی چاہیے کہ تم سفر جاری رکھو۔ کیونکہ تم جتنا مرہٹوں کے پڑاؤ سے دُور ہوتے جاؤ گے اتنا ہی محفوظ ہوتے جاؤ گے۔

پاس ہی مرہٹہ سردار محافظ دستوں کے افسر سے کہہ رہا تھا۔ اگر تمہاری طرف سے کوئی غلطی ہوئی تو بھاؤ صاحب سخت سزا دیں گے۔ راستے میں انہیں کوئی تکلیف نہیں ہونی چاہیے ہمیں ان کے دوستوں کی طرح رخصت کرنا ہے۔

مرہٹہ افسر نے کہا۔ کیا بہتر نہیں ہوگا کہ ہم یہیں پڑاؤ ڈال کر خان صاحب کی واپسی کا انتظار کریں؟

نہیں۔ نہیں۔ بدرالزمان نے آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ ہمارے ساتھ بعض زخمیوں کی حالت بہت نازک ہے اور ہم انہیں جلد از جلد کسی ایسی جگہ پر پہنچانا چاہتے ہیں جہاں سے ان کے لیے طبی امداد حاصل کرسکیں۔ انہیں شام تک سفر کرنے دیجیے۔ میں بہت جلد قافلے کے ساتھ آملوں گا۔

تھوڑی دیر بعد بدرالزمان خان اور اس کے ساتھی پچاس مرہٹہ سپاہیوں کے پہرے میں پرس رام بھاؤ کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہوگئے اور انور علی نے باقی قافلے کو کُوچ کا حکم دیا۔ پانچ بجے کے قریب مرہٹہ سپاہیوں نے ایک جگہ پڑاؤ ڈالنے کا ارادہ کیا۔ لیکن انور علی غروب آفتاب تک سفر کرنے پر مصر تھا اور مرہٹہ فوج کے افسر کو تھوڑی دیر دو قدح کے بعد اس کی بات ماننی پڑی۔

مرہٹوں کے تیور دیکھنے کے بعد قیدیوں کو ان کے عزائم کے متعلق کوئی خوش فہمی

نہ تھی۔ قافلے کے چاروں طرف ان کی نقل و حرکت یہ ظاہر کر رہی تھی کہ وہ حملہ کرنے لے لیے رات کی تاریکی کا انتظار نہیں کریں گے۔

غروبِ آفتاب کے قریب وہ ایک ندی کے کنارے پہنچے۔ مرہٹہ دوستوں کے افسر نے انور علی کے قریب پہنچ کر کہا۔ اب شام ہونے کو ہے اور اس ندی سے تھوڑی دُور آگے جنگل شروع ہو جائے گا۔ اس لیے رات کے وقت پڑاؤ ڈالنے کے لیے اس سے بہتر کوئی اور جگہ نہیں ملے گی۔

انور علی نے کہا۔ ہم رات کے اندھیرے سے پہلے جنگل کے قریب پہنچ جائیں گے اور وہاں کسی جگہ رُک جائیں گے۔

نہیں جناب۔ میرے ساتھی تھک گئے ہیں۔ لیکن اگر آپ بضد ہیں تو ہم ندی کے دوسرے کنارے پر پڑاؤ ڈال دیتے ہیں۔

مرہٹہ افسر نے یہ کہہ کر اپنے گھوڑے کو ایڑ لگادی اور اپنے ساتھیوں سے جاملا۔ پھر آن کی آن میں چند دستے ندی کے کنارے صف بستہ کھڑے ہو گئے اور باقی قافلے کے دائیں بائیں اور عقب میں صفیں درست کرنے لگے۔

انور علی نے بلند آواز سے ہوشیار کہا اور اس کے ساتھیوں نے آنکھ جھپکنے کی دیر میں زمین پر لیٹ کر اپنی بندوقیں سیدھی کرلیں۔ اس کے ساتھ ہی مرہٹوں نے چاروں طرف سے گولیوں کی بارش شروع کردی۔ زمین پر لیٹنے والوں کی نسبت بیل گاڑیوں میں پڑے ہوئے بیماروں اور زخمیوں پر مرہٹہ سپاہیوں نے نشانے زیادہ کامیاب تھے۔ اس کے بعد میسور کے سپاہیوں نے جوابی فائر کیے اور مرہٹہ سپاہی پیچھے ہٹنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن ان کے پاس بارود کی مقدار اتنی قلیل تھی کہ وہ اپنی توپوں کا کام میں نہیں لا سکتے تھے اور مرہٹوں کو اس بات کا علم تھا۔

تھوڑی دیر بعد نیزہ بازوں کا ایک دستہ آگے بڑھا اور تیس چالیس آدمیوں کو زخمی اور ہلاک کرنے کے بعد دوسری طرف نکل گیا۔ پھر دوسری سمت سے نیزہ بازوں کے ایک دستے نے حملہ کیا لیکن اتنی دیر میں میسور کے سپاہی اپنی بندوقیں دوبارہ بھر چکے تھے اور حملہ کرنے والوں کو ان کی فائرنگ نے پسپائی پر مجبور کر دیا۔

چندمنٹ کی لڑائی میں مرہٹوں نے جو نقصان اُٹھایا تھا وہ ان کی توقع سے بہت زیادہ تھا۔ انہوں نے اپنے گھوڑے پیچھے ہٹا دیے اور دُور دُور درختوں اور جھاڑیوں کی آڑ میں بندوقوں کی لڑائی پر اکتفا کرنے لگے۔ لڑائی کے آغاز میں انور علی کے ساٹھ ستر ساتھی جن میں سے بعض پہلے ہی زخمی یا بیمار تھے، شہید ہو چکے تھے لیکن بندوقوں کی لڑائی میں فریقین میں سے کسی کا پلہ بھاری نہ تھا اور جُوں جُوں تاریکی بڑھ رہی تھی میسور کے آدمیوں کے لیے بچ نکلنے کے امکانات زیادہ ہو رہے تھے۔

انور علی نے ایک سرے سے دوسرے سرے تک اپنے ساتھیوں کو یہ پیغام پہنچا دیا تھا کہ اب مرہٹے رات کی تاریکی میں ہم پر حملہ کرنے کی بجائے صبح تک ہمیں اپنے گھیرے میں رکھنے کی کوشش کرینگے۔ اس کے بعد ان کی مزید فوج نہ بھی آئی تو بھی دن کی روشنی میں ہم میں سے کوئی بچ کر نہیں نکل سکے گا۔ اس لیے تمہارے لیے یہی وقت ہے۔ میں ہر شخص کو اجازت دیتا ہوں کہ وہ اپنی جان بچانے کی کوشش کرے۔

میسور کے سپاہی چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں زمین پر رینگتے ہوئے ندی کی طرف کھسکنے لگے اور تھوڑی دیر میں ندی کا گھٹنے گھٹنے پانی عبور کرنے کے بعد دوسرے کنارے پہنچ گئے اور انہوں نے جنگل کی طرف اپنا راستہ روکنے والے مرہٹہ دستوں پر حملہ کر دیا۔ اب تاریکی بڑھ رہی تھی اور دست بدست لڑائی میں دوست اور دشمن کی

تمیز نہ تھی۔ آن کی آن میں مرہٹے افراتفری کے عالم میں دائیں اور بائیں اطراف سمٹ رہے تھے اور میسور کے سپاہی تاریکی سے فائدہ اٹھا کر جنگل کا رُخ کر رہے تھے، انور علی اپنے ساتھیوں کو بھاگنے کا موقع دینے کے لیے دیر تک تیس چالیس سر فروشوں کے ساتھ ندی کے دوسرے کنارے ڈٹا رہا اور انہوں نے جوابی فائرنگ سے دُشمن کو یہ احساس نہ ہونے دیا کہ میدان اب قریباً خالی ہو چکا ہے۔ پھر جب جنوب کی سمت سے دشمن کی چیخ وپکار سنائی دینے لگی تو انور علی نے اپنے ساتھیوں سے کہا۔ اب تمہیں یہاں ٹھہرنے کی ضرورت نہیں۔ تم اپنی جانیں بچانے کی فکر کرو۔ لیکن جانے سے پہلے چند بندوقیں بھر کر میرے پاس رکھ دو اور اپنے لیے آس پاس پڑے ہوئے ساتھیوں کی بندوقیں اُٹھالو۔

ایک ساتھی نے کہا۔ آپ ہمارے ساتھ نہیں جائیں گے؟

نہیں ابھی میرے حصے کا کام ختم نہیں ہوا۔

تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔ اس نے جواب دیا۔

انور علی نے گرج کر کہا۔ تم وقت ضائع کر رہے ہو۔ میں تمہیں حکم دیتا ہوں کہ تم فوراً یہاں سے نکل جاؤ۔

دُوسرا ساتھی بولا۔ لیکن زخمیوں کے متعلق آپ نے کیا سوچا ہے؟

تم ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ تمہاری حماقت کے باعث ان کی تعداد میں اضافہ ضرور ہو سکتا ہے۔

چند منٹ بعد انور علی کے قریب بندوقوں کا ڈھیر لگ چکا تھا اور اس کے ساتھی رات کی تاریکی میں غائب ہو چکے تھے۔ اس نے یکے بعد دیگرے بھری ہوئی بندوقیں اُٹھا کر مختلف سمتوں میں فائرنگ شروع کر دی۔ دشمن پر یہ تاثر ڈالنے کے

لیے کہ فائر کرنے والوں کی تعداد ایک سے زیادہ ہے وہ گھٹنوں اور کہنیوں کے بل چل کر کبھی ایک جگہ اور کبھی دوسری جگہ سے فائر کر رہا تھا۔ اچانک اسے پندرہ بیس قدم کے فاصلے پر بندوق کا دھماکہ سُنائی دیا اور وہ دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا۔ پھر وہ زمین پر رینگتا ہوا آہستہ آہستہ آگے بڑھا۔ تھوڑی دیر بعد ایک اور دھماکہ کے ساتھ اسے بندوق سے نکلتی ہوئی آگ کا شعلہ بھی دکھائی دیا۔ تاریکی میں اپ کے لیے نشانہ باز کو پہچاننا مشکل تھا۔ تاہم اُسے اس بات کی تسلی ہو چکی تھی کہ اس کی بندوق کا رخ دشمن کی طرف ہے۔

تم کون ہو؟ اس نے آہستہ سے کہا۔

موسیو انور علی۔ میں لیگرانڈ ہوں۔ یہ کہہ کر لیگرانڈ رینگتا ہوا اس کے قریب آ گیا انور علی نے کہا۔ لیگرانڈ تم نے یہاں سے نکلنے کی کوشش کیوں نہیں کی۔ میرا خیال تھا کہ تم جنگل میں پہنچ چکے ہو گے۔

میں جنگل کے قریب پہنچ چکا تھا لیکن جب مجھے معلوم ہوا کہ آپ کے ساتھ چند آدمی ابھی تک یہیں ہیں تو مجھے بھاگنے کا ارادہ ترک کرنا پڑا۔

تم نے سخت حماقت کی ہے۔ میرے ساتھ جا چکے ہیں۔

مجھے معلوم ہے میں راستے میں اُن سے ملا ہوں۔

اور اس کے باوجود تم یہاں آئے ہو۔ تمہارا گھوڑا کہاں ہے؟

وہ زخمی ہو گیا ہے۔

مرہٹے اندھا دھند گولیاں برسا رہے تھے۔ انور علی شمال کی طرف فائر کرنے کے بعد کہا تم اپنی بندوق بھر چکے ہو تو مغرب کی طرف فائر کر دو اور میرے ساتھ آؤ۔

لیگرانڈ نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور تھوڑی دیر بعد وہ اس جگہ پہنچ گئے جہاں بندوقوں کا ڈھیر لگا ہوا تھا۔ انور علی نے اپنی خالی بندوق ایک طرف رکھ کر بھری ہوئی بندوق اٹھالی اور کہا۔لیگرانڈ تم نے اچھا نہیں کیا۔تم اپنی جان بچانے کا بہترین موقع کھو چکے ہو لیکن اب بھی ہمت کرو تمہارے بچ نکلنے کے کچھ امکانات باقی ہیں۔

میں آپ کا ساتھ رہوں گا۔لیگرانڈ نے فیصلہ کن لہجے مین جواب دیا۔

لیگرانڈ خدا کے لیے میری بات مان لو یہ خودکشی ہے۔تم یہاں رہ کر مجھے فائدہ نہیں پہنچاسکتے۔

لیگرانڈ نے کہا۔میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ میں یہاں اپنی بہادری یا ایثار کا ثبوت دینے کے لیے نہیں آیا ہوں۔اگر میں بھاگ سکتا تو مجھے شاید اس بات کی پروانہ ہوتی کہ آپ پیچھے رہ گئے ہیں۔مجھے جنگل میں گھرے ہوئے شکار کی طرح مرہٹوں کے ہاتھوں مارا جانا پسند نہ تھا۔میں اس لیے واپس آیا ہوں کہ شاید میرے وجہ سے ایک دوست کی جان بچ جائے۔اب آپ جائیں میں دشمن کو اپنی طرف متوجہ رکھوں گا۔

انور علی نے کہا۔اگر تم میری وجہ سے آئے ہو تو چلو مجھے بلاوجہ مرنا پسند نہیں۔ اگر تم نہ آتے تو بھی میرا ایک گھنٹے سے زیادہ یہاں ٹھہرنے کا ارادہ نہیں تھا۔ہم دنوں یہاں سے نکل سکتے ہیں۔مرہٹے رات کی تاریکی میں اپنے سائے سے بھی ڈرتے ہیں اور مجھے یقین ہے کہ وہ صبح ہونے سے پہلے آگے بڑھ کر صورت حال کا جائزہ لینے کی جرات نہیں کریں گے۔

یہ کہہ کر انور علی یکے بعد دیگرے چند اور فائر کر دیے۔پھر لیگرانڈ کی طرف متوجہ ہو کر کہا چلو!

لیگرانڈ نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ انور علی میں آپ کا ساتھ نہیں دے سکتا۔ میں زخمی ہوں اور یہی وجہ ہے کہ میں واپس آ گیا ہوں۔

چند ثانیے انور علی کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سی۔ پھر وہ جلدی سے آگے بڑھ کر لیگرانڈ کا جسم ٹٹولتے ہوئے بولا۔ زخم کہاں ہے؟

لیگرانڈ نے اس کا ہاتھ پکڑ کر اپنے دائیں کندھے سے ذرا نیچے رکھتے ہوئے کہا۔ یہاں! انور علی کا ہاتھ اس کے تازہ اور گرم خون سے بھیگ گیا۔ ایک ثانیے کے لیے اس کی جسمانی اور ذہنی قوئی جواب دے چکے تھے۔ پھر انے ایک ہی جھٹکے میں لیگرانڈ کی قمیص نوچ ڈالی اور اپنا پٹکا اُتارتے ہوئے کہا۔ تمہارا خون بہہ رہا ہے۔ تم نے مجھے پہلے کیوں نہ بتا دیا کہ تم زخمی ہو؟ انور علی نے پھٹی ہوئی قمیص کے ایک ٹکڑے کو تہہ کر کے گدی بنائی اور لیگرانڈ کے ہاتھ میں دیتے ہوئے کہا۔ اسے زخم کے اوپر دبا رکھو میں پٹی باندھتا ہوں۔

لیگرانڈ نے اس کے حکم کی تعمیل کی اور انور علی اپنے گردوپیش سے بے پرواہ ہو کر پٹی باندھنے میں مصروف ہو گیا۔ لیگرانڈ نے کہا۔ میرے دوست آپ بلاوجہ تکلیف کر رہے ہیں۔ میں جانتا ہوں کہ میرے منزل قریب آ چکی ہے۔ زخمی ہونے کے بعد مجھے خیال تھا کہ مرنے سے پہلے میری زندگی کے آخری چند لمحات شاید ایک دوست کو بچانے کے کام آسکیں۔ لیکن آپ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ آپ میری وجہ سے مُصیبت میں پھنس گئے ہیں۔ اگر آپ میری موت کے لمحات کو میرے لیے بہت زیادہ تکلیف دہ نہیں بنانا چاہتے تو یہاں سے نکل جائیے۔

انور علی نے کہا۔ تم زخمی ہو کر میرے پاس آئے ہو۔ میری تلاش میں آئے ہو اور پھر مجھ سے یہ توقع رکھتے ہو کہ میں تمہیں اس حال میں چھوڑ کر چلا جاؤں۔ اگر تم

میری جان بچانا چاہتے ہو تو تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کچھ دور چل سکتے ہو یا نہیں؟

لیگرانڈ نے جواب دیا۔ آپ کی جان بچانے کے لیے میں کئی میل چل سکتا ہوں

بہت اچھا، تم تھوڑی دیر یہاں میرا انتظار کرو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔

آپ کہاں جا رہے ہیں؟

میں آ کر بتاؤں گا۔ انور علی یہ کہہ کر اٹھا اور پوری رفتار سے ایک طرف بھاگنے لگا۔

لیگرانڈ قریباً نصف گھنٹہ بے حس و حرکت پڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ اضطراب کی حالت میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مرہٹے اب مختلف اطراف سے اندھا دھند گولیاں برسانے کی بجائے اکا دُکا فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔ اچانک اُسے ایک طرف سے آگے کا چھوٹا سا شعلہ دکھائی دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد جب آگ کا شعلہ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا تو اسے پاس ہی کسی بھاگتے ہوئے انسان کے قدموں کی آہٹ سُنائی دینے لگی۔

انور علی میں یہاں ہوں۔ اس نے کہا۔

انور علی ہانپتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہا اب اُٹھو!

لیگرانڈ اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیا۔ کوئی تیس چالیس قدم چلنے کے بعد انہیں چاروں اطراف دشمن کی چیخ و پکار سنائی دی۔ انور علی اور لیگرانڈ دوبارہ زمین پر لیٹ گئے۔ آگ کا شعلہ پھیل کر ایک بہت بڑا الاؤ بنتا جا رہا تھا اور میدان میں دُور دُور تک روشنی پھیل رہی تھی لیگرانڈ نے انور علی کو آگے کے شعلوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے

میری جان بچانا چاہتے ہو تو تمہیں ہمت سے کام لینا پڑے گا۔ مجھے یہ بتاؤ کہ تم کچھ دور چل سکتے ہو یا نہیں؟

لیگرانڈ نے جواب دیا۔ آپ کی جان بچانے کے لیے میں کئی میل چل سکتا ہوں

بہت اچھا۔ تم تھوڑی دیر یہاں میرا انتظار کرو۔ میں ابھی واپس آتا ہوں۔

آپ کہاں جا رہے ہیں؟

میں آکر بتاؤں گا۔ انور علی یہ کہہ کر اٹھا اور پوری رفتار سے ایک طرف بھاگنے لگا۔

لیگرانڈ قریباً نصف گھنٹہ بے حس و حرکت پڑا اس کا انتظار کرتا رہا۔ بالآخر وہ اضطراب کی حالت میں اُٹھ کر بیٹھ گیا۔ مرہٹے اب مختلف اطراف سے اندھا دھند گولیاں برسانے کی بجائے اکا دُکا فائر کرنے پر اکتفا کر رہے تھے۔ اچانک اُسے ایک طرف سے آگ کا چھوٹا سا شعلہ دکھائی دیا۔ پھر تھوڑی دیر بعد جب آگ کا شعلہ آہستہ آہستہ بلند ہو رہا تھا تو اسے پاس ہی کسی بھاگتے ہوئے انسان کے قدموں کی آہٹ سُنائی دینے لگی۔

انور علی میں یہاں ہوں۔ اس نے کہا۔

انور علی ہانپتا ہوا آگے بڑھا اور اس نے کہا اب اُٹھو!

لیگرانڈ اُٹھ کر اُس کے ساتھ چل دیا۔ کوئی تیس چالیس قدم چلنے کے بعد انہیں چاروں اطراف دشمن کی چیخ و پکار سنائی دی۔ انور علی اور لیگرانڈ دوبارہ زمین پر لیٹ گئے۔ آگ کا شعلہ پھیل کر ایک بہت بڑا الاؤ بنتا جا رہا تھا اور میدان میں دُور دُور تک روشنی پھیل رہی تھی لیگرانڈ نے انور علی کو آگے کے شعلوں کی طرف متوجہ کرتے ہوئے

کاہ۔موسیو آپ سامان کی گاڑیوں کو آگے لگا کر آئے ہیں۔

ہاں!

لیکن کیوں۔اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

تم بے حس و حرکت پڑے رہو۔ میں دُشمن کو یہ دکھانا چاہتا ہوں کہ اب یہاں لاشوں اور کراہتے ہوئے زخمیوں کے سوا کچھ نہیں۔

میں بھی حیران تھا کہ آپ نے اتنی دیر کیوں لگائی ہے؟

انور علی نے کہا۔دس بارہ گاڑیوں کے بیل کھولنا۔پھر بعض گاڑیوں سے لاشیں اُتارنا اور پھر انہیں ایک جگہ جمع کر کے آگ لگانا معمولی کام نہ تھا۔

لیکن اس سے کیا فائدہ ہوگا؟

مرہٹوں کو معلوم ہے ان گاڑیوں پر ہمارا خزانہ بھی ہے۔وہ ہر قیمت پر آگ بجھانے کی کوشش کریں گے اور میں نے تمام روپیہ نکال کر الاؤ کے گرد بکھیر دیا ہے۔ تم تھوڑی دیر میں ایک عجیب تماشا دیکھو گے۔دیکھو وہ آرہے ہیں۔اب دم بخود ہو کر پڑے رہو۔اس طرف سے کئی آدمی گزریں گے اور تمہیں یہ ظاہر کرنا پڑے گا کہ تم ایک لاش ہو۔

لیگرانڈ نے کہا میں نہیں جانتا کہ ہمیں اس سے کیا فائدہ ہوگا آپ کا یہ کھیل دلچسپ ضرور ہے۔چند منٹ بعد میدان میں دُور دُور روشنی پھیل چکی تھی اور پیدل اور سوار مرہٹے چیختے چلاتے الاؤ کی طرف بڑھ رہے تھے۔مرہٹوں کی چند ٹولیاں انور علی اور لیگرانڈ کے قریب سے گزر گئے۔پھر سواروں کا ایک دستہ نمودار ہوا اور انور علی نے جلدی سے اُٹھ کر لیگرانڈ کا بازو پکڑتے ہوئے کہا اب اٹھو!۔

چند سواروں کے گھوڑے ان کے سر پر آچکے تھے اور انور علی نے بڑی مشکل

سے لیگرانڈ کو کھینچ کر پیچھے ہٹایا۔ جب وہ گزر گئے تو لیگرانڈ نے کہا۔ اب یہاں سے نکلیے۔ وہ آگ کی روشنی میں ہمیں پہچان لیں گے۔

تم اطمینان رکھو۔ اب کوئی ہماری طرف متوجہ نہیں رہے گا۔ تھوڑی دیر پہلے میرے سامنے یہ مسئلہ تھا کہ میں تمہیں گھوڑے کے بغیر یہاں سے کیسے نکال سکوں گا۔ لیکن اب اگر چاہو تو میں تمہارے لیے بیس گھوڑے حاصل کر سکتا ہوں۔

وہ کیسے؟

تمہیں ابھی معلوم ہو جائے گا۔

انور علی کی چال اس کی توقع سے زیادہ کامیاب تھی۔ جو لوگ جلتی ہوئی گاڑیوں کے قریب پہنچ چکے تھے وہ آگ بجھانے کی بجائے سونے چاندی کے چمکدار سکوں کی طرف متوجہ ہو چکے تھے، ان کا سالار گھوڑا بھگاتا ہوا آیا اور چلا چلا کر کہنے لگا۔ بیوقوفو تم یہاں کیا کر رہے ہو۔ دشمن کے سینکڑوں آدمی ہمارے ہاتھ سے بچ کر نکل گئے ہیں۔ تم ان کا پیچھا کیوں نہیں کرتے۔ ان گاڑیوں کی پروانہ کرو۔ تمہیں کیا ہو گیا ہے۔ تم کیا کر رہے ہو؟

اور جب اسے یہ معلوم ہوا کہ وہ کیا کر رہے ہیں تو اس نے خود بھی گھوڑے سے چھلانگ لگا دی۔ لیکن اپنے زیادہ مُستعد ساتھیوں کے دھکے کھانے کے بعد وہ ایک طرف ہٹ کر پوری قوت سے چلا رہا تھا۔ بدمعاشو یہ رُوپیہ سرکاری ہے۔ اگر تم پیچھے نہ ہٹے تو میں سواروں کو حملہ کرنے کا حکم دے دوں گا۔

لیکن موقع پر پہنچنے والے سوار پیادوں سے سبقت لے جانے کی کوشش کر رہے تھے اور ان کے خالی گھوڑے اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ ایک افسر اپنے سپاہی کا گریبان پکڑ کر چلا رہا تھا۔ بدمعاش تم نے میرا گھوڑا کیوں چھوڑ دیا۔ اور سپاہی کہہ

رہا تھا۔ مہاراج مجھ غریب پر ظلم نہ کیجیے۔ بھگوان کے لیے مجھے چھوڑ دیجیے۔ میرے پانچ بچے ہیں۔ آپ کا گھوڑا کہیں بھاگ نہیں جائے گا۔ دیکھیے سب گھوڑے یہاں پھر رہے ہیں۔ پھر اچانک اسے زمین پر پڑا ہوا سکہ دکھائی دیا اور وہ اپنی قمیض کا ایک ٹکڑا افسر کے ہاتھ میں چھوڑ کر بھاگ نکلا۔

انور علی وار لیگر انڈ آگے بڑے اور انہوں نے اطمینان سے دو آوارہ گھوڑوں کی باگیں پکڑ لیں اور تھوڑی دور جا کر ان پر سوار ہو گئے۔ الاؤ کے گرد ہجوم کی افراتفری کا یہ عالم تھا کہ بعض آدمی اپنے ساتھیوں کے پاؤں تلے روندے جا رہے تھے۔ ہجوم کے ریلے میں ایک سپاہی کے پاؤں اُکھڑ گئے اور وہ ایک جلتی ہوئی گاڑی کے پہیے پر گر پڑا۔ آن کی آن میں اس کے کپڑوں کو آگ لگ گئی اور وہ چیخیں مارتا ہوا ادھر ادھر بھاگنے لگا لیکن کسی نے اس پر توجہ دینے کی ضرورت محسوس نہ کی۔

سترھواں باب

انور علی اور لیگر انڈ ندی عبور کرنے کے بعد جنگل میں داخل ہوئے اور تھوڑی دیر بعد انور علی نے کہا۔ اب ہمیں صبح تک دشمن کی طرف سے کوئی خطرہ نہیں لیکن یہ ضروری ہے کہ ہم باقی رات چلتے رہیں۔

لیگر انڈ نے جواب دیا۔ میں آپ کا ساتھ دینے کی کوشش کروں گا۔

انور علی نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور لیگر انڈ اس کے پیچھے ہولیا۔ کوئی ایک گھنٹہ جنگل کی تنگ پگڈنڈی پر سفر کرنے کے بعد انور علی نے اپنا گھوڑا روکا اور مڑ کر لیگر انڈ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیگر انڈ اب تمہیں محتاط رہنا چاہیے میں اب یہ راستہ چھوڑ کر جنگل عبور کرنا چاہتا ہوں۔

لیگر انڈ نے نحیف آواز میں جواب دیا۔ میرے دوست میری طاقت جواب دے رہی ہے۔ میں بڑی مشکل سے گھوڑے کی زین پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا ہوں۔

انور علی نے کہا۔ اب تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ یہ علاقہ ہمارے لیے انتہائی غیر محفوظ ہے۔

بہت اچھا چلیے۔ لیکن میرے ساتھ اس بات کا وعدہ کیجیے کہ اگر میں کسی جگہ گھوڑے سے گر پڑوں تو آپ اپنا سفر جاری رکھیں گے۔

میں تمہارے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر میں تمہیں ساتھ نہ لے جا سکا تو میری منزل سرنگا پٹم نہیں ہو گی۔ میں جین کو یہ پیغام دے سکوں گا کہ میں تمہارے زخمی شوہر کو جنگل میں چھوڑ کر بھاگ آیا ہوں۔

قریباً دو گھنٹے بعد جنگل میں ایک اور چھوٹی سے ندی عبور کرتے ہوئے لیگر انڈ نے کہا۔ ٹھہریے میں سخت پیاس محسوس کر رہا ہوں۔ پھر وہ کسی توقف کے بغیر اپنے

گھوڑے سے اُتر پڑا۔ انور علی نے گھوڑے سے کُود کر اسے سہارا دیا اور ندی کے کنارے بیٹھا دیا۔لیگرانڈ پانی کے چند چلو پینے کے بعد بولا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں تھوڑی دیر سستا لوں۔

انور علی نے شفقت آمیز لہجے میں جواب دیا۔میرے خیال میں یہ جگہ محفوظ ہے تم چند منٹ آرام کر سکتے ہو۔

لیگرانڈ کنارے سے ذرا ہٹ کر زمین پر لیٹ گیا۔ انور علی نے گھوڑوں کی لگامیں ایک درخت کی ٹہنی کے ساتھ باندھ دیں اور لیگرانڈ کے قریب بیٹھ کر اس کا سر زانو پر رکھ لیا۔

معلوم ہوتا ہے کہ تم بہت زیادہ تکلیف محسوس کر رہے ہو؟ اس نے کہا۔

اب تکلیف زیادہ نہیں لیکن گھوڑے پر میری حالت بہت خراب تھی۔

انور علی نے لیگرانڈ کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا اور پھر اضطراب کی حالت میں زخم کے آس پاس اس کا سینہ ٹٹولنے لگا۔ اچانک اس نے اپنی انگلیوں پر نمی محسوس کی اور بولا۔ معلوم ہوتا ہے تمہارا خون بند نہیں ہوا اس پٹی کو کس کر باندھنے کی ضرورت ہے۔

بہت اچھا۔ لیکن جلدی کیجیے مجھے اس جنگل میں مرنا پسند نہیں۔

انور علی نے جلدی سے پٹی کھولی اور زخم پر ایک نیا پھاہا رکھنے کے بعد دوبارہ کس کر باندھ دیا۔ پھر اس نے ندی کے پانی سے اپنے ہاتھ دھوئے اور دوبارہ لیگرانڈ کے قریب بیٹھ گیا۔

لیگرانڈ نے کراہتے ہوئے کہا۔ راستے میں ہمیں اپنا کوئی ساتھ نہیں ملا۔ میں حیران ہوں کہ وہ اس وقت کہاں ہوں گے۔

وہ جانتے ہیں کہ ان کے لیے کوئی راستہ محفوظ نہیں۔ وہ ادھر ادھر منتشر ہو کر جنگل عبور کر رہے ہوں گے۔ اگر ہم پیدل ہوتے تو ممکن تھا کہ اب تک کسی آدمی ہمارے ساتھ ہو چکے ہوتے لیکن تاریکی میں ہمارے گھوڑوں کی آہٹ انہیں ہم سے دور رکھنے کے لیے کافی تھی۔

آپ کا کیا خیال ہے وہ بچ نکلنے میں کامیاب ہو جائیں گے؟

مجھے اندیشہ ہے کہ اگر دشمن کے سواروں نے صبح کے وقت پیچھا کیا تو وہ کئی آدمیوں کو گرفتار کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ تاہم اگر ہمارے ساتھیوں نے رات کے وقت غلط راستے اختیار نہ کیے تو بہت سے آدمیوں کے بچ نکلنے کا امکان ہے۔ میں ان لوگوں کے متعلق بہت پریشان ہوں جو زخمی ہیں۔ وہ شاید زیادہ دُور نہ جا سکیں۔

لیگرانڈ اور انور تھوڑی دیر خاموش بیٹھے رہے۔ اچانک آس پاس جھاڑیوں اور درختوں کی شاخوں میں ہلکا سا ارتعاش پیدا ہوا اور اُن کے گھوڑے بدحواس ہو کر اُچھلنے لگے۔ لیگرانڈ اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے سہمی ہوئی آواز میں کہا۔ خدا کے لیے آپ بھاگ جائیں ہم دشمن کے گھیرے میں آ چکے ہیں۔

انور علی نے جواب دیا۔ یہ ہمارے ساتھی ہیں دشمن کے آدمی نہیں ہو سکتے۔ تم اطمینان سے پڑے رہو۔ پھر اس نے بلند آواز میں کہا۔ اگر تم مرہٹہ فوج کے سپاہی نہیں ہو تو یہاں تمہارے لیے کوئی خطرہ نہیں۔ میں انور علی ہوں۔

ایک آدمی نے درخت سے نمودار ہو کر کہا۔ جناب میں نے آپ کی آواز پہچان لی تھی لیکن آپ کسی اور زبان میں باتیں کر رہے تھے اور یہ بیوقوف آپ کو انگریز سمجھتے تھے۔ ہمیں آپ کے گھوڑوں کی ٹاپ سے دھوکا ہوا تھا۔

انور علی نے کہا۔ خدا کا شکر ہے کہ تم نے رات کے وقت ہمیں گولیوں کا نشانہ بنانے کی کوشش نہیں کی۔

تھوڑی دیر میں پچیس تیس آدمی ان کے گرد جمع ہو گئے۔ انور علی نے کہا تمہارے اب یہاں ٹھہرنے اور باتیں کرنے کا وقت نہیں تم اپنا سفر جاری رکھو!

لیکن آپ؟ کسی نے سوال کیا۔

لیگرانڈ زخمی ہے اور اسے چند منٹ آرام کی ضرورت ہے۔ ایک سپاہی نے کہا۔ جناب اگر یہ بات ہے تو ہم آپ کے ساتھ چلیں گے۔ انور علی نے جواب دیا۔ تم ہماری کوئی مدد نہیں کر سکتے۔ ہمارے پاس گھوڑے ہیں اور ہم تھوڑی دیر تک ان پر سوار ہو کر تم سے آملیں گے لیکن اگر ہم کسی اور سمت نکل جائیں تو تمہیں ہمارا انتظار نہیں کرنا چاہیے۔

لیگرانڈ انور علی کا ہاتھ پکڑتے ہوئے فرانسیسی زبان میں بولا۔ آپ ان سے میرے ساتھیوں کے متعلق پوچھیے۔

انور علی نے سپاہیوں کی طرف متوجہ ہو کہا۔ تم میں سے کسی کو ہمارے یورپین ساتھیوں کے متعلق علم ہے؟

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ جناب میں اُن کے ساتھ تھا۔ میدان سے نکلتے وقت ان کا ایک ساتھی زخمی ہو گیا تھا اور جنگل کے قریب پہنچتے پہنچتے اس کی حالت خراب ہو گئی تھی اور انہوں نے یہ فیصلہ کیا تھا کہ وہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالے کر دیں، وہ لیگرانڈ کو تلاش کرنا چاہتے تھے۔ا

انور علی نے کہا۔ اچھا تم روانہ ہو جاؤ۔ تمہارے لیے جنوب مغرب کی سمت زیادہ محفوظ ہو گی۔

ہم بہت جلد تم سے آملیں گے۔

ایک سپاہی نے پوچھا جناب آپ کو خاں صاحب کے متعلق کوئی اطلاع ملی؟

نہیں لیکن تم وقت ضائع نہ کرو۔

یہ لوگ دوبارہ جنگل میں گائب ہو گئے اور انور علی کوئی آدھ گھنٹہ اور لیگر انڈ کے ساتھ رہا۔ بالآخر لیگر انڈ نے کہا۔ میرا خیال ہے کہ میں اب تھوڑی دیر گھوڑے پر سواری کر سکتا ہوں۔

انور علی نے اسے سہارا دے کر بٹھایا اور پھر اس کے گھوڑے کی باگ کھول کر اس کے ہاتھ میں تھما دی۔ تھوڑی دیر بعد وہ اپنے ساتھیوں سے جا ملے لیگر انڈ کی حالت پھر خراب ہو رہی تھی اور وہ بڑی مشکل سے گھوڑے کی زین پر بیٹھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ انور علی نے اپنا گھوڑا ایک زخمی کے حوالے کر دیا اور خود لیگر انڈ کے گھوڑے کی باگ پکڑ کر آگے آگے چلنے لگا۔ راستے میں صبح تک ان کے ساتھ کوئی ڈیڑھ سو آدمی شامل ہو چکے تھے۔ لیگر انڈ کی حالت قابلِ رحم تھی۔ اس کی گردن جھکی ہوئی تھی اور وہ دونوں ہاتھوں سے زین کا ہرنا پکڑ کر اپنا توازن قائم رکھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

طلوعِ آفتاب سے تھوڑی دیر بعد ایک چھوٹی سے جھیل کے قریب پہنچ کر انور علی نے اپنے ساتھیوں کو رُکنے کا حکم دیا۔ لیگر انڈ کو گھوڑے سے اُتار کر زمین پر لٹا دیا گیا۔ بعض سپاہیوں نے اپنے تھیلوں سے باسی روٹیاں نکال کر اپنے ساتھیوں میں تقسیم کر دیں اور وہ جھیل کے کنارے بیٹھ گئے۔ انور علی کا ایک ساتھی جراحی کا کچھ تجربہ رکھتا تھا۔ اس نے پٹی کھول کر لیگر انڈ کے زخم کا معائنہ کرنے کے بعد کہا۔ گولی زیادہ دُور نہیں گئی۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں گولی نکال کر زخم کو داغ دیتا ہوں۔

ورنہ تھوڑا تھوڑا خون اسی طرح رستا رہے گا۔

اگر تم سمجھتے ہو کہ اس طرح ان کی جان بچ جائے گی تو میں تمہیں اجازت دینے کے لیے تیار ہوں۔

اس نے لیگرانڈ کی نبض پر ہاتھ رکھنے کے بعد فکر مند سا ہو کر کہا۔ اگر ان کا بُخار اتنا تیز نہ ہوتا تو میرا کام نسبتاً آسان ہوتا لیکن اب میں کوئی بات یقین کے ساتھ نہیں کہہ سکتا۔ راستے میں ان کا بہت سا خُون ضائع ہو چکا ہے اور مجھے ڈر ہے کہ ایسی حالت میں زخم داغنے کی تکلیف ان کے لیے ناقابلِ برداشت ہوگی۔

لیگرانڈ نے مُلتجی نگاہوں سے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ انور علی پہلے میں اس بات پر مصر تھا کہ آپ مجھے وہیں چھوڑ دیں اور اپنی جان بچانے کی فکر کریں۔ لیکن اب میری آخری خواہش یہ ہے کہ میں موت سے پہلے جین کو دیکھ لوں۔ اگر کوئی صُورت ہو سکتی ہے تو مجھے سرنگا پٹم پہنچانے کی کوشش کریں۔ میں جانتا ہوں کہ آپ اس جنگل میں میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔

انور علی نے کرب کی حالت میں گردن جھکا لی اور اس کے ایک ساتھی نے کہا۔ جناب مجھے ان کی حالت ٹھیک معلوم نہیں ہوتی۔ ہماری کوشش یہی ہونی چاہیے کہ انہیں کسی تاخیر کے بغیر کسی محفوظ مقام پر پہنچا دیا جائے۔ انہیں کسی قابل جراح کی ضرورت ہے اور اگر ہم چتل ڈرگ پہنچ جائیں تو وہاں ان کا علاج ہو سکتا ہے۔

انور علی نے دوسرے آدمی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ تم اِحتیاط سے پٹی باندھو۔ اب یہاں سے آگے ان کے لیے گھوڑے کا سفر بھی ٹھیک نہیں ہوگا۔ میں انہیں اٹھانے کے لیے ایک کھٹولا تیار کرواتا ہوں۔

انوع علی کے ساتھیوں نے جلدی سے چند لکڑیاں کاٹیں اور انہیں ایک دوسرے کے ساتھ باندھ کر ایک کھٹولا تیار کر دیا۔ پھر انور علی اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ میرے دوستو میں جانتا ہوں کہ تم بہت تھکے ہوئے ہو اور تمہیں چند گھنٹے آرام کی ضرورت ہے لیکن لیگر انڈ کی جان بچانے کے لیے مجھے چند ایسے رضا کاروں کی ضرورت ہے جو اسی وقت میرے ساتھ روانہ ہونے کے لیے تیار ہوں۔

یہ سُنتے ہی چند آدمی اُٹھ کر کھڑے ہو گئے اور انہوں نے کہا۔ جناب ہم سب آپ کا ساتھ دینے کے لیے تیار ہیں۔

مجھے صرف آٹھ جفاکش آدمیوں کی ضرورت ہے۔

ایک سپاہی نے کہا۔ جناب ہم میں سے کوئی بھی پیچھے رہنا پسند نہیں کریگا۔ اس لیے آپ خود اپنی مرضی کے آٹھ آدمی منتخب کر لیں۔

انور علی نے یکے بعد دیگرے آٹھ آدمیوں کی طرف اشارہ کیا اور باقی ساتھیوں سے علیحدہ ہو کر ایک طرف کھڑے ہو گئے۔ اچانک انہیں ایک طرف سے گھوڑے کی ٹاپ سُنائی دی اور ایک سپاہی نے چوکنا ہو کر کہا جناب کوئی اس طرف آ رہا ہے۔

انور علی نے کہا۔ معلوم ہوتا ہے کہ وہ تنہا ہے تاہم تم چُپ چاپ منتشر ہو کر چھپ جاؤ!

انور علی کے ساتھیوں نے جلدی سے لیگر انڈ کو کھٹولے پر ڈالا اور اُسے اُٹھا کر پاس ہی گھنے درختوں کی آڑ میں لے گئے۔ باقی آدمی بھی اِدھر اُدھر روپوش ہو گئے۔

تھوڑی دیر بعد ایک سوار جھیل کے کنارے پہنچا اور انور علی درختوں کی آڑ سے باہر نکل کر بلند آواز میں چلایا بھئی کوئی خطرہ نہیں یہ ہمارا ساتھی ہے۔

سورا انور علی کو دیکھتے ہی گھوڑے سے کود پڑا اور بھاگتا ہوا اس کے قریب پہنچا۔ یہ اُن آدمیوں میں سے ایک تھا جو بدر الزمان کے ساتھ مرہٹوں کے پڑاؤ کی طرف روانہ ہوئے تھے۔اس نے کہا۔ جناب خدا کا شکر ہے کہ آپ زندہ ہیں۔

تم بدر الزمان کو کہاں چھوڑ آئے ہو۔انور علی نے سوال کیا۔

جناب وہ پرس رام کی قید میں ہیں۔ مرہٹوں نے راستے میں حملہ کر کے ہمارے تین ساتھ قتل اور چار پانچ زخمی کر دیے تھے۔بدر الزمان خاں بھی زخمی ہو گئے تھے۔اس کے بعد وہ ہمیں قیدی بنا کر پرس رام کے پاس لے گئے۔وہ بظاہر مرہٹہ سپاہیوں کی اس کارگزرری پر بہت نادم تھا لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سب کچھ اس کے ایما پر ہوا ہے۔اس نے بدر الزمان کو یقین دلایا تھا کہ اب ان کے ساتھ کوئی زیادتی نہیں ہونے دی جائے گی۔اور اس نے ان کے علاج کے لیے انگریزی فوج کا ایک ڈاکٹر بھی بلا لیا تھا۔تاہم جب انہوں نے یہ پوچھا کہ ہمیں واپس جانے کی اجازت کب ملے گی تو بھاؤ نے کہا تھا کہ جنگ کے زمانے میں آپ لوگ میرے مہمان ہیں اور میں نے یہ فیصلہ کیا ہے کہ آپ کو نرگنڈ بھیج دیا جائے مجھے آدمی رات کے وقت بھاگنے کا موقع مل گیا تھا۔

تم نے راستے میں مرہٹوں کی فوج دیکھی ہے؟

جی نہیں میں مغرب کی سمت سے ایک لمبا چکر لگانے کے بعد اس طرف آیا ہوں۔ چند اور سوالات پوچھنے کے بعد انور علی اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور بولا۔ ابھی تم لوگ خطرے کی حدود سے باہر نہیں نکلے اس لیے تمہیں زیادہ دیر یہاں قیام نہیں کرنا چاہیے۔ اگر دشمن پیچھا کرے تو تمہارے لیے لڑنے کی بجائے منتشر ہو کر جنگل میں چھپنے کی کوشش کرنا بہتر ہو گا۔رات کے وقت یہ جنگل تمہارے لیے

زیادہ محفوظ ہو گا اور تم کسی خطرے کے بغیر اپنا سفر جاری رکھ سکو گے۔ میں دورا گھوڑا بھی تمہارے حوالے کرتا ہوں اور یہ فیصلہ کرنا تمہارا کام ہے کہ اس پر سواری کا سب سے زیادہ مستحق کون ہے۔

جس وقت انور علی یہ باتیں کر رہا تھا۔ مرہٹہ فوج کے چند دستے جو صبح ہوتے ہی بھاگنے والوں کی تلاش میں روانہ ہو چکے تھے اس مقام سے کوئی پانچ میل دور مشرق کی طرف میسور کے پچاس ساٹھ سپاہیوں کو قتل کرنے اور کوئی ڈیڑھ سو آدمیوں کو گرفتار کرنے کے بعد واپس جا رہے تھے۔

دوپہر کے وقت جنگل ختم ہو چکا تھا اور سامنے ایک میل کے فاصلے پر ایک گاؤں نظر آ رہا تھا۔ انور علی نے اپنے ساتھیوں کو رکنے کے لیے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ تم تھوڑی دیر یہاں ٹھہرو میں ابھی اس بستی سے ہو کر واپس آتا ہوں۔ اگر یہ علاقہ محفوظ ہے تو ہم سفر جاری رکھ سکیں گے۔ ورنہ شام تک ہمیں یہیں ٹھہرنا پڑے گا۔

انور علی کے ساتھیوں نے لیگرانڈ کو جھاڑیوں کی آڑ میں اُتار دیا اور انور علی بستی کی طرف روانہ ہو گیا۔ تھوڑی دُور آگے مویشیوں کا ایک ریوڑ چر رہا تھا اور تین چرواہے ایک درخت کی چھاؤں میں سو رہے تھے۔ انور علی نے ایک چرواہے کے قریب جا کر اسے جگایا اور کہا کیوں بھی وہ تمہارا گاؤں ہے؟

چرواہے نے ہڑبڑا کر اٹھتے ہوئے جواب دیا۔ جی ہاں۔

انور علی نے اپنی جیب سے ایک پگوڈا (چاندی کا سکہ) نکال کر اس کے ہاتھ پر رکھ دیا اور پوچھا۔ یہاں آس پاس مرہٹہ سپاہیوں کی کوئی چوکی ہے؟

چرواہے نے غور سے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ جناب اگر آپ میسور کے سپاہی ہیں تو آپ کو یہ پوچھنے لیے پگوڈا دینے کی ضرورت نہ تھی۔ ہم سُلطان ٹیپو کی

رعایا ہیں۔یہ واپس لے لیجیے۔

انور علی نے کہا۔میرے دوست میرا مقصد تمہاری توہین نہ تھا۔یہ اپنے پاس رکھو اور میرے سوال کا جواب دو۔

چرواہے نے کہا جناب مرہٹوں کی چوکی ہمارے گاؤں میں تھی۔لیکن اب ان کا کوئی آدمی وہاں نہیں ہے۔

وہ وہاں سے چلے گئے ہیں؟

جناب وہ گئے نہیں بلکہ میسور کے سپاہیوں کی قید میں ہیں۔انہوں نے ہمیں بہت تنگ کیا ہوا تھا۔انہوں نے ہمارے گھر لوٹ لیے تھے اور ہمارے سردار کو بہت ذلیل کیا تھا۔کل رات خدا نے ہماری فریاد سن لی۔وہ شراب سے مدہوش سو رہے تھے کہ آدھی رات کے وقت ہمیں ان کی چیخیں سنائی دیں اور پتہ چلا کہ میسور کے سپاہی پہنچ گئے ہیں اور انہوں نے چوکی پر قبضہ کر لیا ہے۔

چوکی میں مرہٹوں کے کتنے آدمی تھے؟

جناب پہلے تو ان کی تعداد سو کے لگ بھگ تھی لیکن چند دنوں سے صرف بیس آدمی رہ گئے تھے۔جناب آپ کہاں سے آ رہے ہیں؟

میں بہت دور سے آیا ہوں۔انور علی یہ کہہ کر بستی کی طرف بھاگنے لگا۔تھوڑی دیر بعد وہ گاؤں کے سردار کی حویلی کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا اور ڈھونڈیا داغ کے علاوہ پچاس ساٹھ سپاہی اس کے گرد جمع ہو چکے تھے۔

انور علی نے ایک ہی سانس میں کئی سوالات ڈھونڈیا داغ سے کر دیے۔تم کہاں سے آئے ہو؟تمہارے ساتھ کتنے آدمی ہیں؟باقی فوج کہاں ہے؟

ڈھونڈیا داغ نے جواب دیا۔میں چتل ڈرگ سے غازی خاں کی فوج کے

ساتھ آیا ہوں۔ شاہنوار کے قریب پہنچ کر ہمیں یہ معلوم ہوا کہ آپ دھاڑواڑ کا قلعہ خالی کرنے والے ہیں۔ غازی خاں پانچ ہزار سواروں کے ساتھ دریا کے پار رُک گئے ہیں اور مجھے انہوں نے آپ لوگوں کے متعلق مزید معلومات حاصل کرنے کے لیے روانہ کیا تھا۔ یہاں پہنچ کر میں نے سوچا کہ مرہٹوں کی چوکی پر قبضہ کر کے شاید میں آپ کی کوئی مدد کرسکوں۔ بدرالزمان اور باقی آدمی کہاں ہیں؟

بدرالزمان خاں مرہٹوں کی قید میں ہیں اور جو آدمی بچ گئے ہیں ان میں سے اکثر آج شام تک جنگل عبور کرلیں گے۔ اب انہیں آس پاس کے علاقے میں تلاش کرنا تمہارا فرض ہے۔ لیگر انڈ زخمی ہے اور میں اُسے یہاں ایک میل کے فاصلے پر چھوڑ آیا ہوں اسے فوراً کسی محفوظ جگہ پہنچانا ضروری ہے۔ اگر ہم چتل ڈرگ پہنچ جائیں تو شاید اس کی جان بچ جائے۔ وہ بہت تکلیف میں ہے اور ہم اسے لکڑی کے ایک کھٹولے پر ڈال کر لائے ہیں۔ لیکن اب میں چاہتا ہوں کہ اس کے لیے ایک آرام دہ پالکی کا انتظام کر دیا جائے۔

بستی کا سردار قریب کھڑا اُن کی باتیں سن رہا تھا۔ اس نے کہا۔ میں آپ کو اپنی پالکی دے سکتا ہوں۔

انور علی نے کہا۔ میرے ساتھ بہت تھکے ہوئے ہیں اور زخمی کو اٹھانے کے لیے مجھے چند جفاکش آدمیوں کی بھی ضرورت پڑے گی۔

آدمیوں کا انتظام بھی ہو جائے گا لیکن آپ کے چہرے سے معلوم ہوتا ہے کہ آپ نے دیر سے کچھ نہ کھایا۔ میں آپ کے لیے کھانے کا انتظام کرتا ہوں۔

انور علی نے کہا۔ میرے ساتھی مجھ سے زیادہ بھوکے ہیں۔ آپ آٹھ آدمیوں کا کھانا تیار کروائیے۔ میں انہیں لے کر آتا ہوں۔ زخمی کے لیے آپ کو دودھ کا انتظام

کرنا پڑے گا۔ آپ کے پاس کاغذ قلم ہو تو منگوا دیجیے۔ میں جانے سے پہلے ایک ضروری خط لکھنا چاہتا ہوں۔

میں ابھی لاتا ہوں۔ سردار یہ کہہ کر بھاگتا ہوا اندر چلا گاے اور انور علی نے ڈھونڈیا داغ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ آپ تین چار قابلِ اعتماد آدمیوں کو گھوڑے تیار کرنے کا حکم دیں میں انہیں ضروری پیغام دے کر سرنگا پٹم بھیجنا چاہتا ہوں۔

بستی کا سردار تین چار منٹ بعد ایک لکڑی کی صندوقچی جس میں کاغذ اور لکھنے کا سامان پڑا ہوا تھا لے کر آ گیا۔ انور علی ڈیوڑھی کے اندر ایک کھاٹ پر بیٹھ کر خط لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ یکے بعد دیگر تین کاغذوں پر چند سطور لکھنے کے بعد وہ ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا اور ڈھونڈیا داغ کی طرف متوجہ ہوا۔ آپ کے آدمی تیار ہیں۔

جی ہاں وہ باہر کھڑے آپ کے حکم کا انتظار کر رہے ہیں۔

انور علی، ڈھونڈیا داغ کے ساتھ حویلی کی چار دیواری سے باہر نکلا۔ سامنے چار سپاہی گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے۔ ان کے یکے بعد دیگرے تیوں کاغذ ایک سپاہی کے حوالے کرتے ہوئے کہا۔ یہ خط تمہیں سرنگا پٹم پہنچ کر ہمارے گھر میں لیگر انڈ کی بیوی کو دینا ہے، یہ دوسرا خط میں نے سرنگا پٹم کے فوج دار کے نام لکھا ہے۔ تم لیگر انڈ کی بیوی سے یہ کہو کہ اس کا خاوند زخمی ہے اور میں اسے چتل ڈرگ لے جا رہا ہوں۔ اور اگر وہ چتل ڈرگ آنے کے لیے تیار ہو تو سرنگا پٹم کا فوج دار اس کے لیے سفر کا ضروری انتظام کر دے گا۔ اور یہ تیسرا خط پہلے دو خطوط سے علیحدہ رکھو۔ یہ راستے کی تمام چوکیوں کے افسروں کے نام ہے۔ اگر تمہیں کہیں تازہ دم گھوڑے حاصل کرنے میں دقت پیش آئے تو یہ خط تمہارے کام آئے گے۔ اب تم فوراً روانہ ہو جاؤ۔ سپاہی سلام کرنے کے بعد گھوڑے پر سوار ہو گیا اور اس کے ساتھ

اس کے پیچھے ہو لیے۔

چند دن بعد لیگر انڈ چتل ڈرگ کے قلعے کے ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ دریائے تنگھدرہ عبور کرنے کے بعد اس نے بیشتر راستہ بیہوشی اور نیم بیہوشی کی حالت میں طے کیا تھا۔ چتل ڈرگ سرنگا پٹم کے بعد سلطنت خداداد کا اہم ترین دفاعی حصار تھا اور یہاں لیگر انڈ کی دیکھ بھال کے لیے فوج کے بہترین طبیب اور جراح موجود تھے۔ اس کے زخم سے گولی نکالی جا چکی تھی لیکن چتل ڈرگ کے بہترین جراح کی ان تھک کوشش کے باوجود اس کی حالت دن بدن خراب ہوتی جا رہی تھی۔ رستے ہوئے ناسور اور دائمی بخار کے باعث وہ ہڈیوں کا ڈھانچہ بن چکا تھا، انور علی صبح شام اس کی تیمار داری کے لیے موجود رہتا تھا۔ ایک رات اس کی حالت زیادہ خراب تھی اور انور علی اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھا ہوا تھا لیگر انڈ نے کہا۔ موسیو آپ سو جائیں۔ میں آپ کو اس قدر تکلیف دینے کا حق نہیں رکھتا۔

انور علی نے جواب دیا۔ لیگر انڈ تم میری فکر نہ کرو جب تمہیں نیند آ جائے گی تو میں بھی سو جاؤں گا۔

لیگر انڈ نے کہا۔ اب مجھے نیند سے خوف آتا ہے۔ مجھے ایسا محسوس ہوتا ہے کہ اگر میں سو گیا تو شاید دوبارہ میری آنکھ نہ کھلے۔ آپ کی تسلیوں کے باوجود میں یہ جانتا ہوں کہ میرا وقت اب قریب آ چکا ہے۔ میرے معالج زبان سے کچھ نہیں کہتے لیکن ان کی نگاہیں مجھے یہ بتانے کے لیے کافی ہیں کہ میں موت کے دروازے پر کھڑا ہوں۔ راستے میں مجھے بار بار یہ خیال آتا تھا کہ وہ یہاں پہنچ کر میرا انتظار کر رہی ہو گی۔ اب کافی دن گزر چکے ہیں۔ اگر آپ کے ایلچی کی طرف سے کوئی کوتاہی نہیں ہوئی تو اسے اب تک یہاں پہنچنا چاہیے تھا۔ مجھے ڈر ہے کہ اب میں زیادہ دیر اس کا

انتظار نہیں کر سکوں گا۔ آپ مجھے یہاں لانے کی بجائے سیدھے سرنگا پٹم لے جاتے تو اچھا ہوتا۔

انور علی نے کہا۔ لیگرانڈ سرنگا پٹم بہت دور ہے۔ تاہم مجھے یقین ہے کہ جین اب ایک دو دن میں یہاں پہنچ جائے گی۔

لیگرانڈ نے پُرامید ہو کر کہا۔ آپ نے پہرے داروں کو ہدایت کر دی ہے کہ اگر وہ رات کے وقت یہاں پہنچے تو اس کے لیے دروازہ کھول دیا جائے۔ مجھے ڈر ہے کہ شاید پہرے دار رات کے وقت اسے قلعے میں داخل ہونے کی اجازت نہ دیں۔

انور علی نے جواب دیا۔ تم اطمینان رکھو جب وہ آئے گی تو پہریدار اسے یہاں لے آئینگے۔ نہیں وہ نہیں آئے گی۔ لیگرانڈ نے کرب کی حالت میں آنکھیں بند کرتے ہوئے کہا۔ انور علی نے پیار سے اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میرے دوست تمہیں مایوس نہیں ہونا چاہیے۔

انور علی ساری رات لیگرانڈ کے پاس بیٹھا رہا۔ وہ کبھی درد سے کراہتا ہوا آنکھیں کھولتا اور اس کے ساتھ باتیں کرنے میں مصروف ہو جاتا اور کبھی دیر تک بے ہوشی کی حالت میں پڑا رہتا پچھلے پہر لیگرانڈ سو رہا تھا۔ انور علی نماز کے لیے اُٹھا اور تھوڑی دیر بعد واپس آ کر قریب بیٹھ گیا لیگرانڈ ابھی تک گہری نیند کی حالت میں پڑا ہوا تھا۔ انور علی گزشتہ بے آرامی کے باعث نڈھال ہو چکا تھا اور کچھ دیر اونگنے کے بعد اسے بھی نیند آ گئی۔

طلوعِ آفتاب سے کچھ دیر بعد اسے کمرے میں کسی کے پاؤں کی آہٹ سُنائی دی اور اس کی آنکھ کھل گئی۔ جین اس کے سامنے کھڑی تھی۔

ایک ثانیہ کے لیے انور علی کو اپنی آنکھوں پر اعتبار نہ آیا۔ پھر وہ کرسی سے اٹھ کر ایک طرف کھڑا ہو گیا اور بولا۔ ابھی لیگرانڈ کو جگانا ٹھیک نہیں، اسے بڑی دیر کے بعد نیند آئی ہے۔ آپ تشریف رکھیں۔

جین کی نگاہیں لیگرانڈ کے چہرے پر مرکوز تھیں اور اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے۔

اب ان کا کیا حال ہے؟ جین نے لرزتی ہوئی آواز میں پوچھا۔

انور علی نے جواب دیا۔ مجھے یقین ہے کہ آپ کو دیکھتے ہی ان کی حالت بہتر ہو جائیگی۔ تشریف رکھیے!

جین آگے بڑھ کر کرسی پر بیٹھ گئی۔ انور علی نے پاس ہی دوسری کرسی اُٹھائی اور اس کے سامنے بیٹھ گیا۔ جین نے اپنا کانپتا ہوا ہاتھ لیگرانڈ کی پیشانی پر رکھ دیا اور پھر انور علی کی طرف متوجہ ہو کر بولی۔ ان کا بُخار بہت تیز ہے؟

انور علی نے آگے بڑھ کر لیگرانڈ کی نبض ٹٹولتے ہوئے کہا۔ رات کے وقت اس کا بُخار زیادہ تیز تھا۔ میں ابھی طبیب کو بلاتا ہوں۔ امی جان کیسی تھیں؟

وہ بالکل ٹھیک تھیں۔ معاف کیجیے مجھے ان کے متعلق کچھ کہنا یاد نہیں رہا۔ ابھی تک میرے حواس دُرست نہیں ہوئے۔ مجھے یہ تمام واقعات ایک بھیانک سپنا معلوم ہوتے ہیں۔ ان الفاظ کے ساتھ جین کی آنکھوں سے آنسو پھوٹ نکلے اور وہ اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر سسکیاں لینے لگی۔

انور علی نے کہا جین! لیگرانڈ کو حوصلہ دینے کے لیے تمہیں ہمت سے کام لینا چاہیے۔ میں ابھی آتا ہوں۔

انور علی کمرے سے باہر نکل گیا۔ لیگرانڈ نے کچھ دیر کراہنے کے بعد آنکھیں

کھول دیں اور چند ثانیے سکتے کے عالم میں جین کی طرف دیکھتا رہا۔ پھر اس نے نحیف آواز میں جین جین کہتے ہوئے اپنے ہاتھ پھیلا دیے اور جین نے اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

لیگرانڈ نے اس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ جین تم یہاں تھیں اور میں تمہیں ہزاروں میل دور پیرس کی گلیوں میں تلاش کر رہا تھا۔ میں تمہارے انتظار میں موت سے لڑ رہا تھا اور اب میری ہمت جواب دے چکی تھی۔ جین میں تمہارا شکر گزار ہوں۔ تم کب آئیں؟ تمہیں یہاں پہنچتے ہی مجھے جگا دینا چاہیے تھا۔

میں ابھی آئی ہوں۔ جین نے جواب دیا۔ انور علی کہتا تھا کہ آپ بہت دیر کے بعد سوئے ہیں۔

وہ کہاں گیا ہے؟

وہ طبیب کو بُلانے گیا ہے۔

اب مجھے طبیب کی ضرورت نہیں۔ جین مجھے تمہاری آنکھوں میں آنسو دیکھ کر تکلیف ہوتی ہے۔ تمہارے چہرے پر ایک دائمی مسکراہٹ دیکھنا میری زندگی کی سب سے بڑی خواہش تھی۔ لیکن میں تمہیں آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔

جین نے گفتگو کا رُخ بدلتے ہوئے کہا۔ اب تمہاری طبیعت کیسی ہے۔ زخم میں زیادہ تکلیف تو نہیں؟

لیگرانڈ نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے جواب دیا۔

اب مجھے اس کے سوا کسی اور بات کا احساس نہیں کہ تم میری نگاہوں کے سامنے ہو۔ اب مجھے موت کا چہرہ بھی بھیانک محسوس نہیں ہوتا۔

لیگرانڈ نے کچھ دیر کھانسنے کے بعد پانی مانگا۔ جین نے جلدی سے اُٹھ کر پاس

ہی ایک صُراحی سے پانی کا پیالہ بھرا۔لیگر انڈ سے کراہتا ہوا اُٹھ کر بیٹھ گیا اور اس نے جین کے ہاتھ سے پانی کا کٹورا پکڑ کر منہ سے لگالیا۔پانی پینے کے بعد ہو بستر پر لیٹ گیا اور چند ثانیے بے حس و حرکت پڑا رہا۔اس کی آنکھیں ایک نا قابلِ برداشت تکلیف کا اظہار کر رہی تھیں۔

انور علی طبیب اور ایک سپاہی جو دواؤں کا صندوقچہ اٹھائے ہوئے تھا۔کمرے میں داخل ہوئے جین کھڑی ہوگئی۔طبیب نے لیگر انڈ کی نبض دیکھنے کے بعد انور علی کی طرف متوجہ ہوکر کہا۔ میں ان کا زخم صاف کرنے کے بعد پٹی تبدیل کرنا چاہتا ہوں۔بہتر ہوگا کہ آپ چند منٹ کے لیے مادام کو دوسرے کمرے میں بٹھا دیں۔

جین نے کہا۔نہیں میں یہیں رہوں گی۔

جب طبیب پٹی کھولنے لگا تو انور علی نے کہا مادام آپ بیٹھ جائیں۔

جین کرسی پر بیٹھ گئی۔چند منٹ بعد لیگر انڈ کی مرہم پٹی سے فارغ ہوکر طبیب نے انور علی سے کہا۔آج ان کی حالت کچھ بہتر معلوم ہوتی ہے لیکن انہیں آرام کی سخت ضرورت ہے۔ان کے لیے زیادہ باتیں کرنا بھی ٹھیک نہیں۔ میں اور دوا بھیج دیتا ہوں۔آپ تین تین گھنٹے کے بعد ایک ایک پُڑیا کھلاتے رہیں۔اگر انہیں نیند آجائے تو جگانے کی کوشش نہ کریں۔

طبیب اور اس کے ساتھی کمرے سے باہر نکل گئے اور انور علی جین کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ایک نوکر طشت میں دودھ کا کٹورا اٹھائے کمرے میں داخل ہوا۔انور علی آگے بڑھا اور لیگر انڈ کو سہارا دے کر اٹھاتے ہوئے کہا۔لیگر انڈ تمہارا ناشتہ آگیا ہے۔

لیگر انڈ نے کہا۔مجھ سے پہلے آپ کو جین کا خیال کرنا چاہیے تھا۔

تم فکر نہ کرو جین کا کھانا آ رہا ہے۔

نوکر نے طشت آگے کر دیا اور انور علی نے دودھ کا پیالہ اُٹھا کر لیگرانڈ کے منہ سے لگا دیا۔ دُودھ کے چند گھونٹ پینے کے بعد لیگرانڈ نے کہا۔ بس میں اس سے زیادہ نہیں پی سکتا۔ لیگرانڈ نے پیالہ دوبارہ طشت میں رکھ دیا اور انور علی نے نوکر سے کہا اب تم میم صاحب کے لیے کھانا لے آؤ اور اس کے بعد ان کے لیے یہاں ایک کھاٹ ڈال دو۔

جین نے کہا۔ مجھے اس وقت بھوک نہیں ہے۔

نہیں آپ تھوڑا بہت ضرور کھا لیجیے؟

نوکر نے کہا۔ اور آپ کا کھانا بھی یہیں لے آؤں؟

انور علی کی بجائے لیگرانڈ نے جواب دیا۔ ہاں لے آؤ۔ تمہارا کیا خیال ہے کہ یہ آج کھانا نہیں کھائیں گے۔ میرے خیال میں آج انہوں نے ناشتا بھی نہیں کیا۔

ایک گھنٹہ بعد انور علی نے لیگرانڈ اور جین سے اجازت لی اور ساتھ کے کمرے میں چلا گیا۔ گزشتہ بے خوابی اور تھکاوٹ کے باعث اس کا بُرا حال ہو رہا تھا۔ وہ نڈھال ہو کر ایک کھاٹ پر لیٹ گیا۔ چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔ دو بجے کے قریب سے نوکر نے جھنجھوڑ کر جگایا اور کہا۔ جناب میم صاحب آپ کو بلا رہی ہیں۔ وہ کہتی ہیں کہ لیگرانڈ کی حالت ٹھیک نہیں۔

انور علی جلدی سے اٹھا اور بھاگتا ہوا دوسرے کمرے میں داخل ہوا۔ لیگرانڈ سخت تکلیف کی حالت میں کراہ رہا تھا اور جین اس کے سرہانے بیٹھی ہوئی تھی۔

کیا ہوا؟ انور علی نے بڑھ کر گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا۔

جین نے جواب دیا۔ ان کی حالت ٹھیک نہیں۔ ابھی آپ کو آوازیں دے

رہے تھے۔ انور علی نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا اور نوکر سے کہا۔ تم فوراً طبیب کو بلاؤ۔ نوکر چلا گیا۔

لیگرانڈ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ میرے دوست طبیب کو بلانے کی ضرورت نہیں۔ تم میرے پاس بیٹھ جاؤ۔

انور علی کرسی گھسیٹ کر اس کے نزدیک بیٹھ گیا۔

لیگرانڈ نے تکلیف کی حالت میں تھوڑی دیر کے بعد آنکھیں بند کرلیں اور پھر انور علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ انور علی مجھے یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرے بعد تم جین کا آخری سہارا ہو۔ زندگی میں تم میرے سب سے محسن تھے اور موت کے وقت اپنی روح کے لیے میں یہ اطمینان چاہتا ہوں کہ تم جین کو بے چارگی کا احساس نہیں ہونے دو گے۔

لیگرانڈ! انور علی نے آبدیدہ ہو کر کچھ کہنے کی کوشش کی۔ لیکن الفاظ اس کے سینے میں گھٹ کر رہ گئے۔

لیگرانڈ نے کہا۔ انور علی میں جین کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہ دے سکا۔ لیکن تم اگر چاہو تو اسے زندگی کی تمام مسکراہٹیں اور قہقہے عطا کر سکتے ہو۔

انور علی نے جین کی طرف دیکھا وہ سر جھکائے بیٹھی تھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہہ رہے تھے۔ انور علی نے سراپا التجا بن کر کہا۔ اپنے شوہر کو تسلی دو۔ اسے کہو مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ اسے خدا کی رحمت سے مایوس نہ ہونے دو۔ مجھے یقین ہے کہ یہ ٹھیک ہو جائے گا۔

جین نے اضطراری حالت میں اپنا ہاتھ لیگرانڈ کے ماتھے پر رکھ دیا اور سسکیاں لینے لگی۔ لیگرانڈ نے کہا۔ انور علی اب مجھے تسلیاں دینے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میں

جانتاہوں کہ میرا وقت قریب آچکا ہے اور مجھے قدرت سے کوئی شکایت نہیں۔اس دنیا میں ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے۔ مجھے صرف اس اطمینان کی ضرورت تھی کہ میرے بعد جین بے سہارا نہیں ہوگی۔ پھر اُس نے جین کا ہاتھ پکڑ کر اپنے سینے سے لگالیا اور دوسرا ہاتھ انور علی کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ انور علی ذرا قریب آجاؤ اور اپنا ہاتھ مجھے دو۔

انور علی نے کرسی گھسیٹ کر آگے کرلی اور اپنا ہاتھ لیگر انڈ کے ہاتھ میں دے دیا۔

لیگر انڈ نے ایک مغموم مسکراہٹ کے ساتھ انور علی کا ہاتھ کھینچ کر جین کے ہاتھ کے اُوپر رکھ دیا اور ایک گہری سانس لینے کے بعد آنکھیں بند کرلیں۔

انور علی نے اپنے جسم میں ایک کپکپی محسوس کی اور مضطرب سا ہو کر کہا۔لیگر انڈ! لیگر انڈ!

لیگر انڈ نے آنکھیں کھولیں۔اسکی سانس اُکھڑ چکی تھی۔لیکن اس کے ہونٹوں پر ایک عجیب تبسم کھیل رہا تھا،آہستہ آہستہ جین اور انور علی کے ہاتھوں پر اس کی گرفت ڈھیلی پڑ چکی تھی

طبیب ہانپتا ہوا کمرے میں داخل ہوا

آپ نے بہت دیر لگائی۔انور علی نے کہا۔

میں مسجد میں نماز پڑھ رہا تھا۔طبیب نے جواب دیا۔

لیگر انڈ نے اک جھرجھری لی اور انور علی نے آہستہ سے اپنا ہاتھ کھینچ لیا۔

طبیب نے جلدی سے اس کی نبض دیکھی اور گردن جھکالی۔

جین کچھ دیر بے حس وحرکت بیٹھی رہی اور پھر بے اختیار لیگر انڈ کے سینے پر سر

رکھ کر سسکیاں لینے لگی۔

طبیب نے انور علی کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ میں نے بہت کم آدمیوں کو اس بہادری سے موت کا مقابلہ کرتے دیکھا ہے۔

چند منٹ بعد طبیب کمرے سے باہر نکل گیا۔ انور علی کچھ دیر بے حس و حرکت بیٹھا رہا۔ بالآخر وہ اٹھا اور جین کو دونوں بازوؤں سے پکڑ کر اٹھاتے ہوئے بولا۔ جین تمہیں حوصلے سے کام لینا چاہیے اب صبر کے سوا کوئی چارہ نہیں۔

غروبِ آفتاب سے کچھ دیر پہلے لیگر انڈ کو پورے فوجی اعزاز کے ساتھ چتل ڈرگ کے عیسائیوں کے ایک چھوٹے سے قبرستان میں دفن کیا جا رہا تھا۔

ایک ہفتہ بعد جین اپنے کمرے کے دریچے کے سامنے کھڑی تھی۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بارش ہو رہی تھی۔ دروازے پر کسی نے دستک دی۔

کون ہے؟ جین نے مڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

انور علی کی آواز سنائی دی۔ میں اندر آ سکتا ہوں؟

آیئے۔

انور علی کمرے میں داخل ہوا اور وہ ایک دوسرے کے سامنے کرسیوں پر بیٹھ گئے۔

انور علی چند منٹ سر جھکائے بیٹھا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ جین مجھے ڈر ہے کہ مرہٹے عنقریب چتل ڈرگ پر حملہ کر دیں گے۔ ان حالات میں آپ کا یہاں رہنا ٹھیک نہیں۔ میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ کسی تاخیر کے بغیر سرنگاپٹم چلی جائیں۔ فوجدار کی بھی یہی رائے ہے اور انہوں نے مجھ سے وعدہ کیا ہے کہ وہ کل صبح آپ کے سفر کا

بندوبست کردیں گے۔

جین نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ میں آپ کے حکم کی تعمیل سے انکار نہیں کروں گی۔ یہ حکم نہیں بلکہ ایک مجبوری ہے۔ مجھے اپنے متعلق ابھی سرنگا پٹم سے کوئی ہدایت نہیں ملی۔ فوجدار کی خواہش ہے کہ مجھے یہیں روک لیا جائے لیکن یہ بھی ممکن ہے کہ میں چند دن تک سرنگا پٹم یا کسی اور محاذ پر چلا جاؤں۔

جین نے کہا۔ میں کل جانے کے لیے تیار ہوں لیکن آپ سے ایک وعدہ لینا چاہتی ہوں۔

کہیے!

میں آپ سے کوئی مطالبہ کرنے کا حق نہیں رکھتی۔ لیکن اگر میرے لیے نہیں تو کم ازکم اپنی والدہ کی تسلی کے لیے خط ضرور لکھتے رہیں۔ دھاڑواڑ سے کئی ہفتے آپ کے متعلق کوئی اطلاع نہ ملنے کے باعث وہ سخت پریشان تھیں۔

انور علی نے جواب دیا۔ دھاڑواڑ کے حالات ہی ایسے تھے کہ میرے لیے خط بھیجنا ناممکن تھا۔ لیکن اب میں ہر ہفتے کم ازکم ایک خط ضرور لکھا کروں گا۔ اور لیگرانڈ کی وفات کے بعد مجھ پر آپ کے حقوق کم نہیں ہوئے بلکہ زیادہ ہو گئے ہیں۔ اب آپ آرام کریں۔ اگر کل موسم ٹھیک ہوا تو آپ کو علی الصباح روانہ کر دیا جائے گا۔

انور علی یہ کہہ کر اُٹھ کھڑا ہوا اور چند ثانیے توقف کے بعد کمرے سے باہر نکل گیا جین دیر تک بے حس و حرکت بیٹھی رہی۔ لیگرانڈ کی موت کے بعد ایسے مواقع بہت کم آئے تھے۔ جب اس نے اطمینان کے ساتھ انور علی سے باتیں کی تھیں۔ وہ صبح شام اس کے کمرے میں آتا اور کھڑے کھڑے تسلی و تشفی کے چند الفاظ دُہرانے کے بعد واپس چلا جاتا۔ کھانا کھاتے وقت بھی جین یہ محسوس کرتی کہ وہ صرف مجبوری

کی حالت میں اس کے ساتھ شریک ہے ورنہ اس کے خیالات کہیں اور ہیں کبھی کبھی غیر شعوری طور پر اس کی نگاہیں جین کے چہرے پر مرکوز ہو جاتیں۔ لیکن جب جین اس کی طرف دیکھنے کی کوشش کرتی تو وہ پریشان سا ہو کر اپنی آنکھیں نیچی کر لیتا جین کوئی سوال کرتی تو وہ مختصر سا جواب دے کر خاموش ہو جاتا۔

شروع شروع میں جین کا خیال تھا کہ انور علی کو جنگ کی کلفتوں اور لیگرانڈ کی موت کے صدمے نے نڈھال کر دیا ہے اور چند دنوں، چند ہفتوں یا چند مہینوں کے بعد اس کے ذہن سے گزشتہ حادثات کے اثرات دُور ہو جائیں گے۔ لیکن اب وہ یہ محسوس کر رہی تھی کہ وقت کے ساتھ ساتھ ان کے درمیان اجنبیت کے پردے زیادہ دبیز ہوتے جا رہے ہیں۔ انور علی نے جو اسے پانڈی چری کی بندرگاہ پر ملا تھا اور جس کے ساتھ اس نے سرنگا پٹم تک سفر کیا تھا، اب اس کے لیے ایک معمّا بن چکا تھا۔

اگلی صبح وہ سفر کی تیاری کرنے کے بعد انور علی کا انتظار کر رہی تھی۔ ایک سپاہی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا۔ آپ کے ساتھ سفر کے لیے تیار کھڑے ہیں۔

جین نے گھٹی ہوئی آواز میں سوال کیا۔ انور علی کہاں ہیں؟

سپاہی نے جواب دیا۔ وہ بھی قلعے کے دروازے پر کھڑے ہیں چلیے۔

جین سپاہی کے ساتھ چل پڑی۔ قلعے کے دروازے سے باہر چند سپاہی جو سرنگا پٹم سے اس کے ساتھ آئے تھے اپنے گھوڑوں کی باگیں تھامے کھڑے تھے اور انور علی انہیں ہدایات دے رہا تھا۔ میم صاحب کی طبعیت ٹھیک نہیں ہے۔ تمہیں راستے میں ان کا بہت زیادہ خیال رکھنا چاہیے۔ اگر مجھے شکایت ملی کہ انہیں راستے میں کوئی تکلیف ہوئی ہے تو میں تمہارے ساتھ بہت سختی سے پیش آؤں گا۔ چند دن تک تمہیں راستے میں کوئی خطرہ نہیں۔ اس لیے میں چاہتا ہوں کہ تم اطمینان سے اور

آرام کے ساتھ سفر کرو!

جین انور علی کے پیچھے کھڑی یہ باتیں سن رہی تھی اور اس کی سرد مہری کے متعلق وہ اپنے خیالات میں ایک تبدیلی محسوس کر رہی تھی۔ انور علی نے مُڑ کر اس کی طرف دیکھا اور ایک گھوڑے کی باگ پکڑ کر اس کے قریب لاتے ہوئے فرانسیسی زبان میں کہا۔ اب آپ سوار ہو جائیں۔ اور دوپہر سے پہلے پہلے ایک منزل طے کر لیں۔

جین نے آبدیدہ ہو کر گھوڑے کی باگ پکڑ لی۔ انور علی نے اسے سہارا دے کر گھوڑے کی زین پر بٹھا دیا۔ وہ چند ثانیے تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتی رہی۔ انور علی نے کہا۔ جین اگر خدا نے زندگی دی تو ہم دوبارہ ملیں گے۔ خدا حافظ۔

جین کے ساتھی اپنے اپنے گھوڑے پر سوار ہو چکے تھے۔ اس نے خدا حافظ کہہ کر اپنے گھوڑے کی باگ موڑ لی اور یہ قافلہ روانہ ہوا۔

میسور میں جین کی زندگی کا ایک باب ختم ہو چکا تھا اور انور علی کے یہ الفاظ کہ اگر خُدا نے زندگی دی تو ہم دوبارہ ملیں گے۔ اس کی داستان حیات کے ایک نئے باب کا عنوان بن چکے تھے۔ انور علی اب اس کے لیے ایک معمانہ تھا۔

اٹھارواں باب

دھاڑواڑ کی فتح کے بعد جنوب کی طرف مرہٹوں کا راستہ صاف ہو چکا تھا۔ پرس رام بھاؤ نے ماہِ اپریل کے آخر میں دریائے تنگ بھدرہ عبور کیا اور راما گری پر قبضہ کرلیا۔

لارڈ کارنوالس کو یہ اُمید تھی کہ دھاڑواڑ کی فتح کے بعد بھاؤ کا لشکر کسی تاخیر کے بغیر کمپنی کی افواج سے آ ملے گا۔ لیکن پرس رام بھاؤ اپنا عقب محفوظ کیے بغیر آگے بڑھنا خطرناک سمجھتا تھا، اس نے راما گری سے چتل ڈرگ کی طرف پیش قدمی کی۔ لیکن اسے ہر قدم پر شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

مرہٹوں کا ایک اور لشکر گنپت راؤ مہین ڈیل کی کمان میں بڈنور کی طرف بڑھا اور اس نے چند علاقوں پر قبضہ کرلیا۔ لیکن شموگہ کی فوج نے جوابی حملے کر کے اسے پسپائی پر مجبور کردیا۔

ان حالات میں پرس رام بھاؤ نے چتل ڈرگ پر حملہ کرنے کا ارادہ ملتوی کر دیا اور اپنی فوج کا ایک بڑا حصہ بڈنور کے محاذ پر بھیج دیا۔ مرہٹوں نے بڈنور کے چند علاقے دوبارہ فتح کر لیے۔ اس کے بعد مرہٹوں کی پیش قدمی کی رفتار بہت سست تھی اور لارڈ کارنوالس جو میر نظام کے لشکر کے ساتھ بنگلور سے سرنگاپٹم کی طرف پیش قدمی کر چکا تھا۔ ایک بار پھر یہ محسوس کر رہا تھا کہ اس کے مرہٹہ حلیف دھاڑواڑ سے نکلنے کے بعد ایک دلدل میں پھنس گئے ہیں۔

اس عرصہ میں مرہٹہ فوج کے سپہ سالار ہری پنت کی سرگرمیاں سرا کے علاقوں تک محدود تھیں اور وہ جنوب کی طرف پیش قدمی کے لیے مناسب حالات کا انتظار کر رہا تھا۔ جب اسے سرنگاپٹم کی طرف لارڈ کارنوالس اور نظام کی افواج کی پیش قدمی

کی اطلاع ملی تو اس نے شمال اور مغرب کے ہر محاذ کی مرہٹہ فوج کو سرنگاپٹم کی طرف پیش قدمی کا حکم دیا۔ لارڈ کارنوالس موسمِ برسات سے پہلے پہلے سرنگاپٹم فتح کرنا چاہتا تھا۔ لیکن مرہٹوں کی سُست رفتاری کے باعث اس کے تمام منصوبے خاک میں مل چکے تھے۔ منگلور سے نکلنے کے بعد اس نے راماگری اور میسور کے چند اور اہم قلعوں سے کترا کر ایک طویل اور دُشوار گزار راستہ اختیار کیا۔ لیکن یہاں بھی اسے ہر قدم پر سخت مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ راستے کے تمام بستیاں انسانوں کے وجود سے خالی تھیں اور انگریزی فوج کے چارے اور غلے کی ذخیروں کی جگہ راکھ کے انبار نظر آتے تھے۔ برسات شروع ہو چکی تھی اور چھوٹے چھوٹے نالے اور ندیاں دریا بن چکے تھے۔ چھاپہ مار دستوں کے پے در پے حملوں کے باعث رسد اور کمک کا نظام مکمل طور پر مفلوج ہو چکا تھا۔ چارے کی کمی کے باعث ہر روز سینکڑوں مویشی ہلاک ہو رہے تھے۔ سپاہیوں کو آدھے راشن پر گزارہ کرنا پڑتا تھا۔

قریباً دس دن کی مارا ماری کے بعد کارنوالس کی فوج ان گنت مصائب کا سامنا کرنے کے بعد سرنگاپٹم سے نو میل مشرق کی طرف دریائے کاویری کے کنارے پہنچ چکی تھی اور اس عرصہ میں سُلطان کی باقاعدہ فوج کا سامنا کیے بغیر اس نے جو نقصانات اٹھائے تھے وہ کسی بڑی جنگ کے نقصانات سے کم نہ تھے اور اب جب وہ سرنگاپٹم کے قریب پہنچ چکا تھا تو دریائے کاویری کی سرکش موجیں اس کے راستے میں حائل تھیں۔

ایک دن موسلا دھار بارش ہو رہی تھی۔ منور خان بھاگتا ہوا کمرہ میں داخل ہوا۔ اور بلند آواز سے چلایا۔ بی بی جی۔ بی بی جی۔ مراد علی صاحب آ گئے ہیں۔ فرحت اور جین نچلی منزل؛ کے ایک کمرے سے نکل کر برآمدے میں آ گئیں۔ مراد علی صحن

میں داخل ہوا۔ اس کا لباس کیچڑ اور پانی سے لت پت تھا۔ فرحت اسے دیکھتے ہی برآمدے سے نکل کر بڑھی۔ اور بے اختیار اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ مراد علی نے کہا۔ امی جان بارش ہو رہی ہے۔ اور میرے کپڑے بارش سے بھیگے ہوئے ہیں۔

لیکن فرحت کو مراد کی موجودگی کے سوا کسی بات کا احساس نہ تھا، اس نے مراد علی کی آنکھوں اور پیشانی پر بوسہ دیتے ہوئے کہا۔ میرے لال تمہیں دیکھنے کے بعد میں ساری عمر اس بارش میں کھڑی رہ سکتی ہوں۔ مراد علی اسے بازو کا سہارا دیے برآمدے کی طرف بڑھا۔ وہاں جین کو دیکھ کر چند ثانیے اس کے منہ سے کوئی بات نہ نکل سکی۔ فرحت نے اپنی آنکھوں سے مسرت کے آنسو پونچھتے ہوئے شکایت کے لہجے میں کہا۔ مراد تم نے بہت پریشان کیا۔ مجھے کئی مہینوں سے علم نہ تھا۔ آخر تم کہاں تھے۔ مراد علی نے جواب دیا۔ امی جان ہماری فوج پہلے مالابار کی ساحلی چوکیوں کی حفاظت پر مامور تھی۔ اس کے بعد مجھے بدنور کے شمال میں مرہٹہ لشکر کی نقل و حرکت معلوم کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ پھر مجھے دریا کے کنارے ایک چھوٹے سے قلعے کی حفاظت پر متعین کر دیا گیا، ان حالات میں میرے لیے خط لکھنا ناممکن تھا۔ فرحت نے کہا بیٹا میں تم سے بہت سی باتیں کرنا چاہتی ہوں پہلے تم نہا دھو کر کپڑے تبدیل کر لو۔ مراد نے جاب دیا۔ امی جان اگر شام تک بارش کا یہی حال رہا تو مجھے لباس تبدیل کرنے کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں سورج غروب ہوتے ہی واپس چلا جاؤں گا۔ کہاں، ماں نے مضطرب ہو کر پوچھا۔ مراد علی مسکرایا۔ امی جان پریشان ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔ اب میں زیادہ دور نہیں جاؤں گا۔ مجھے یہاں سے کوئی پانچ میل دور دریا کے دوسرے کنارے پہاڑی کی چوٹی کی حفاظت پر مامور کیا گیا ہے۔ مجھے سرنگا پٹم کے مستقر میں حاضری دیتے ہی وہاں پہنچنے کا حکم دیا گیا ہے۔

فرحت نے منور خان کی طرف متوجہ ہوتے ہوئے کہا۔ منور تم مراد کے کپڑوں کا ایک جوڑا نکال کر غسل خانے میں رکھ دو۔ مراد علی قدرے جرات سے کام لے کر جین کی طرف متوجہ ہوا۔ اور اس نے مغموم لہجے میں کہا۔ بہن مجھے لیگر انڈ کی موت کا بہت افسوس ہے۔ میں چتل ڈرگ سے ہو کر آیا ہوں، فرحت نے چونک کر سوال کیا۔ کیا تم انور سے ملے تھے۔ ہاں امی جان۔ ٹھیک ہے ناں۔ ہاں امی جان وہ بالکل ٹھیک ہیں۔ جین بڑی مشکلوں سے اپنے آنسو ضبط کرنے کی کوشش کر رہی تھی۔ فرحت نے کہا بیٹا چتل ڈرگ کے قلعے کو تو کوئی خطرہ نہیں، نہیں امی جان چتل ڈرگ کا قلعہ بہت مضبوط ہے۔ اور اب مرہٹوں کا رخ چتل ڈرگ کی بجائے سرنگا پٹم کی طرف ہے۔ منور خان ایک کمرے سے برآمد ہوا اور اس نے کہا جناب مجھے نہیں معلوم تھا کہ آپ کونسا لباس پہنیں گے اس لیے میں نے سفید کپڑوں کے ساتھ ایک نئی وردی بھی نکال کر غسل خانے میں رکھ دی ہے۔ مراد علی مسکرایا۔ بھئی تم بہت ہوشیار ہو گئے ہو، مجھے صرف وردی کی ضرورت ہے۔ تھوڑی دیر بعد مراد علی نئی وردی پہنے اپنی ماں اور جین کے ساتھ بالائی منزل کے ایک کمرے میں بیٹھا ہوا تھا، جین نے لیگر انڈ کی موت کی دردناک تفصیلات سننے کے بعد کہا۔ پچھلے ہفتے موسیو لالی یہاں آئے تھے۔ اور انگریزوں کی پیش قدمی کے متعلق بہت فکر مند تھے۔ اس کے بعد چند دن تک ہمیں کوئی تسلی بخش اطلاع نہیں ملی۔ کل ہم نے یہ خوشخبری سنی تھی کہ دریا کے پار لڑائی میں انگریزوں کے سینکڑوں سپاہی مارے گئے ہیں۔ مراد علی نے کہا۔ یہ خبر درست ہے۔ انگریزوں کا واقعی ہی بہت نقصان ہوا ہے۔ اور انشاء اللہ آپ دو چار دن تک اس سے بڑی خوش خبری سنیں گی۔ گزشتہ چند دنوں میں حالات کافی بدل چکے ہیں۔ ہم نے انگریزی فوج کی رسد اور کمک کے تمام راستے کاٹ دیئے ہیں۔ اب انہیں

باہر سے اناج کا ایک دانہ تک نہیں مل سکے گا، ہمارے سواروں کے دستے تمام راستوں پر پہرے دے رہے ہیں، اب سرنگا پٹم سے زیادہ لارڈ کارنوالس کا اپنا لشکر محاصرے کی حالت میں ہے۔قدرت نے ہماری بروقت مدد کی ہے۔آپ خدا سے یہ دعا کریں کہ یہ بارشیں چند دن اور ختم نہ ہوں۔ مجھے یقین ہے کہ کاویری کی طغیانی سے انگریزوں کے حوصلے سرد پڑ جائیں گے۔ اس موسم میں سرنگا پٹم پر لارنس کارنوائے کا فوری حملہ سلطان کی خواہش کے عین مطابق ہوگا۔انگریزوں کے پڑاؤ پر ہماری ناکہ بندی اتنی سخت ہے کہ انہوں نے جو ایلچی مرہٹوں کی طرف روانہ کیے تھے۔وہ تمام گرفتار کر لیے گئے ہیں۔جین نے کہا آپ کا کیا خیال ہے کہ مرہٹے انگریزوں کی مدد کے لیے نہیں آئیں گے۔ وہ ضرور آئیں گے مجھے ان کی نقل وحرکت کا پورا علم ہے، اور میں سلطان کو ان کی پیش قدمی سے باخبر کرنے کے لیے آیا ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ وہ ان کی آمد سے پہلے پہلے لارڈ کارنوالس کے دانت کھٹے کرسکیں گے، جین نے کچھ دیر بعد سوچنے کے بعد کہا۔میں میسور کے مستقبل سے مایوس نہیں ہوں۔لیکن اس جنگ میں سلطان کو تین طاقتوں سے نبٹنا پڑے گا، اور میسور کے جنگی وسائل بہر حال ان کی نسبت زیادہ محدود ہیں۔مراد علی نے جواب دیا۔میسور کے سپاہی اپنے جنگی وسائل کی بہ نسبت اپنے مقاصد کی برتری پر ایمان رکھتے ہیں، ہمارے لیے آزادی کی زندگی یا عزت کی موت کے سوا کوئی دوسرا راستہ نہیں۔دشمن ہماری لاشیں روند سکتا ہے۔ہمیں اپنی غلامی کا طوق پہننے پر آمادہ نہیں کر سکتا۔لیکن آپ کو مایوس نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ میسور کی عزت اور آزادی کے دشمن اس مرتبہ اپنی تباہی کے دروازے پر دستک دے رہے ہیں،



لارڈ کارنوالس کی مشکلات میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا، جو رسد وہ اپنے ساتھ لایا تھا۔تقریباً ختم ہوچکی تھی۔ چارے کی کمی کے باعث ہر روز اس کے کیمپ میں سینکڑوں گھوڑے اور مویشی ہلاک ہو رہے تھے۔ بھوکے سپاہی مردہ جانوروں کا گوشت کھانے پر مجبور ہو چکے تھے۔لگاتار بارشوں کے ساتھ۔ پڑاؤ میں بڑھتی ہوئی غلاظت کے باعث، چیچک، پیچش اور دوسری وبائیں پھوٹ نکلیں۔اور لارڈ کار نوالس کو اپنا کیمپ بیماروں کا ہسپتال نظر آنے لگا۔میسور کے چھاپہ مار دستے کبھی دن اور کبھی رات کے وقت پڑاؤ کے آس پاس کے ٹیلوں اور پہاڑیوں پر نمودار ہوتے اور چند منٹ گولیاں برسانے کے بعد غایب ہو جاتے تھے۔ کمپنی کے سپاہیوں کی دہشت کا یہ عالم تھا کہ اگر ان میں سے کوئی رات کے وقت نیند کی حالت میں بڑ بڑا اٹھتا تو سارے کیمپ میں افراتفری پھیل جاتی۔میر نظام علی کے سپاہیوں کی حالت انگریزوں سے بھی زیادہ قابل رحم تھی۔

ان حالات میں لارڈ کارنوالس نے کسی تاخیر کے بغیر سرنگا پٹم پر حملہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ قلعے کے قریب دریا کے قابل عبور حصے تک پہنچنے کے لیے اس کے راستے میں ایک ایسی پہاڑی حائل تھی۔ جس کی چوٹی پر میسور کی توپیں نصب تھیں۔ کار نوالس نے پورے جوش وخروش کے ساتھ اس پہاڑی پر حملہ کیا۔اور ایک گھمسان کی جنگ کے بعد اس پر قبضہ کرلیا، میسور کی فوج کے چند دستے پیچھے ہٹ گئے اور انگریزی فوج دریا کے کنارے ان کے تعاقب میں دریا کے کنارے پہنچ گئی۔لیکن جزیرے کی توپون کی شدید گولہ باری کے باعث انھیں سخت نقصانات کے ساتھ پسپا ہونا پڑا، اس ناکامی کے بعد لارڈ کارنوالس نے چند میل دور ہٹ کر ایک اور جگہ سے دریا عبور کرنے کی کوشش کی لیکن اسے کامیابی نہ ہوئی۔

لارڈ کارنوالس مرہٹوں کی نقل و حرکت سے بے خبر تھا۔ اور اس کی آخری امید یہ تھی۔ کہ مالابار کے راستے جنرل ایبر کرومبی کی کمان میں کمپنی کی افواج اس کی مدد کے لیے پہنچنے والی ہیں۔ اور وہ رسد۔ اسلحہ اور بارود کی بہت بڑی مقدار اپنے ساتھ لا رہی ہیں، لیکن اچانک ایک دن اسے یہ اطلاع ملی کی راستے میں میسور کے دستوں نے حملہ کر کے اس کا بیشتر سامان چھین لیا ہے، اس اطلاع کے بعد لارڈ کارنوالس کی مایوسی انتہا کو پہنچ چکی تھی۔ چنانچہ اس نے بادل نخواستہ پسپا ہونے کا فیصلہ کیا۔۔۔۔

ایک رات حملہ آور فوج کے کیمپ سے آگ کے مہیب شعلے نمودار ہوئے اور میسور کیجاسوسوں نے ٹیپو سلطان کو اطلاع دی کہ لارڈ کارنوالس نے اپنی سینکڑوں بیل گاڑیاں خیمے اور بارود کے سہے ذخیرے ایک جگہ جمع کر کے انہیں آگ لگا دی ہے، اور اس نے اپنی بیشتر توپیں بھی ضائع کر دی ہیں۔

اگلی صبح لارڈ کارنوالس واپس بنگلور کا رخ کر رہا تھا۔ بھوک اور بیماری کے باعث اس کے سپاہی قدم قدم پر راستے میں دم توڑ رہے تھے۔ بیل گاڑیوں سے محروم ہونے کے باعث جو تھوڑا بہت سامان یہ کندھوں پر اٹھا کر لائے تھے۔ وہ راستے میں پھینکا جا رہا تھا، عقب اور بازوؤں سے میسور کے حملے کے خوف کا یہ عالم تھا کہ اگر کوئی ساتھی گر جاتا تو اس کو سہارا دینے کے لیے کوئی تیار نہ تھا۔ بارش کے طوفان میں کوئی چھ میل طے کر لینے کے بعد انگریزون کو اپنے سامنے سواروں کے چند دستے دکھائی دیئے اور ان کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی۔ لیکن تھوڑی دیر بعد جب لارڈ کارنوالس اپنے ساتھیوں کی صفیں درست کر چکا تھا تو سرپٹ سواروں کی ایک ٹولی اس کے سر پر پہنچی اور اسے علم ہوا کہ یہ لوگ میسور کے سپاہی نہیں بلکہ مرہٹہ لشکر کے ہراول دستے ہیں اور پرس رام بھاؤ۔ ہری پنت۔ اور دوسرے مرہٹہ سردار باقاعدہ فوج

کیساتھ صرف چند میل کے فاصلے پر ہیں۔ لارڈ کارنوالس نے اپنے لشکر کو پہاری کے دامن میں پڑاؤ ڈالنے کا حکم دے دیا۔ چند گھنٹے کے بعد رہٹوں کی باقی فوج بھی وہاں پہنچ گئی اور ہری نپت نے اپنے گھوڑے سے اترتے ہی لارڈ کارنولس سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ اب آپ کو پسپائی کا کیال ترک کر دینا چاہئے۔ ہم سرنگاپٹم فتح کیے بغیر واپس نہیں جائیں گے، لارڈ کارنولس کا چہرہ غصے سے تمتما اٹھا۔ تاہم اس نے انتہائی ضبط سے کام لیتے ہوئے جواب دیا، اگر آپ لوگ دو تین تک اور یہاں نہ پہنچتے تو میرا کوئی سپاہی آپ کے طعنے سننے کے لیے یہاں زندہ نہ ہوتا، میں شکر گزار ہوں کہ ہمارے اتحادیوں کی بروقت اعانت سے ہمارے واپس بنگلور پہنچنے کے امکانات زیادہ واضح ہو گئے ہیں۔ ہری پنت نے جواب دیا۔ جناب سرنگاپٹم پر چڑھائی کرنے سے پہلے اگر آپ ہمارا انظار کر لیتے تو آپ کو ان حالات کا سامنا نہ کرنا پڑتا۔ ہمیں تو کئی دن تک یہ بھی نہ معلوم ہو سکا کہ آپ سرنگاپٹم کے قریب پہنچ گئے ہیں۔ لارڈ کارنولس نے کہا۔ ہم نے برسات کے آغاز سے پہلے پہلے سرنگاپٹم فتح کر لینے کا فیصلہ کے تھا۔ اور آپ میری تجاویز پر متفق تھے۔ میں نے چند دن یا چند ہفتے نہیں بلکہ چند مہینے تک آپ کا انتظار کرنے کے بعد بنگلور سے پیش قدمی کا فیصلہ کیا تھا۔ اس کے بعد میں آپ کے پاس کئی ایلچی بھیج چکا ہوں، جناب یہ ہماری کوتاہی نہیں بلکہ ہمارے دشمن کا کمال تھا کہ اس نے کوئی ایلچی ہمارے پاس نہیں آنے دیا۔ اور ہم نے جو ایلچی روانہ کے تھے وہ بھی لاپتہ ہیں۔ لیکن اب ہمیں ایک دوسرے پر الزام تراشنے سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ اگر آپ کو رسد اور بارود کی ضرورت ہے تو ہم مہیا کر سکتے ہیں، اب اپ پسپائی کا خیال ترک کر دیں۔ نہیں لارڈ کارنولس نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا، اب مجھ میں دشمن کے مزید

کمالات دیکھنے کی ہمت باقی نہیں رہی ۔آپ اگر مجھ پر کوئی مہربانی کر سکتے ہیں تو وہ یہ ہے کہ آپ ہماری رہی سہی فوج کو بنگلور تک پہنچا دیں ۔میرا مطلب یہ نہیں کہ میں سرنگا پٹم فتح کرنے کا اردہ ترک کر چکا ہوں ۔لیکن میری فوج کا جائزہ لینے کے بعد آپ کو یہ اعتراف کرنا پڑے گا کہ ان حالات میں ہمارے لیے جنگ جاری رکھنا خودکشی کے مترادف ہے، آپ ہمیں جو رسد اور بارود دیں گے وہ چند دنوں کے لیے کافی ہوگا، اس کے بعد آپ کے لشکر کی حالت ہمارے لشکر سے مختلف نہیں ہوگی ۔موسم برسات کے اختتام تک میں اپنی فوج کو دوبارہ منظم کر لوں گا۔پھر اگر آپ نے ہمارا ساتھ دیا تو ہم اس شکست اور ناکامی کا پورا بدلہ لے سکیں گے ۔ اس وقت میرے سامنے یہ مسلیہ ہے کہ ہم جلد از جلد بنگلور پہنچ جائیں ۔مجھے یقین ہے کہ دشمن کے چھاپہ مار دستے اس وقت بھی ہمارے تعاقب میں ہیں ۔اور اگر سلطان ٹیپو نے سرنگا پٹم سے نکل کر ہمارا پیچھا کیا تو ہمیں ایک عبرت ناک تباہی ک اسامنا کرنا پڑے گا۔ ہری پنت نے بددل ہو کر کہا۔ بہت اچھا اگر آپ کی یہی مرضی ہے تو ہم آپ کے ساتھ ہیں۔

☆

ایک دن علی الصبح مراد مکان میں داخل ہوا۔خادمہ صحن میں جھاڑو دے رہی تھی، مراد علی نے آگے بڑھ کر پوچھا، امی جان کہاں ہیں ۔خادمہ نے جواب دیا وہ اوپر نماز پڑھ رہی ہیں ۔اور جین کہاں ہے ۔خادمہ مسکرائی وہ بھی نماز پڑھ رہی ہیں۔ مراد علی نے حیران سا ہو کر کہا جین نماز پڑھ رہی ہے ۔جی ہاں اور اب ان کا نام جین نہیں منیرہ خانم ہے۔-------میں سچ کہتی ہوں وہ اب مسلمان ہو چکی ہیں ۔مراد علی اپنے دل مے خوشگوار دھڑکنیں محسوس کرتا ہوا تیزی سے بالائی منزل کی

سیڑھیوں پر چڑھنے لگا۔آخری سیڑھی کے قریب پہنچ کر وہ ایک لمحے کے لیے رکا۔اور پھر دبے پاؤں آگے بڑھا۔بالائی منزل کے ایک کمرے سے اسے فرحت اور جبین کی آوازیں سنائی دئیں۔اور وہ دروازے کے سامنے رک کر اندر جھانکنے لگا۔فرحت اور جبین نماز سے فارغ ہو کر بارگاہ الٰہی میں ہاتھ پھیلا کر بیٹھی تھیں۔فرحت پرسوز آواز میں دعا مانگ رہی تھی۔اور جبین آہستہ آہستہ اس کے الفاظ دہرا رہی تھی۔مراد علی دروازے سے ایک قدم ہٹ کر یہ دعا سننے لگے۔۔۔مولائے کریم ہمارے سینے ایمان کی روشنی سے منور کر دے۔ہمیں ہمت دے کہ ہم زندگی کے آلام و مصائب کا مقابلہ کر سکیں۔تیری رحمت کے سوا ہمارا کوئی سہارا نہیں۔ہمارے سلطان کو فتح دے اسے دین کا بول بالا کرنے اور اسلام کے دشمنوں کو مغلوب کرنے کی طاقت دے۔ انور اور مراد کو ان کے باپ کی روایات پر چلنے کی ہمت دے۔میرے مولا وہ دن لا جب وہ فتح کے پرچم لہراتے ہوئے گھر واپس آئیں۔میرے مولا ہمارے سلطان کے دشمنوں کو ذلیل و خوار کر۔آمین۔دعا کے بعد وہ باتیں کرنے میں مصروف ہو گئیں۔جبین نے کہا امی جان آج آپ بارش کے لیے دعا کرنا بھول گئی ہیں۔فر حت نے کہا بیٹی اب دشمن کی فوج پسپا ہو چکی ہے اب ہمیں بارشوں کے لیے دعا کرنے کی ضرورت نہیں۔امی جان سرنگا پٹم کے بعد ہمیں دوسرے محاذوں پر اسی قسم کی بارشوں کی ضرورت ہے۔آپ دعا کریں کہ ہمارے دشمنوں کو میسور کی سرزمین پر ایک لمحے کے لیے بھی چین نصیب نہ ہو۔اور وہ جہاں جائیں دنیا کے تمام بادل ان کے استقبال کے لیے وہاں موجود ہوں۔مراد علی نے کہا منیرہ بہن میں اندر آ سکتا ہوں۔فرحت اور جبین نے مڑ کر دروازے کی طرف دیکھا۔اور مراد علی مسکراتا ہوا اندر داخل ہوا۔ماں بلائیں لیتی ہوئی آگے بڑھی۔اور پیار سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے

سر پر رکھ دیئے۔ جے نے مصلی لپیٹ کر ایک طرف رکھ دیا۔ اور فرحت سے دو تین قدم دور کھڑی ہوگئی۔ مراد علی نے جین کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ اگر خادمہ نے میرے ساتھ مزاق نہیں کیا اور آپ سچ مچ مسلمان ہوگئیں ہیں تو میں آپ کو اور آپ سے زیادہ امی جان کو مبارکباد پیش کرتا ہوں۔ منیرہ بہت اچھا نام ہے، چتل ڈرگ میں بھائی جان نے مجھ سے کہا تھا کہ میں نے خواب میں جین کو نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، منیرہ کاش آپ میری خوشی کا اندازہ لگا سکتیں۔ پھر اس نے غور سے اپنی ماں کی طرف دیکھا۔ اور فکر مند ہو کر کہا امی جان کیا بات ہے آپ بہت کمزور نظر آ رہی ہیں۔ بیٹا میں تمہارے جاتے ہی بیمار ہوگئی تھی۔ لیکن اس بیماری سے یہ فائدہ ہوا کہ تمہاری بہن نے اسلام قبول کر لیا ہے، منیرہ کا دل مدت سے اسلام قبول کر چکا تھا۔ لیکن میرا بخار اسے کلمہ پڑھوانے کے لیے ایک بہانہ بن گیا۔ اب تم اطمینان سے ہمیں بیٹھ کر جنگ کے حالات سناؤ۔ وہ قالین پر بیٹھ گئے اور مراد نے کہا، امی جان جنگ کے حالت اب ہمارے حق میں ہیں۔ اگر دشمن پر بارش کے طوفان نازل کرنے میں منیرہ بہن کی دعاؤں کا کوئی عمل دخل تھا تو میسور کے ہر سپاہی کو ان کا شکر گزار ہونا چاہیئے۔ منیرہ نے مسکرا کر کہا۔ بھائی جان اگر میری دعاؤں میں کوئی تاثیر ہوتی تو آج سخت ترین بارش ہونی چاہیئے تھی۔ کل جب آسمان صاف ہونے لگا تھا تو میں نے بڑے درد کے ساتھ مزید بارش کے لیے دعا شروع کی تھی۔ آج بھی میں امی جان کے ساتھ تہجد کے لیے اٹھی تھی اور اس وقت سے دعا کر رہی ہوں۔ لیکن اس کا اثر یہ ہوا کہ اب آسمان بادل کا ایک ٹکڑا بھی نظر نہیں آتا۔ مراد علی ہنس پڑا اور فرحت نے کہا۔ بیٹا جنگ کے متعلق تم نے اپنی بات ختم نہیں کی۔ مراد علی نے کہا امی جان۔ خدا نے ہم پر بڑا فضل کیا ہے۔ لارڈ کارنولس اب مدت تک اپنے زخم چاٹتا رہے گا۔

وہ اپنا بیشتر جنگی سامان ضائع کرنے کے بعد یہاں سے بھاگا ہے۔ مالا بار کی طرف سے انگریزوں کی جو فوج آ رہی تھی وہ اپنا پورا توپ خانہ راستے میں چھوڑ کر پسپا ہو گئی ہے، ہمیں صرف ایک بات کا افسوس ہے اور وہ یہ کہ مرہٹوں کا ٹڈی دل لشکر بر وقت پہنچ جانے کے باعث ہم لارڈ کرنوالس اور میر نظام علی کی فوج کا تعاقب جاری نہیں رکھ سکے۔ اگر مرہٹے صرف دو چار دن تاخیر سے کام لیتے تو میں آپ کو یہ خوش خبری سناتا کہ ہم نے میسور کی سرزمین پر کسی انگریز کو زندہ نہیں چھوڑا۔ منیرہ نے پوچھا، اب انگریزوں کی فوج کہاں ہے۔ اب وہ بنگلور پہنچ چکے ہیں۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ وہ تیاری کے بعد دوبارہ سرنگا پٹم پر چڑھائی کریں گے۔ مراد علی نے جواب دیا۔ کارنوالس برسات گزرنے سے پہلے سرنگا پٹم پر دوبارہ حملے کی جرات نہیں کرے گا۔ لیکن مرہٹوں کی آمد کے باعث دوسرے محاذوں پر دشمن کی سرگرمیاں تیز ہو جائیں گی۔ مجھے آرام کے لیے تین دن کی چھٹی ملی ہے لیکن سلطان کا حکم ہے کہ فوج کے تمام افسر اور سپاہی چوبیس گھنٹے تیار رہیں۔ فرحت نے کہا بیٹا انور علی کی طرف سے کوئی پیغام نہیں آیا۔ امی جان جنگ کے دنوں میں خط بھیجنا کوئی آسان نہیں ہوتا۔ بھائی جان کے متعلق آپ کو فکر مند نہیں ہونا چاہیئے۔ چتل ڈرگ کا قلعہ بہت مضبوط ہے۔ اور میں آج ہی ان کی طرف خط بھیجنے کی کوشش کروں گا۔ وہ یہ سن کر بہت خوش ہوں گے کہ منیرہ مسلمان ہو چکی ہے۔ نہیں نہیں بھائی جان آپ انہیں میرے متعلق کچھ نہ بتائیں، کیوں آپا جان یہ کوئی چھپانے والی بات تو نہیں۔ میں تو سارے شہر میں یہ منادی کرا دینا چاہتا ہوں کہ میری بہن مسلمان ہو چکی ہے۔ منیرہ نے ملتجی ہو کر فرحت کی طرف دیکھا۔ اور اس نے کہا۔ بیٹا منیرہ کی یہ خواہش ہے کہ تمہارا بھائی گھر پہنچ کر یہ خوش خبری سنے۔ اور میں یہ وعدہ کر چکی ہوں کہ میں انور کو اس کے مسلمان

ہونے کی اطلاع نہیں بھیجوں گی۔تم اگر چاہو تو اسے یہ لکھ سکتے ہو، کہ منیرہ بہت کوش ہے اور صبح شام تمہاری سلامتی کے لیے دعائیں کرتی ہے۔نہیں نہیں انہیں صرف یہ بتا دینا کافہ ہوگا کہ میں زندہ ہوں اور میرا نام منیرہ نہیں بلکہ جین ہے۔ بھائی جان آپ وعدہ کرین کے آپ انہین میرے مسلمان ہونے کے متعلق کچھ نہیں لکھین گے۔

مراد علی پریشانی کے عالم میں اس کی طرف دیکھ رہا تھا اس کی حالت اس بچے کی سی تھی جس کے ہاتھ میں کھلونا پکڑا کر یہ کہا جاتا ہو کہ تم اس سے کھیل سکتے ہو لیکن اپنے ساتھیون کو نہیں دکھا سکتے۔اس نے کہا بہن میں آپ کے اعتراض کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔تاہم میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں بھائی جان کو آپ کے متعلق کچھ نہیں لکھون گا۔

انیسواں باب

سرنگا پٹم سے پسپائی کے بعد بنگلور میں اتحادی افواج کا اجتماع لارڈ کارنوالس کے لیے ایک پریشان کن مسلہء بن چکا تھا۔ مرہٹہ فوج اپنے ساتھ جو فالتو رسد لائی تھی۔ وہ اتنے بڑے لشکر کے لیے چند دنوں کی ضرورت سے زیادہ نہ تھی۔ میر ریاست علی اور مرہٹوں کی افواج جن راستوں سے رسد اور کمک حاصل کرتی تھیں۔ وہ سلطان ٹیپو کے طوفانی دستوں کے پے در پے حملوں کے باعث مسدود ہو رہے تھے۔ برسات کی طغیانیوں میں کرناٹک سے رسد اور سامان جنگ حاصل کرنے کے لیے پالا کڈھ کا درہ سب سے آسان اور مختصر راستہ تھا۔ لیکن اس درے میں سلطان کے چند مضبوط قلعے حائل تھے۔ لارڈ کارنوالس کسی تاخیر کے باعث ان قلعوں پر قبض کرنا اپنی زندگی اور موت کا مسلہء سمجھتا تھا۔ لیکن پرس رام بھاؤ، ہری نپت، اور نظام کی فوج کے افسر اپنا عقب غیر محفوظ سمجھ کر یہ مطالبہ کر رہے تھے۔ کہ انگریزی فوج ان کے ساتھ سرا کی پیش قدمی کرے۔ کارنوالس جیسے جہاندیدہ سپاہی کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ سرا کی طرف پیش قدمی سے جس قدر نظام اور مرہٹوں کی افواج محفوظ ہو جائیں گی۔ اسی قدر کمپنی کی مشکلات میں اضافہ ہو جائے گا۔ مرہٹہ سردار اور نظام کی فوج کے چند افسر کچھ دن تک لارڈ کارنوالس کے ساتھ بحث کرتے رہے۔ اور بالآخر یہ فیصلہ ہوا کہ مرہٹے اپنی بیشتر فوج سرا کی طرف روانہ کر دیں۔ نظام کا لشکر شمال مشرق کی طرف پیش قدمی کرئے اور انگریز کرناٹک کے ساتھ رابطہ قائم کرنے کے لیے پالا کڈھ کے درے کی چوکیوں پر حملہ کر دین۔ چنانچہ ہری پنت نے اپنی فوج کے چند دستے کارنوالس کی اعانت کے لیے روک لیے۔ باقی مرہٹہ فوج پرس رام کی کمان میں سرا کی طرف روانہ ہو گئی۔ دکن کے سپہ سالار نے بھی اپنی پیادہ اور سوار

فوج کے چند دستے لارڈ کارنوالس کے سپرد کر دیئے۔ اور باقی لشکر کے ساتھ گرم کنڈہ کی طرف روانہ ہوگیا،

جولائی کے وسط میں لارڈ کارنوالس نےچند شدید معرکوں کے بعد ہوسر اور رایا کوٹی کے قلعوں کے علاوہ پالاکڈھ کے درے کی چند اور چوکیوں پر قبضہ کرلیا، اور کمپنی کی فوج کے لیے کرناٹک سے رسد اور سامان جنگ حاصل کرنے کا راستہ صاف ہو گیا، اس کے بعد سرنگاپٹم کے گرد چند میل کے رقبے کے علاوہ سارےمیسور کو آگ اور خون کا طوفان اپنی آغوش ین لے چکا تھا۔ مرہٹوں کی ٹدی دل فوج سرا اور اس کے جنوب مشرق میں دوسرے ذرخیز علاقوں کو تاخت وتاراج کر رہی تھی۔ دکن کے سوار گرم کنڈہ کے اردگرد ایک وسیع علاقے میں تباہی مچا رہے تھے۔ اور انا نگریزی افواج مغربی اور مشرقی ساحلوں کے درمیان جنوب کے وسیع علاقے فتح کرنے میں مصروف تھیں۔

اتحادی سرنگاپٹم پر دوبارہ یلغار کرنے سے پہلے سلطنت خداداد کے ان قلعوں اور چوکیوں کو فتح کرنا ضروری سمجھتے تھے۔ جن کی افواج کی ناکہ بندی نے اس سے قبل لارڈ کارنولس کے تمام منصوبے خاک میں ملا دیئے تھے۔ لیکن مختلف محازوں پر چند مہینے خونریز جنگیں لڑنیکے بعد انھیں بڑی شدت کے ساتھ اس بات کا احساس ہو رہا تھا کہ سرنگاپٹم کی طرح ان قلعون اور چوکیوں کی قوت مدافعت کے متعلق بھی ان کے اندازے غلط تھے۔ میسور ایک وسیع دلدل تھا اور وہ آئے دن اس کے اند دھنستے جارہے تھے۔

مرہٹوں نے چند اہم شہروں اور قلعوں پر ناکام حملوں کے بعد اپنی تمام تر توجہ ان زرخیز علاقوں کو تباہ و برباد کرنے کے بعد مرکوز کر دی تھی۔ جہاں سے سلطان اپنی

افواج کے لیے رسد حاصل کرتا تھا۔شمال مغرب کے وسیع علاقوں میں انسانی بستیوں کی بجائے راکھ کے انبار ان کی بربریت اور سفاکی کی گواہی دے رہے تھے۔صوبہ سرا میں تباہی مچانے کے بعد پرس رام بھاؤ نے چتل ڈرگ کی طرف پیش قدمی کی۔ لیکن اسے جلد ہی چتل ڈرگ کی دفاعی قوت کا اندزہ ہوگیا۔اور وہ راستے کی چند چھوٹی چھوٹی بستیوں اور شہروں میں لوٹ مار کرنے کے بعد چاندگری کی طرف لوٹ آیا۔اس کے بعد اس نے بڈنور کا رخ کیا۔اور راستے کی چند چوکیوں پر قبضہ کرنے کے بعد شموگہ کے ضلع میں تباہی مچا دی۔ یہاں انگریزی فوج کے ایک ہزار سپاہی اپنے توپ خانے سمیت اس کے ساتھ شامل ہوگئے۔اور جنوری ۱۷۹۱ کے آغاز میں انہوں نے پے درپے حملوں کے بعد شموگہ کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔

شموگہ کے بعد پرس رام نیبڈنور کی طرف پیش قدمی کی۔اور راستے میں انت پور کے علاوہ اور چھوٹے چھوٹے قلعوں پر قبضہ کرلیا۔لیکن اس عرصے میں اسے یہ اطلاع ملی کہ میر قمر الدین کی قیادت میں میسور کے سواروں کا ایک لشکر بڈنور کی طرف بڑھ رہا ہے۔ اس اطلاع نے اسے جنوب مشرق کی طرف پسپائی اختیار کرنے پر مجبور کردیا۔جنوری کے آخر میں پرس رام کی افواج ہوتری ڈرگ کے مقام پر لارڈ کارنوالس کے لشکر میں شامل ہوگئیں۔بڈنور سے پسپا ہونے کے بعد مرہٹوں کا ٹڈی دل لشکر اپنے راستے کی سینکروں بستیاں برباد کرچکا تھا۔

سرنگاپٹم سے لارڈ کارنوالس کی پسپائی کو دس مہینے گزر چکے تھے۔اور ان دس مہینوں میں کم ازکم سات مہینے ایسے تھے جب کہ سلطنت خداداد کی تاریک کا کوئی دن خونریز معرکوں اور سلطان ٹیپو کے اولوالعزم سپاہیوں کے تزکروں سے خالی نہ تھا۔ان سات مہینوں کے دن اور رات کے بیشتر لمحات ایسے تھے جو شیر میسور نے گھو

ڑے کی زین پر گزارے تھے۔ یہ ایک ایسی جنگ تھی جس کی نظیر پورے ہندوستان کی تاریخ میں نہیں ملتی۔ میسور کے جنبازوں کا کتنا کون تھا جو کہ وطن کی آزادی کے لیے بہہ چکا تھا۔۔ کتنے شہر تھے جو ریران ہو چکے تھے۔ کتنی بستیاں تھیں جو راکھ کے انبار بن چکی تھیں۔ میسور کی رعایا کے کتنے آنسو تھے جو وطن کی خاک پر نچھاور ہو چکے تھے، اور میسور کے مجاہدون کے عزم وثبات۔ جرات وشجاعت، اور ایثار وخلوص کی کتنی داستانین تھیں۔ جنھین تاریک اپنے صفحات میں جگہ نہیں دے سکی۔ آج دو صدیون کے بعد ہم ان سوالات کے صحیح جوابات نہیں دے سکتے۔ تاہم جن داستانوں کو مورخوں نے اپنی توجہ کے قابل سمجھا ہے وہ قیامت تک اس دنیا کے انسانون سے اپنا خراج تحسین وصول کرتی رہیں گی

۔لارڈ کارنوا کارنوالس کی پشت پر وہ قوم تھی جس کے جنگی وسائل محدود تھے۔ جنوبی ہند کے ساحلوں پر برطانیہ کے عظیم جنگی بیڑے کا تسلط تھا۔ اپنے رسد اور کمک کے راستے محفوظ کرنے کے بعد لارڈ کارنولس جس قدر اسلحہ او بارود اکٹھا کر چکا تھا۔ وہ اس کی ضرورت سے کہیں زیادہ تھا۔ برطانیہ سے آئے تازہ دم سپاہی اس کی قوت میں اضافہ کرر ہے تھے۔ ہندوستان میں اس کے حلیف وہ تھے جو ہر میدان ین میسور کے ہر سپاہی کے مقابلے میں پانچ سپاہی لا سکتے تھے۔ ایک طویل عرصے کے لیے انگریزوں کے علاوہ ہندوستان کی دو بڑی طاقتوں کا مقابلہ کرنا سلطان ٹیپو کی سپاہیانہ زندگی کا عظیم ترین کارنامہ تھا۔ سلطان کی جنگ صرف دشمن کے خلاف مدافعانہ کاروائیون تک محدود نہ تھی۔ اس کے جانباز اگر ایک میدان میں چند میل پیچھے ہٹتے تو دوسرے میدان میں دشمن کو چند میل پیچھے ہٹنے پر مجبور کر دیتے تھے۔ ایک دن یہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں قلعہ یا فلاں شہر یا فلان چوکی پر دشمن نے قبضہ کرلیا ہے۔ تو دوسر

دن یہ خبر آتی تھی کہ آج فلاں قلعے پر انگریزوں مرہٹوں یا نظام کی بجائے سلطان ٹیپو کا پرچم لہرا رہا ہے۔ ایک دن لارڈ کارنولس کا لشکر ولور کی فتح پر خوشیاں منا رہا تھا تو چند دن بعد اس کے ایلچی اسے یہ خبر سنا رہے تھے کہ سلطان کی فوج نے کلومؔتوپر دوبارہ قبضہ کرلیا ہے۔ جن ایام میں پرس رام بھاؤ کی افواج شموگہ اور بڈنور کے علاقے تخت وتاراج کر رہی تھی۔ انہی ایام میں لارڈ کارنولس کے کیمپ میں یہ دہائی مچی ہوئی تھی۔ کہ سلطان کے فوجی دستے سلیم کے آس پاس انگریزوں کی چوکیاں تباہ کرنے کے بعد کرناٹک میں فورٹ سینٹ جارج کے دروازوں تک پہنچ چکے ہیں۔

ان جنگوں میں سلطان کے کئی تجربہ کار جرنیل شہید ہو چکے تھے۔ لیکن انگریز اور اتحادی یہ محسوس کر رہے تھے۔ کہ سلطان کے ترکش میں ابھی بہت سے تیر باقی ہیں۔ سلطان کا اولوالعزم بیٹا فتح حیدر ان نوجوان افسروں میں سے ایک تھا۔ جو اپنی تلواروں کی نوک سے سلطنت خداداد کی تاریخ کا ایک ورق الٹ رہے تھے۔ فتح حیدر کو اٹھارہ سال کی عمر میں میر نظام علی کے لشکر کے مقابلے کے لیے گرم کنڈہ کی طرف روانہ کیا گیا، حافظ فرید الدین کی قیادت میں حیدر آباد کی فوج نے گرم کنڈہ سے چند میل دور اس کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ لیکن جواں سال شہزادے نے اسے عبرتناک شکست دی۔ حافظ فرید الدین جنگ میں مارا گیا۔ اور فتح حیدر نے آگے بڑھ کر ایک شدید حملہ کے بعد گرم کنڈھ کے قلعے پر قبضہ کرلیا۔

لیکن ان تمام باتوں کے باوجود سلطان ٹیپو کی افواج اپنے محدود وسائل کے باعث جنگ کا پانسہ نہ پلٹ سکیں۔ یہ درست ہے کہ چند ماہ کے ان انگنت معرکوں میں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کے لشکر کے نقصانات میسور کے مقابلے میں کہیں زیادہ تھے۔ لیکن ان کے وسائل اس قدر لامحدود تھے کہ وہ ہر وقت اپنے نقصانات

کی تلافی کر سکتے تھے۔ اپنے نقل وحمل کے راستے محفوظ کر لینے کے بعد انہیں اسلحہ۔ بارود اور رسد اور تازہ دم سپاہی حاصل کرنے میں کوئی دشواری نہ تھی۔ پرس رام اور ہری پنت کی پشت پر پوری مرہٹہ قوم تھی۔ حیدر آباد کی فوج کی اعانت کے لیے بھی تازہ دم دستے پہنچ رہے تھے۔ انگریز سپاہیوں کی تعداد میں بھی بہت اضافہ ہو چکا تھا۔ لیکن سلطان کو باہر سے کسی اعانت کی امید نہ تھی۔ میسور کے زرخیز علاقے جہاں سے اسے رسد ملتی تھی تباہ و برباد ہو چکے تھے۔ اتحادی کئی ایسے شہروں پر قبضہ کر چکے تھے جن کے کارخانوں میں میسور کے لیے اسلحہ اور بارود تیار ہوتا تھا۔ سلطان کی آخری امید یہ تھی کہ جنگ کی طوالت کے باعث شدید اتحادی ایک دوسر کا ساتھ چھوڑ دئیں۔ لیکن یہ امید بھی موہوم ثابت ہوئی۔ میر نظام علی اور نانا فرنولیس انگریزوں کے ساتھ وطن کی آزادی اور عزت کا سودا کو چکے تھے۔

ماہ فروری ۱۷۹۲ کے آغاز میں انگریزوں، مرہٹوں اور نظام کی افواج اپنے اپنے قب سے مطمئن ہو کر سرنگا پٹم کی طرف بڑھ رہی تھیں



ایک دوپہر فرحت اور منیرہ نچلی منزل کے ایک کمرے، میں بیٹھی ہوئی تھین۔ فرحت ایک کتاب پڑھ رہی تھی اور منیرہ کپڑا سینے میں مصروف تھی۔ اچانک انہیں دروازے کے قریب مراد علی کی آواز سنائی دی۔ امی جان۔ فرحت کے ہاتھ سے کتاب گر پڑی اور وہ دم بخود ہو کر دروازے کی طرف دیکھنے لگی۔ مراد علی لڑکھڑاتا ہو اکمرے میں داخل ہوا منیرہ کپڑا ایک طرف پھینک کر جلدی سے آگے بڑھی اور اس کا بازو پکڑ کر بولی بھائی جان کیا بات ہے۔ کچھ نہیں بہن میں بالکل ٹھیک ہوں۔ یہ کہہ کر مراد علی اآگے بڑھا اور فرحت کے قریب بیٹھ گیا فرحت چند ثانیے سکتے کے عالم

میں اس کی طرف دیکھتی رہی اور پھر اچانک اس نے مراد علی کی طرف اپنا ہاتھ بڑھا کر اس کا سر اپنی آغوش میں لے لیا۔ میرے لال، میرے لال تم بہت کمزور ہو گئے ہو۔ اور اتنی مدت کے بعد میرے کانوں کو بھی تمہاری آواز اجنبی محسوس ہوتی ہے۔ مراد علی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا، امی جان مجھے کئی دن سے آرام نہیں ملا اور میں نے دو دن سے کچھ بھی نہیں کھایا۔ میں ابھی کھانا تیار کرواتی ہوں منیرہ یہ کہہ کر کمرے سے باہر نکل گئی، مراد علی سیدھا ہو کر بیٹھ گیا اور کہنے لگا امی جان بھائی جان کا کوئی خط آیا ہے۔ ماں نے آبدیدہ ہو کر کہا ہمیں دو ماہ سے اس کے متعلق کوئی اطلاع نہیں ملی، اس نے اپنے آخری خط میں لکھا تھا کہ میں چتل ڈرگ سے شموگہ کی طرف جا رہا ہوں، اس کے بعد کوئی اطلاع نہ آئی۔ مراد علی کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا امی جان آپ فکر نہ کریں مجھے یقین ہے کہ بھائی جان محفوظ ہیں۔ موجودہ حالات میں ان کے لیے خط بھیجنا بہت مشکل ہے۔

منیرہ کمرے میں داخل ہوئی اور مراد کے قریب ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولی، آپ کا کھانا چند منٹ میں تیار ہو جائے گا۔ امی جان آپ کے متعلق بہت پریشان تھیں آپ اتنا عرصہ کہاں تھے۔ مراد علی نے جواب دیا گزشتہ چار ماہ سے میں غازی کے ساتھ تھا۔ اور ہمیں کبھی عقب سے انگریزوں کے راستے کاٹنے اور کبھی اپنی رسد اور کمک کے راستے کاٹنے اور کبھی اپنی رسد کے قافلوں کی حفاظت اور کبھی مرہٹوں کی پیش قدمی روکنے کے لیے بھیج دیا جاتا تھا۔ گرم کنڈہ کی جنگ میں میں شہزادہ فتح حیدر کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد مجھے کوئمبٹور کے محاذ پر بھیج دیا گیا تھا۔ کوئمبٹور فتح کرنے کے بعد ہمارے دستے کرناٹک کے وسط تک پہنچ چکے تھے۔ اگر ہم چند دن تک شمال مشرق کی جانب سے مرہٹوں کی لاتعداد فوج کی پیش قدمی روک سکتے تو آج لارڈ

کارنوالس کو سرنگاپٹم پر حملہ کرنے کی بجائے مشرقی ساحل کی بندرگاہیں بچانے کی فکر ہوتی۔ اور اب کیا ہوگا منیرہ نے مغموم، لہجے میں سوال کیا۔ مراد علی نے جواب دیا اب میسور کی آزادی کی جنگ سرنگاپٹم کی خندقوں، فصیلوں، گلیوں اور بازاروں میں لڑی جائے گی، دشمن ہماری لاشیں روندے بغیر ہماری آزادی کے پرچم کو ہاتھ نہیں لگا سکتا، اب ہماری کوشش یہ ہوگی کہ موسم برسات تک دشمن کو کاویری کے پار روکا جائے اور برسات کے موسم میں ہم اپنے دشمنوں پر پھر ایک بار یہ ثابت کر سکیں گے کہ انہوں نے اس مرتبہ بھی ہماری قوت کا صحیح اندازہ لگانے میں غلطی کی ہے۔ فرحت نے پوچھا بیٹا اب تمہیں کہیں باہر تو نہیں بھیجا جائے گا۔ مجھے نہیں معلوم امی جان، لیکن میرا خیال ہے کہ موسم برسات کے آغاز تک میں یہیں رہوں گا۔ لیکن یہاں بھی میری مصروفیات ایسی ہوں گی کہ میں شاید ہر روز آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکوں۔

دریائے کاویری کی دو شاخوں کے درمیان سرنگاپٹم کا جزیرہ ساڑھے تین میل لمبا اور ڈیڑھ میل چوڑا تھا۔ شمال مغربی کونے میں جزیرے کا تقریبا ایک تہائی حصہ قدیم شہر اور قلعے کی خندقوں اور فصیلوں کے اندر گھرا ہوا تھا۔ بیرونی فصیل کے بعض حصے بیس فٹ اور بعض پینتیس فٹ بلند تھے۔ شاہی محل شمال کی جانب تھا۔ قلعے کے شمال مشرقی کونے سے پانچ سوگ مشرق کی جانب جو مورچے تعمیر کیے گئے تھے۔ وہ مٹی کی ایک کشادہ اور بلند دیوار سے گھرے ہوئے تھے۔ جزیرے کے مشرقی حصے کے عین درمیان ایک پر رونق قصبہ شہر گنجام کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ اس سے متصل مشرقی کونے میں لال باغ تھا۔ دریا کی دو شاخوں کے علاوہ جگہ جگہ بلند پشتوں پر سلطان کی توپیں اس جزیرے کی حفاظت کرتی تھیں۔ جزیرے کے اندرونی حصوں میں بھی جگہ جگہ فصیلوں اور پشتوں پر توپیں نصب تھیں۔ اس کے علا

وہ کناروں کے ساتھ ساتھ گھاس کے گھنے درخت اور خاردار جھاڑیاں ایک باڑ کا کام دیتی تھیں۔ شمال مشرق کی طرف دریا کے پار ایک پہاڑی پر سلطان کے توپخانے ایک بیرونی دفاعی خط کا کام دیتے تھے۔ پانچ ہزار سواروں اور چالیس ہزار پیادہ سپاہیوں پر مشتمل فوج جزیرے کے مختلف حصوں پر پھیلی ہوئی تھی۔

۵ فروری کے دن اتحادی افواج سرنگاپٹم کے شمال میں تقریباً چار میل کے فاصلے پر فرنچ راکس کے پیچھے پڑاؤ ڈال چکی تھیں۔ لارڈ کارنوالس کی فوج بائیس ہزار آزمودہ سپاہیوں پر مشتمل تھی۔ حیدر آباد کے اٹھارہ ہزار سپاہیوں کے علاوہ کمپنی کی دو بٹالین شہزادہ سکندر جاہ کی کمان میں تھیں اور ہری پنت کے لشکر کے علاوہ بارہ ہزار مرہٹہ سوار سرنگاپٹم میں حصہ لینے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔ انگریزوں اور ان کے اتحادیوں کے لیے سرنگاپٹم پر قبضہ کرنا ان کے وقار کا مسئلہ بن چکا تھا۔ انھیں اپنی قوت کی برتری کا احساس تھا۔ لیکن اس کے باوجود جنگ کی طوالت کو اپنے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ سرنگاپٹم پر گزشتہ حملے کے نتیجے میں لارڈ کارنوالس نے جو سبق سیکھا تھا۔ اس کے بعد وہ برسات کی طغیانیوں کو سلطان ٹیپو کا سب سے بڑا حلیف سمجھتا تھا۔ برسات کی آمد میں صرف اڑھائی یا تین مہینے باقی تھے۔ اور اتحادی بڑی شدت کے ساتھ یہ بات محسوس کرتے تھے کہ اگر یہ جنگ برسات سے پہلے ختم نہ ہوئی تو بیرونی قلعوں اور چوکیوں میں سلطان کی رہی سہی فوج کی سرگرمیوں سے ان کا عقب انتہائی غیر محفوظ ہو جائے گا۔ پرس رام بھاؤ کا لشکر اور بمبئی کے گورا سپاہی جو ایبرو کمبی کے ساتھ آرہے تھے ابھی سرنگاپٹم کے راستے میں تھے۔ سکندر جاہ اور ہری پنت حملہ کرنے سے پہلے ان کا انتظار کرنا چاہتے تھے۔ لیکن کارنوالس معمولی تاخیر بھی اپنے لیے خطرناک سمجھتا تھا۔

۲فروری کو غروب آفتاب سے دو گھنٹے بعد انگریزی فوج کے پے دہ دستے تین حصوں میں تقسیم ہو کر جزیرے کا رخ کر رہے تھے۔ دریا سے کچھ دور چلنے کی بجائے زمین پر رینگتے ہوئے آگے کی جانب بڑھ رہے تھے۔ سردی کے موسم میں دریا کے پایاب تھا۔ اور حملہ آوروں کے تین ڈویژن آدھی رات کے قریب شمالی مشرقی کنارے کے بعض مقامات پر پاؤں جما کر بانس کے گھنے درختون سے اپنا راستہ صاف کر رہے تھے۔

سرنگا پٹم کے محافظون کے لیے یہ حملہ غیر متوقع تھا۔ اور رات کے وقت بیرونی پشتون کی جانب سے ان کی گولہ باری زیادہ موثر نہ تھی۔ سلطان کی سوار فوج کے میدان میں آنے سے پہلے حملہ آور چند پشتوں پر قبضہ کر چکے تھے۔ جنرل میدوز ایک دویژن کے ساتھ عید گاہ کے پشتے کی جانب جا نکلا۔ جہان سید حمید کے دستے متعین تھے۔ سید حمید اور اس کے چار سو ساتھی لڑتے ہوئے شہید ہو گئے اور جنرل میدوز نے پشتے پر قبضہ کر لیا۔ اس عرصے میں انگریزی فوج کا دوسرا ڈویژن دولت باغ کے قریب شدت کی گولہ باری کا سامنا کرنے کے بعد پسپائی اختیار کر رہا تھا، تیسرا ڈویژن ایک گھمسان کی جنگ کرنے کے بعد مشرقی کنارے کی چند توپون پر قابض ہو چکا تھا، رات کے تیسر پہر بیرونی مورچوں اور پشتوں کے محافظ ایک گیر منظم صورت میں جگہ جگہ حملہ آورون کا مقابلہ کر رہے تھے۔ اور اس صورت حلا سے فائدہ اٹھا کر کارنوالس کی فوج کے چند دستے دریا عبور کر کے دولت باغ اور شہر گنجام کے مشرق میں کئی اہم مورچون پر قابض ہو چکے تھے، طلوع عھر کے قریب سلطنا کے پیادہ اور سوار سپاہیون نے ایک خونریز لڑائی کے بعد چند مورچون پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ لیکن سرنگا پٹم کی دفاعی لائن دوبارہ ٹوٹ چکی تھی۔ اور طلوع آفتاب سے

کچھ دیر بعد حیدر آبادی اور مرہٹہ افواج بھی جزیرے کے بعض حصوں پر پاؤں جما چکی تھیں۔

گزشتہ رات کی لڑائی کے شدید نقصانات کے باوجود یہ کامیابی اتحادیوں کی توقع سے زیادہ تھی۔ لیکن دوپہر کے وقت انہیں ایک بار پھر سلطان کا پلہ بھاری نظر آتا تھا۔ میسور کے جانباز پے درپے حملوں سے انھیں دریا کیطرف دھکیل رہے تھے۔ لارڈ کارنوالس کو اس بات ک ایقین تھا کہ اتحادی افواج جزیرے پر پاؤں جمانے کے بعد چند گھنٹے کے اندر اندر قلعے کے دروازے توڑ رہی ہو گی۔ لیکن اس کی توقع غلط ثابت ہوئی۔ اتحادی افواج پورے اٹھارہ دنوں کی پیہم جدوجہد کے باوجود ان مورچوں سے آگے نہ بڑھ سکیں۔ جن پر انھوں نے جنگ کے ابتدائی چند گھنٹوں میں قبضہ کر لیا تھا، قلعے کے ارد گرد کے مورچوں اور پشتوں پر سلطان کے جانباز ابھی تک ڈٹے ہوئے تھے اور قلعے کی فصیلیں اور خندقیں لارڈ کارنوالس کو ایک اور طویل صبر آزما جنگ کا پیغام دے رہی تھیں۔ ایک رات مراد علی نے اپنے مکان کی ڈیوڑھی پر دستک دی۔ کریم خان نے دروازہ کھولا اور کہا، خدا کا شکر ہے کہ آپ آگئے دلاور خان کی حالت بہت خراب ہے۔ کیا ہوا اسے۔ مراد علی نے پریشان ہو کر پوچھا۔ جی اسے بخار ہے طبیب ابھی دیکھ کر گیا ہے۔ اور بی بی جی اس کے پاس بیٹھی ہوئی ہیں۔ مراد علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا ڈیوڑھی سے دور نوکروں کی رہائش گاہ کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ دلاور خان آنکھیں بند کیے ہوئے بیٹھا تھا۔ اور فرحت اور منیرہ اس کے پاس ایک چھوتی سی کھاٹ پر بیٹھی ہوئی تھیں۔ منور ایک طرف ط دیوار کے ساتھ ٹیک لگائے کھڑا تھا۔ مراد علی اسلام وعلیکم کہہ کر آگے بڑھا۔ اور اس نے دلاور کان کی پیشانی پر ہاتھ رکھ دیا، دلاور خان نے آنکھیں کھولیں اور چند ثانیے ٹکٹکی

باندھ کر مراد علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے نحیف آواز میں کہا۔ میں بڑی بے تابی سے آپ کا انتظار کر رہا تھا، بی بی جی کہتی ہیں لڑائی بند ہوگئی ہے۔ ہاں بیچ لڑائی بند ہوگئی ہے۔ لیکن دشمن نے صلح کے لیے جو شرائط پیش کی ہیں۔ وہ شاید سلطان معظم کے لیے قابل قبول نہ ہوں۔ پھر وہ فرحت کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ امی جان انھیں کب سے بخار ہے۔ بیٹا یہ پرسوں سے اسی طرح پڑا ہوا ہے۔ دلاور کنانے کہا آپ کو میری بیماری سے پریشان نہیں ہونا چاہئیے۔ مجھے یہ بتائیے دشمن نے صلح کے لیے کیا شرائط پیش کی ہیں،، مراد علی نے جواب دیا۔ دشمن نے ہماری آدھی سلطنت کے علاوہ تین کروڑ اور ساٹھ لاکھ کا مطالبہ کیا ہے۔ اس میں سے ایک کروڑ ساٹھ لاکھ ہمیں فوراً ادا کرنا ہوگا۔ اور باقی ایک سال کے اندر اندر چار سالوں میں ادا کرنا ہوگا۔ جب صلح کے معاہدے کی تمام تفصیلات طے ہو جائیں گی تو فریقین جنگی قیدیوں کو رہا کر دین گے۔ فرحت نے مغموم لہجے میں کہا، بیٹا یہ شرائط تو بہت سخت ہیں۔ مراد علی نے مغموم لہجے میں کہا ان حالات میں ہم اپنے دشمن سے اس سے بہتر بات کی توقع نہیں کر سکتے۔ وہ ہمارے زخم دیکھ چکے ہیں۔ اگر انھیں جنگ کی طوالت کا خوف نہ ہوتا تو وہ ان شرائط پر بھی صلح کے لیے آمادگی ظاہر نہ کرتے۔ آج زمانے کی گردش نے گیدڑھوں کو شیر اور گدھوں کو عقاب بنا دیا ہے۔ ہمارے لیے اس سے زیادہ المناک بات اور کیا ہوسکتی ہے۔ کہ انگریز مسلمانوں کی عزت اور ناموس کے سب سے بڑے محافظ سے یہ مطالبہ کر رہے ہیں۔ کہ تم اپنے دو بیٹوں کو یرغمال کے طور پر ہمارے حوالے کر دو،

منیرہ نے آبدیدہ ہو کر کہا لیکن بھائی جان یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ سلطان اپنے دو بیٹوں کو دشمن کے حوالے کر دین،، مراد علی نے جواب دیا اس وقت سلطان معظم اپنے

بیٹوں سے زیادہ اپنی رعایا کیمتعلق سوچتے ہوں گے۔ اگر انہیں صلح کی صورت میں میسور کا کوئی فائدہ نظر آیا۔ تو وہ ایک باپ کی محبت کو ایک حکمران کے فرائض پر اثر انداز نہیں ہونے دین گے۔ دلاور علی ایک سکتے کے عالم میں مراد علی کو دیکھتا رہا۔ پھر وہ اچانک اٹھ کر بیٹھ گیا، اور غضبناک لہجے میں چلانے لگا، نہین نہیں یہ نہیں ہو سکتا۔ میسور کے سپاہی کبھی یہ گوارا نہیں کرین گے، کہ ان کے شہزادے دشمن کے حوالے کر دیے جائین۔ میسور کی رعایا کے لیے ایسی صلح موت سے بدتر ہو گی۔ جب ایسا وقت آئے گا تو وہ میسور کے شہزادوں کے راستے میں لاشوں کی سیج بچھانے کے لیے تیار ہو جائین گے۔ مراد علی نے کہا، چچا آپ آرام سے پڑے رہین، سلطان معظم کو اپنی رعایا کی وفاداری اور اپنے سپاہیوں کی ہمت وشجاعت کے متعلق کوئی شک وشبہ نہین،

دلاور خاں کچھ کہنا چاہتا تھا کہ اچانک شدید کھانسی کا دورہ پڑا اور کھانسی کے باعث اس کے منہ سے کوئی آواز نہ نکل سکی۔ دو تین منٹ کھانسنے کیبعد اس نے نڈھال سا ہو کر آنکھیں بند کر لیں۔ اور مراد علی نے اسے بازووں سے پکڑ کر بستر پر لٹا دیا، تھوڑی دیر کمرے میں خاموشی طاری رہی۔ بالآ کر مراد علینے اپنی ماں کی طرف متوجہ ہو کر کہا، امی جان آپ ارام کریں میں یہاں بیٹھتا ہوں۔ دلاور خان نے کراہتے ہوئے انکھیں کھول لین اور مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر نحیف آواز میں کہا۔ آپ کو میرے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے،، آپ گھر جا کر کھانا کھائیں۔ میں بالکل ٹھیک ہوں ابھی تک شاید بی بی جی نے اور منیرہ نے بھی کھانا نہیں کھایا۔ مراد علی نے تھوڑی دیر بعد تذبذب کے عالم میں اٹھتے ہوئے کہا۔ بہت اچھا میں ابھی آتا ہوں۔ منور تم چچا کے پاس رہو اور کریم خان کو بھی یہاں بلا لو۔ دلاور خان نے کہ نہیں جی کریم خان کی یہاں ضرورت نہیں۔ وہ بہت بے وقوف ہے۔ کیوں چچا کیا کیا اس

نے۔

جی اسے بار بار نبض ٹٹولنے کا شوق ہے۔اور مجھے اس کی تیمارداری سے تکلیف ہوتی ہے۔جب صابر بیمار ہوا تھا تو وہ یہ کہا کرتا تھا کہ میرا باپ اسی بیماری سے مرا تھا۔اور اب میں بیمار ہوا ہوں تو وہ یہ کہتا ہے کہ میری ماں اسی بیماری سے مری تھی۔شہر میں کوئی بیوقوف سنیاسی اس کا دوست ہے۔اور اس نے اسے چند بوٹیوں کے نام بتا دیے ہیں۔اب یہ ہر روز کسی درخت یا جھاڑی کے پتے توڑ کر میرے پاس لے آتا ہے۔اور مجھے مجبور کرتا ہے کہ میں حکیم صاحب کی دوائی کھانے کی بجائے اس کا نسخہ استعمال کروں۔منیرہ نے فکرمند ہوتے ہوئے کہا آپ نے اس کی کوئی دوائی کھائی تو نہیں۔۔نہیں جی میں کوئی بے وقوف تھوڑی ہوں۔مراد علی نے منور سے کہا۔تم ان کا خیال رکھو اور کریم خان سے کہو ان کو پریشان نہ کرے۔میں ابھی آتا ہوں آیئے امی جان۔فرحت اور منیرہ اٹھیں اور مراد علی کے پیچھے کمرے سے نکل گئیں۔

۲۶ فروری کی دوپہر سلطان ٹیپو کے دو کمسن بیٹے، شہزادہ عبدالخالق اور شہزادہ معزالدین قلعے سے باہر نکلے اور سجے ہوئے ہاتھیوں پر سوار ہو گئے۔ان کے آگے چند آدمی نیزے اور جھنڈے اٹھائے ہوئے تھے۔پیچھے دو اور ہاتھیوں پر سلطان کے وکیل رضا علی اور غلام علی سوار تھے۔ہاتھیوں کے پیچھے تقریباً دو سو پیادہ سپاہی اور سوار تھے، دروازے کے سامنے کشادہ میدان میں ہزاروں انسان اپنے حکمران کے بیٹوں کو الوداع کہنے کے لیے جمع ہو چکے تھے۔سلطان ٹیپو فصیل کے ایک برج سے یہ دلگداز منظر دیکھ رہا تھا۔شہزادہ عبدالخالق کی عمر آٹھ سال اور معزالدین کی عمر ابھی پانچ سال تھی۔قلع کی توپوں نے سلامی دی اور یہ قافلہ روانہ ہوا، قلعے کی فصیل سے یہ

منظر دیکھنے والے سپاہیوں اور دروازے کے ساتھ کھڑے ہوئے لوگوں میں کوئی ایسا نہ تھا۔ جس کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز نہ تھیں۔ لیکن سلطان کے چہرے پر ایک غایت درجے کا سکون تھا۔ ایک افسر نے آگے بڑھ کر سلام کیا اور کہا عالی جاہ، ڈھونڈیا داغ قدم بوسی کی اجازت چاہتا ہے، ڈھونڈیا داغ وہ کہاں ہے، عالی جاہ وہ ابھی ابھی پہنچا ہے۔ میں نے اسے کہا تھا کہ ابھی ملاقات نہیں ہوسکتی۔ لیکن وہ مصر ہے۔ بلاؤ اسے۔ افسر سلام کر کے نیچے اتر گیا اور تھوڑی دیر بعد ڈھونڈیا داغ سیڑھیوں سے نمودار ہوا۔ اس نے آگے بڑھ کر سلطان کے پاؤں چھونے کی کوشش کی، لیکن سلطان نے اسے ہاتھ کے اشارے سے منع کرتے ہوئے کہا۔ مجھے تمہارے آداب پسند نہیں کہو کیا کہنا چاہتے ہو، ڈھونڈیا داغ نے آبدیدہ ہو کر کہا، عالی جاہ میں یہ التجا لے کر آیا ہوں کہ آپ شہزادوں کو دشمن کے حوالے نہ کیا کریں۔ سلطان نے جواب دیا اب ان باتوں کا وقت گزر چکا ہے۔ لیکن عالی جاہ صلح کے متعلق دشمن کی نیت نیک نہیں، میں کل سے دشمن کے پڑاؤ کا چکر لگا رہا تھا، اور میں نے اپنے کانوں سے کئی مرتبہ مرہٹے سرداروں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے سنا ہے۔ وہ شہزادوں کو قیدی بنا کر آپ سے بدترین شرائط منوانا چاہتے ہیں۔ سلطان نے کہا ڈھونڈیا داغ ایک سلطان کی زندگی میں کبھی ایسا وقت بھی آتا ہے۔ جب اسے لڑنے کی بجائے اپنی تلوار کو نیام میں ڈالنے کے لیے زیادہ ہمت کی ضرورت ہوتی ہے۔ تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں کہ میرے دشمن کیسے ہیں، اور ان کے عزائم کیسے ہیں میں اپنے دشمنوں کو اچھی طرح جانتا ہوں، اور عالیجاہ یہ جانتے ہوئے بھی آپ اپنے بیٹوں کو دشمنوں کے حوالے کر رہے ہیں، میری جنگ اپنے بیٹوں کے لیے نہیں تھی میسور کے لیے تھی۔ اور اب میسور کے حالات کا تقاضا یہ ہے کہ میں اپنی تلوار نیام میں ڈال

لوں۔موجودہ حالات میں میں اپنی رعایا سے مزید قربانیوں کا مطالبہ نہیں کر سکتا۔تم کاویری کے پار ہماری بستیوں کا حال دیکھ چکے ہو، جو دشمن کے ہاتھوں تباہ ہو چکی ہیں، اور میں تمہیں یہ بتانے کی ضرورت نہیں سمجھتا کہ یری بے بس رعایا کو امن کی ضرورت ہے۔میں نے یہ جنگ شروع نہیں کی تھی۔تم جانتے ہو کہ میں میسور کو اس جنگ سے بچانے کی ہر ممکن کوشش کر چکا ہوں، اب اگر دشمن نے کسی وجہ سے صلح کے لیے آمادگی ظاہر کی ہے تو میں مستقبل کی امید پر حال کی تلخیاں برداشت کرنے سے دریغ نہیں کروں گا۔ڈھونڈیا داغ نے کہا، عالی جاہ مجھے اپنی کمتری کا اعتراف ہے، میں وہ باتیں نہیں سوچ سکتا، جو میرے بادشاہ کے ذہن میں آسکتی ہیں۔میں جانتا ہوں کہ آپ کا فیصلہ اٹل ہے۔اور میں یہ بھی جانتا ہوں کہ آپکا کوئی فیصلہ بھی غلط نہیں ہوتا، لیکن ان تمام باتوں کے باوجود میں ان شرافت اور انسانیت کے دشمنوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا، جن کے باعث ہمیں یہ دن دیکھنا پڑ رہا ہے۔میں مرتے دم تک یہ نہیں بھولوں گا کہ میرے آقا کے بیٹے میرے سامنے قیدی بنا کر لا ئے گئے تھے، میں انگریزوں کو معاف کر سکتا ہوں کیونکہ میسور کے حریت پسندوں کے ساتھ ان کی دشمنی کی وجہ میری سمجھ میں آسکتی ہے۔لیکن میں نظام اور مرہٹوں کو کبھی معاف نہیں کروں گا، جوان چوروں اور ڈاکوؤں کو ہمارے گھروں تک لائے ہیں، ڈھونڈیا داغ اب تمہیں صبر سے کام لینا چاہیے، میں تمہیں خبردار کرتا ہوں کہ جب تک ان کی طرف سے متارکہ جنگ کی شرائط کی خلاف ورزی نہیں ہو گی۔میں میسور کی حدود کے اندر تمہیں ایسے کسی اقدام کی اجازت نہیں دونگا۔جو ہمارے درمیان وجہ نزاع بن جائے۔ڈھونڈیا داغ نے جواب دیا۔عالی جاہ خدا نے آپ کو ایک بادشاہ کا دل دیا ہے اور آپ صبر سے کام لے سکتے ہیں لیکن مجھ میں اتنی ہمت نہیں، سلطان نے

قدرے تلخ ہو کر کہا ڈھونڈیا داغ تم کیا چاہتے ہو۔ کچھ نہیں عالی جاہ میں آپ کا ادنیٰ غلام ہوں۔ اور مجھے میسور کی حدود کے اندر دم مارنے کی اجازت نہیں ہو سکتی۔ لیکن میسور کی حدود سے باہر آپ میرے کسی فعل کے ذمہ دار نہیں ہوں گے، مجھے اجازت دیجئے۔ تم جا سکتے ہو سلطان نے یہ کہہ کر منہ پھیر لیا،

اتحادی صلح کی شرائط طے کرنے سے پہلے تاوان جنگ کی پہلی قسط طے کرنے پر مصر تھے، لیکن ایک طویل جنگ کے اخراجات کے باعث سلطان کے بیت المال میں ایک کروڑ ساٹھ لاکھ کی مطلوبہ رقم پوری کرنے کے لیے روپیہ نہ تھا۔ اور اتحادی اسے چند دن کی بھی مہلت دینے کے لیے تیار نہ تھے، سلطان نے شاہی محل سے سونے اور چاندی کے برتن اور قیمتی جواہرات جمع کیے۔ شاہی خاندان کی خواتین نے بھی اپنے تمام زیورات اتار کر اس کے قدمون میں ڈھیر کر دیئے۔ تاوان کی رقم جمع کرنے میں سرنگا پٹم کے تجارت پیشہ لوگوں نے بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، یہ لوگ رضا کارانہ طور پر سلطان کی خدمت میں پیش ہوتے اور حسب توفیق روپوں کی تھیلیاں اس کے قدمون ڈھیر کر دیتے۔ سرنگا پٹم کی با اثر خواتین بھی اس مہم میں حصہ لے رہی تھیں۔ وہ لوگوں کے گھروں میں جاتیں اور اپنی بہنون سے چندے کے لیے اپیل کرتیں، مطلوبہ رقم ادا کرنے کے متعلق اپنے حکمران کا وعدہ پورا کرنا ہر امیر اور غریب کے لیے ایک قومی مسلہء بن چکا تھا۔ اور ہندوستان کی تاریخ میں راعی اور رعیت ایک نئی چیز تھی۔ ایک صبح چار کہار ایک خوبصورت پالکی اٹھائے شاہی محل کے دروازے پر نمودار ہوئے۔ پہریداروں نے انہیں ہاتھ کے اشارے سے روکا۔ ایک فوجی افسر ڈیوڑھی سے نمودار ہوا۔ اور اس نے پالکی کے قریب پہنچ کر کہاروں سے سوال کیا۔ اس پالکی پر کون ہے۔ ایک کہار نے جواب دیا جناب اس پالکی پر انور

علی کی والدہ ہیں، انھیں نادر لے چلو۔افسر یہ کہہ کر ان کے آگے چل پڑا، اور کہار اس کے پیچھے ہو لیے۔دوسری ڈیوڑھی کے قریب رک کر افسر نے کہاروں کی طرف دیکھا اور کہا تم یہاں ٹھہر جاؤ، میں درواغہ صاحب کو اطلاع دیتا ہوں۔کہاروں نے اس کے حکم کی تعمیل کی۔اور وہ تیزی سے قدم اٹھاتے ہوئے اندر چلا گیا۔کوئی پانچ منٹ کے بعد محل کا درواغہ ڈیوڑھی سے نمودار ہوا اور اس نے پالکی کے قریب آ کر کہا محترمہ آپ معظم علی کی بیوہ ہیں، جی ہاں۔تشریف لائیے سلطان معظم آپ کا انتظار کر رہے ہیں، فرحت برقع اوڑھے پالکی سے باہر نکلی اور درواغہ کے پیچھے چل دی۔تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک طویل اور کشادہ برآمدے سے گزرنے کے بعد ایک کمرے کے اندر داخل ہوئے۔داروغہ نے کہا آپ یہاں ٹھہریئے، سلطان معظم ابھی تشریف لاتے ہیں۔داروغہ یہ کہہ کر باہر نکل گیا۔فرحت نے برقع سے ہاتھ باہر نکال کر چاندی کی ایک صندوقچی اور مخمل کی ایک تھیلی ایک کرسی پر رکھ دی۔اور کو دوسری کرسی پر بیٹھ گئی۔یہ کشادہ کمرہ بیش قیمت قالینوں اور کرسیوں سے آراستہ تھا۔کوئی دس منٹ کے بعد فرحت کے دائیں ہاتھ ایک دروازہ کھلا۔اور سلطان ٹیپو برابر کے کمرے سے نمودار ہوا۔فرحت اٹھ کھڑی ہوگئی۔سلطان نے آگے بڑھ کر کہا آپ معظم علی کی بیوہ ہیں، جی ہاں تش ریف رکھیے، فرحت بیٹھ گئی۔سلطان نے قدرے توقف کے بعد کہا۔مجھے افسوس ہے کہ آپ کو انتظار کرنا پڑا۔میں بہت مصروف تھا۔مجھے اپ کا خط مل اتھا اگر آپ انور علی کے متعلق کچھ کہنا چاہتی ہیں تو اپ کو اتنی تکلیف اٹھانے کی ضرورت نہیں تھی۔آپ نے مراد علی کو بھیج دیا ہوتا معظم علی کا بیٹ امیرے لے اجنبی تو نہیں۔میں انور علی کے متعلق یہ طیمنان کر چکا ہوں کہ شموگہ کے قریب یک لڑ ائی میں زخمی ہو گیا تھا اور مرہٹوں نے اسے قیدی بنا کر زگنڈ بھیج دیا ہے۔اب چند دن

تک قیدیوں کے تبادلہ ہوگا۔ تو وہ انشا ءاللہ آپ کے پاس پہنچ جائے گا۔ فرحت دوسری کرسی سے چاندی کی صندوقچی اٹھا کر اٹھی اور بولی عالی جاہ میں انور علی کے متعلق پوچھنے کے لیے نہیں آئی۔ اس کے متعلق چتل ڈرگ کے قلعے دار کا خط میری تسلی کے لیے کافی تھا۔ میں ایک اور کام سے ائی ہوں، یہ لیجیے اس صندوقچی میں میرے چند زیورات کے علاوہ وہ ہیرے ہیں جواج سے بتیس سال قبل نواب سراج الدولہ نے اپنے وفادار سپاہی کی کدمت کے صلے میں دیئے تھے۔ یہ سپاہی میرے شوہر کا باپ تھا۔ جو پلاسی کی جنگ میں زخمی ہونے کے بعد جانکنی کی حالت میں مرشد آباد پہنچا تھا۔ موجودہ حالات میں جب آپ کو ایک ایک کوڑی کی ضرورت ہے۔ میں ان ہیروں کا اس سے بہتر مصرف نہیں سوچ سکتی۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ سرنگا پٹم آنے سے پہلے ہم چند ہیرے اپنے مصرف میں لا چکے تھے۔

سلطان نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن میں اپنی بیوہ بہن کا تحفہ قبول نہیں کر سکتا۔ میں جانتا ہوں کہ معظم علی کا خاندان میسور کے لیے کسی قربانی سے دریغ نہیں کرے گا۔ لیکن جس ضرورت کے لیے میں نے اپنی رعایا کی مالی اعانت قبول کی تھی وہ پوری ہو چکی ہے۔ انشاءاللہ کل تک دشمن کو تاوان کی پوری رقم ادا کر دی جائے گی۔ عالیجاہ مجھے مرتے دم تک افسوس رہے گا کہ میں نے ایک فرض سے کوتاہی کی ہے۔ میری بہن آپ کے دو بیٹے اور شوہر اس پرچم تلے شہید ہو چکے ہیں، اور میرے نزدیک ان کا خون روئے زمین کے تمام خزانوں سے زیادہ قیمتی ہے۔ فرحت نے بددل سی ہو کر چاندی کی صندوقچی دوبارہ زمین پر رکھ دی۔ اور مخمل کی تھیلی اٹھاتے ہوئے کہا۔ عالیجاہ پرسوں ہمارا ایک نوکر وفات پا گیا تھا۔ اس تھیلی میں اس کی عمر بھر کی کمائی ہے۔ مرتے وقت اس نے یہ میرے سپرد کی

تھی اور میں نے اس سے یہ وعدہ کیا تھا کہ میں خود آپ کی خدمت میں حاضر ہو کر اس کی طرف سے یہ نذرانہ پیش کروں گی۔ اس کا کوئی وارث نہیں۔ نہیں عالی جاہ۔ سلطان نے آگے بڑھ کر فرحت کے ہاتھ سے تھیلی پکڑ لی اور اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا۔ تھوڑی دیر پہلے میں یہ سوچ رہا تھا کہ میرا خزانہ خالی ہو چکا ہے لیکن اب میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس حالات میں بھی میں روئے زمین کا امیر ترین آدمی ہوں۔ آپ کے نوکر کا کیا نام تھا۔ دلاور خان، فرحت نے جواب دیا۔ تھوری دیر کے بعد فرحت اپنے گھر کا رخ کر رہی تھی۔

اتحادیوں نے متارکہ جنگ کے ابتدائی شرائط نامہ میں سلطان سے ان اضلاع کا مطالبہ کیا تھا۔ جو پیشوا اور نظام کی سلطنتوں اور کمپنی کے مقبوضات سے ملحق تھے۔ لیکن سلطان کے بیٹوں کو حراست میں لینے اور مطلوبہ رقم وصول کرنے کے بعد وہ اپنی اپنی خواہشات کے مطابق ان شرائط کی تاویلیں کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو بارہ محل، ڈنڈے گل کے اضلاع اور مالابار کے بیشتر علاقے انگریزوں کے حوالے کرنے کے لیے تیار تھا، لیکن کارنوالس گورک کے علاوہ بلاری، گوئی اور سلیم کے ان علاقہ جات پر بھی اپنا حق جتا رہا تھا، جو اتحادی مقبوضات کی کسی سرحد سے ملحق نہ تھے۔ انگریزوں کا مقصد مال غنیمت حاصل کرنے کے علاوہ مستقبل کے لیے سلطان کی دفاعی قوت کو زیادہ سے زیادہ مفلوج کرنا تھا۔ کورگ کا علاقہ مالابار کے ساحل اور سرنگاپٹم کے درمیان ایک اہم ترین حد فصیل کا کام دیتا تھا۔ اور یہاں فوجی اڈے قائم کرنے کے بعد انگریز سرنگاپٹم کے لیے ایک دائمی خطرہ بن سکتے تھے۔ کورگ کمپنی کے کسی علاقے سے ملحق نہ تھا، اور ابتدائی شرائط کے متعلق بحث وتمحیص کے دوران میں اس کا ذکر تک نہ آیا تھا۔ لیکن اب سلطان کے وکلاء کے اعتراضات کے

جواب میں لارڈ کارنوالس کے نمائندے بھیڑیئے کی روایتی منطق سے کام لے رہے تھے۔اب ان کے نزدیک ملحقہ علاقوں سے مراد صرف وہ علاقے نہ تھے جن کی سرحدیں اتحادیوں کے مقبوضات سے ملتی تھیں۔ بلکہ وہ علاقے تھے جن کی سرحدیں اتحادیوں کے مقبوضات سے زیادہ دور نہ تھیں۔سر جان کیناوے جسے لارڈ کارنوالس کی طرف سے معاہدے کی شرائط طے کرنے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔

اس غیر منصفانہ مطالبہ کے جواز میں دوسری دلیل یہ پیش کر رہا تھا کہ ایسٹ انڈیا کمپنی گورک کے متعلق اس کے سابق راجہ کے ساتھ ایک علیحدہ معاہدہ کر چکی ہے۔چند دن کی بے نتیجہ بحث وتمحیص کے بعد سلطان اور اتحادیوں کے درمیان مصالحت کی بات چیت ٹوٹ گئی، اور لارڈ کارنوالس نے سلطان پر دباؤ ڈالنے کے لیے دوبارہ سرنگاپٹم کا محاصرہ جاری رکھنے کا حکم دے دیا۔اتحادی افواج کی نقل وحرکت کے ساتھ ہی یہ خبر سرنگاپٹم میں سنی گئی کہ شہزادہ عبدالخالق اور معزالدین کو مدارس کی طرف روانہ کیا جا رہا ہے۔اور شہزادوں کے پاس جو دو سو سپاہی اور افسر بھیجے گئے تھے، انھیں غیر مسلح کرکے جنگی قیدیوں کے کیمپ میں بھیج دیا گیا ہے۔لارڈ کارنوالس کی یہ حرکت متارکہء جنگ کی شرائط کی صریح خلاف ورزی تھی۔اس نے سلطان ٹیپو کو اس امر کا یقین دلایا تھا کہ صلح کی بات چیت ٹوٹ جانے کی صورت میں شہزادون کو واپس بھیج دیا جائے گا اور تاوان کا ایک کروڑ ساٹھ لاکھ روپیہ بھی واپس کر دیا جائے گا۔لیکن اتحادیوں کی نیت بدل چکی تھی۔اور انھیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ شہزادوں کو قیدی بنا کر سلطان سے اپنا ہر مطالبہ منوا سکتے ہیں، چنانچہ دوبار جنگ شروع کرنے کے متعلق اپنی دھمکیوں کو زیادہ موثر بنانے کے لیے اتحادیوں نے دریائے کاویری کے آر پار لوٹ مار شروع کر دی۔ایبر وکرومبی کی کمان میں انگریزوں کی ایک فوج نے

کاروِیری کے جنوب میں کئی بستیاں تباہ کرڈالیں۔انگریزوں کی ایک اور فوج نے لال باغ کے خوبصورت چمن ویران کرنے کے بعد شہر گنجام کی گلیوں میں لوٹ مار شروع کردی۔نظام کے ایک لشکر نے گرم کنڈہ کے آس پاس حملے شروع کردیئے اور بھاؤ کی افواج نے کاروِیری کے شمال کی طرف تباہی مچادی۔ان حالات میں سلطان کے لیےلڑائی کے سوا کوئی چارہ نہ تھا، مارچ کے دوسرے ہفتے میں سلطان کے سپاہی دن رات قلعے کے دفاعی استحکامات مضبوط کرنے میں مصروف تھے، قلعے سے باہر جزیرے کے مختلف مقامات پر انگریز اپنی بھاری توپیں نصب کررہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی دونوں فریق یکساں طور پر اس بات کے لیے کوشاں تھے کہ کسی طرح یہ جنگ ٹل جائے، اتحادیوں کو اپنے سپاہیوں کی تعداد اور جنگی سامان کی برتری کے باوجود اس بات کا خدشہ تھا کہ اگر سلطان اپنی بات پر ڈٹ گیا تو وہ کسی صورت برسات سے پہلے سرنگا پٹم کا قلعہ فتح نہیں کرسکیں گے۔اور برسات کے موسم میں سرنگا پٹم سے باہر سلطان کی رہی سہی فوج کے لیے ان کے رسد اور کمک کے راستے کو کاٹنا مشکل نہ ہوگا۔فتح کے لیے انہیں لاتعداد قربانیاں دینی پڑیں گی۔اور شکست کی صورت میں انہیں عبرتناک تباہی کا سامنا کرنا پڑے گا، دوسری طرف سلطان ٹیپو یہ محسوس کررہا تھا کہ وہ تنہا ایک لامتناہی عرصے کے لے مرہٹوں، نظام اور انگریزوں کی لاتعداد فوج کے ساتھ جنگ جاری نہیں رکھ سکتا۔اس لیے دشمن کی بدعہدی اور اشتعال انگیزی کے باوجود اس کا رویہ انتہائی مصالحانہ تھا۔

پھر ایک دن اچانک بڈنور سے میر قمرالدین کی ایک ڈویژن فوج سامان رسد کی ایک بھاری مقدار کے ساتھ سرنگا پٹم پہنچ گئی ہے اور مار دھاڑ کرتی ہوئی قلعے کے اندر داخل ہوگئی۔میر قمرالدین خان کی آمد سے چند گھنٹے بعد اتحادی افواج کے رہنما

لارڈ کارنوالس کے خیمے میں جمع ہو کر ایک دوسرے کو یہ مشورہ دے رہے تھے کہ اب حالات بدل چکے ہیں اور اب ہمیں سنجیدگی کے ساتھ صلح کے متعلق سلطان کی پیش کش پر غور کرنا چاہیئے۔ چنانچہ ۱۸ مارچ کو لارڈ کارنوال کی دعوت پر سلطان کے وکیل اس کے کیمپ میں پہنچے اور کارنوالس نے ان کے ساتھ ایک طویل بحث کے بعد صلح کے شرائط نامے کا ایک نیا مسودہ تیار کر کے دے دیا۔ صلح کے معاہدے میں جو ترمیمیں تھیں وہ ہری پنت اور نظام کے سپہ سالار سکندر جاہ کے نزدیک تسلی بخش نہ تھیں۔ مرہٹہ سلطنت کی حدود دریائے کرشنا تک بڑھا دی گئی تھی، نظام کو کڑپہ۔ کانڈی کوٹ اور کمبم کے علاوہ دریائے کرشنا اور زیرین تنگ بھدرہ کے درمیان بعض اضلاع دے دیئے گئے تھے، سلطنت خداداد کی بندر بانٹ میں انگریزوں نے اپنے لیے سب سے بڑا تر نوالہ رکھا تھا۔ انہوں نے ڈنڈے گل اور مالا بار کا بیشتر ساحلی علاقہ اور کالی کٹ اور کنانور کی بندرگاہیں سلطان سے ہتھیالی تھیں۔ کورگ پر قبضہ جمانے کے متعلق بھی اپنا مطالبہ دہرایا تھا۔ چنانچہ متنازعہ فی علاقوں پر انہوں نے سلطان کا حق تسلیم کر لیا تھا۔ معاہدے کی شرائط کو اپنے لیے زیادہ سے زیادہ سودمند بنانے کے لیئے انگریز سلطان کے ساتھ جس بدعہدی اور فریب کاری کے مرتکب ہوئے تھے وہ ان کے سابقہ سیاسی کردار کے بالکل عین مطابق تھی۔ لیکن سلطان کی طرح اپنے حلیفوں کے ساتھ بھی انہوں نے کوئی نیک سلوک نہ کیا۔ اگر مرہٹے اور نظام چند علاقے حاصل کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے تو اس کی وجہ انگریزوں کی دوست نوازی نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ وہ کسی بھی وقت سلطان کے ساتھ صلح کر کے انگریزوں کے لیے خطرے کا باعث بن سکتے تھے۔ بلکہ ان دو بڑی طاقتوں کی غیر جانبداری بھی انگریزوں کے لیے تباہی کا سامان پیدا کر سکتی تھی، اس لیے کارڈ

نوالس ان کی طرف چند ہڈیاں پھینکنے پر مجبور تھا۔

لیکن ٹراونکور کا راجہ جس کی اعانت کے بہانے انگریزوں نے یہ جنگ شروع کی تھی، ایک کمزور اور بے بس حلیف کی حالت میں لارڈ کارنوالس کے لیے کسی پریشانی کا باعث نہیں بن سکتا تھا اس لیے اسے مال غنیمت کی تقسیم کے وقت صاف طور پر نظر انداز کر دیا گیا۔ اس نے پہلے انگریزوں کی شہہ پر سلطان کے ساتھ جنگ کی ابتدا کی اور شدید نقصانات اٹھائے تھے۔ اس کے بعد اس نے انگریزوں کی اعانت کے عوض انھیں پچیس لاکھ ادا کیا تھا، پھر جب سلطان کے ساتھ انگریزوں کی باقاعدہ جنگ شروع ہوئی تو اس نے اپنے تمام فوجی اور اقتصادی وسائل ان کی نذر کر دیئے لیکن جنگ سے فارغ ہونے کے بعد انگریزوں نے اپنے اس بیوقوف اور بے بس اور کمزور دوست کو مال غنیمت میں حصہ دار بنانے کی بجائے اس کے بعض علاقے چھین کر راجہ کوچین کے حوالے کر دیا

اس جنگ میں انگریز اور اس کے حریف اگرچہ سلطان کو پوری طرح مغلوب نہ کر سکے لیکن وہ میسور کے اقتصادی اور فوجی وسائل پر ایک کاری ضرب لگنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔ مالابار کے گرم مصالحے کی تجارت سلطان کی آمدنی کا ایک بہت بڑا ذریعہ تھا اور اب اس کا بیشتر علاقہ انگریزوں کے قبضے میں جا چکا تھا۔ بارہ محل اور کورگ پر قبضہ جمانے کے بعد انگریزوں کے لیے مشرق اور مغرب کی طرف سے میسور پر حملہ کرنا بہت آسان ہو گیا تھا۔ ڈانڈے گل اور دریائے کرشنا اور تنگ بھندرہ کے درمیان سلطان اپنے زرخیز ترین علاقے سے محروم ہو چکا تھا اپنے اعتبار سے یہ جنگ انگریزوں کے لیے ان کے ہندوستانی حریفوں کا راستہ صاف کر چکی تھی۔

بیسواں باب

مارچ کے آخر میں جنگی قیدیوں کا تبادلہ اور اتحادی افواج کا انخلا شروع ہو چکا تھا۔ محاصرے کے دوران میں مرہٹہ، نظام اور کمپنی کے عساکر کے کیمپوں میں طرح طرح کی بیماریاں پھیل چکی تھیں۔ اور ان کے لیے زخمیوں کے علاوہ سینکڑوں مریضوں کو نکالنے کا مسلہ پریشان کن بن چکا تھا۔ اس مرحلے پر سلطان نے انسانیت دوستی کا ایک اور ثبوت دیا۔ اور دشمن کے زخمی اور بیمار آدمیوں کے لیے ڈولی اور کہار بھیج دیئے تھے۔

ایک دن علی الصبح ہری پنت ایک کشادہ خیمے میں بیٹھا ہوا تھا۔ ایک پہرے دار اندر داخل ہوا اور اس نے کہا، مہاراج میسور کی فوج کا ایک افسر آپ کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتا ہے۔ اسے لے آؤ۔ پہرے دار باہر نکل گیا۔ تھوری دیر بعد سید غفار خیمے میں داخل ہوا اور اس نے آداب بجالانے کے بعد کہا جناب مجھے سلطان معظم نے بھیجا ہے۔ اور وہ آپ سے ملاقات کرنا چاہتے ہیں۔ اگر آپ کو کوئی اور مصروفیت نہ ہو تو وہ پورے دس بجے یہاں پہنچ جائیں گے۔

سلطان ٹیپو مجھے ملنے کے لیے آرہے ہیں۔ ہری پنت نے حیران سا ہو کر پوچھا۔ جی ہاں، انہیں یہ اطلاع ملی تھی کہ آپ کل جا رہے ہیں۔ ہری پنت نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ اس ملاقات کے لیے پہل میری طرف سے نہیں ہوئی۔ بہر حال میں ان کا شکر گزار ہوں آپ انہین اطلاع دیں کہ میں ان کی راہ دیکھ رہا ہوں۔ سید غفار سلام کر کے باہر نکل گیا۔ خیمے سے تھوڑی دور اس کے پانچ ساتھی گھوڑوں کی باگیں تھامے ہوئے کھڑے تھے۔ سید غفار نے ایک گھوڑے پر سوار ہو کر ایڑ لگا دی۔ اور اس کے ساتھیوں نے اس کی تقلید کی۔ تھوڑی

دیر کے بعد ہری پنت کے چیدہ چیدہ سپاہی اور سردار اس کے خیمے سے باہر صفیں مر تب کر رہے تھے۔ دس بجے سلطان ٹیپو اور اس کے سواروں کا ایک دستہ مرہٹہ فوج کے کیمپ میں داخل ہوا۔ سپاہیوں کی صفوں کے قریب پہنچ کر سلطان اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ مرہٹہ سپاہیوں نے اسے سلامی دی۔ پھر ہری پنت نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کیا اور وہ خوبصورت قالینوں پر سے گزرتا ہوا خیمے کے اندر داخل ہوا۔ عالی جاہ تشریف رکھیئے۔ ہری پنت نے ایک مرصع کرسی کی طرف اشارہ کر تے ہوئے کہا۔ مجھے افسوس ہے کہ میرا توپ خانہ یہاں سے کل روانہ ہو چکا ہے۔ اور میں آپ کو سلامی دینے کا انتظام نہیں کر سکا۔ سلطان نے کہا میں اپنی ذاتی حیثیت میں یہاں آیا ہوں اس لیے رسومات کی ضرورت نہیں۔ آپ تشریف رکھیئے میں آپ سے چند باتیں کرنا چاہتا ہوں۔ ہری پنت دوسری کرسی پر بیٹھ گیا۔ او رسلطان نے قدر توقف کے بعد کہا۔ اب ہماری جنگ ختم ہو چکی ہے اور میں اس کی تلخیوں کا ذکر کرنے میں کوئی فایدہ نہیں دیکھتا، لیکن میں یہ ضرور کہوں گا کہ اب آپ کو سرنگا پٹم کی طرف دیکھنے کی بجائے انگریزوں کے عزائم کے متعلق خبردار رہنا چاہئیے۔ میرا خاندان تقریباً تیس سال سے جنوبی ہند میں انگریزوں کی جارحیت کا سیلاب روکے ہوئے ہے۔ اور اس عرصے میں ہم نے اس سیلاب کی راہ میں جو دیواریں کھڑی کی تھیں وہ بہت حد تک منہدم ہو چکی ہیں، لیکن میں آپ کو اس حقیقت سے خبردار کرنا چاہتا ہوں۔ کہ جب سرنگا پٹم کی آزادی کے پرچم سرنگوں ہو جائیں گے تو آپ یا نظام الملک، پونا اور حیدر آباد کے راستے میں کوئی اور نا قابل تسخیر دیوار نہیں کھڑی کر سکیں گے، میں کارنوالس کی ان مجبوریوں سے واقف ہوں۔ جن کے باعث اس نے جنگ کو طول دینا مناسب نہیں سمجھا۔ لیکن مجھے اس کی نیت کے

بارے میں کوئی خوش فہمی نہیں، اسے نئی جنگ کے لیے تیاری کی ضرورت ہے۔ اور جب اس کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی، تو اسے دوبارہ جنگ شروع کرنے کے لیے کوئی بہانہ تلاش کرنے کی ضرورت نہیں ہو گی۔ اس وقت سرنگا پٹم کے معاہدے منگلور کے معاہدے زیادہ پائیدار ثابت نہیں ہوں گے، لیکن آپ کو اس بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے کہ انگریز دلی تک اپنے جھنڈے گاڑنا چاہتے ہیں اور سرنگا پٹم، پونا۔ حیدر آباد، اندور اور گوالیار وغیرہ ان کے راستے کی مختلف منزلیں ہیں، بنگال کی طرف سے انگریز لکھنو تک پہنچ چکے ہیں۔ اب یہ سوچنا آپ کا کام ہے کہ جنوب میں میسور کی رہی سہی قوت مدافعت کچلنے کے بعد انہیں اپنے راستے کی باقی منزلیں طے کرنے میں کتنی دیر لگے گی۔ کاش آپ مرہٹہ قوم کے اکابر کو میرا یہ پیغام پہنچا سکتے کہ ہم سب کی آزادی پورے ہندوستان کی آزادی کے ساتھ مشروط ہے۔ ہری پنت نے مغموم لہجے میں جواب دیا۔ مہاراج اب ہمیں انگریزوں کی نیت کے خلاف کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔ ہم نے اس جنگ میں ندامت کے سوا کچھ حاصل نہیں کیا۔ میں دوسروں کے متعلق کچھ نہیں کہہ سکتا، لیکن جہاں تک میرا تعلق ہے میں آپ سے یہ وعدہ کرتا ہوں کہ آپ آج کے بعد مجھے اپنا دشمن نہیں پائیں گے۔ کاش ہم لوگ مل کر آپ کے مشورے پر عمل کرتے۔ میں ان جنگوں کے متعلق ہمیشہ ایک سپاہی کے ذہن سے سوچنے کا عادی تھا۔ لیکن جب آپ کے کمسن بیٹے انگریزوں کے کیمپ میں لائے گئے تھے میں وہاں موجود تھا۔ اور مجھے پہلی بار اس بات کا احساس ہوا تھا کہ ہندوستان کا باشندہ ہونے کی حیثیت سے میرا بھی ان کے ساتھ کوئی رشتہ ہے۔ اس وقت انگریزوں کی مسکراہٹیں میرے لیے بے حد تکلیف دہ تھیں۔ سلطان نے کہا آپ کو میرے بیٹوں کے متعلق پریشان ہونے کی بجائے میسور کے ان

ہزاروں بیٹوں کے متعلق سوچنا چاہئیے تھا جو وطن کی آزادی کے لیے اپنا خون پیش کر چکے ہیں۔ آپ کو بنگال کے نواب سراج الدولہ۔ بنارس کے چیت سنگھ، روہیل کھنڈ کے حافظ رحمت خان اور اودھ کی ان بیگمات کے متعلق سوچنا چاہئیے تھا جنہوں نے انگریزوں کی بدعہدی اور مکاری کے اس سے زیادہ جان گداز مناظر دیکھے ہیں۔

تھوڑی دیر کے بعد ہری پنت کے ساتھ سلطان کی ملاقات ختم ہوئی اور ہری پنت نے خیمے سے نکل کر سلطان کو رخصت کیا۔ سلطان کے جاتے ہی مرہٹہ فوج کے بڑے بڑے سردار ہری پنت کے اردگرد جمع ہو گئے اور اس سے طرح طرح کے سوال کرنے لگے، ایک برہمن نے کہا۔ مہاراج دیکھ لیا میسور کا بادشاہ خود آپ کے پاس آیا تھا، اگر آپ چند دن اور لڑائی جاری رکھتے تو وہ پیدل چل کر آپ کے پاس آتا، ہری پنت نے برہم ہو کر کہا تم بیوقوف ہو، ہم سلطان ٹیپو کو شکست دے سکتے ہیں، اس کی سلطنت پر قبضہ کر سکتے ہیں، لیکن اس کی عظمت کو نہیں چھین سکتے۔ جنگ ختم ہوئے پانچ مہینے ہو چکے تھے، سلطان صلح کے معاہدے کے فوراً بعد تمام جنگی قیدیوں کو رہا کر چکا تھا۔ لیکن پرس رام بھاؤ جس نے سرنگا پٹم سے واپسی پر اپنے راستے کی کئی بستیوں کو تباہ و برباد کر دیا تھا، ابھی تک میسور کے ان قیدیون کو واپس کرنے میں لیت ولعل سے کام لے رہا تھا جو سرنگا پٹم کے محاصرے سے قبل نرگند بھیجے جا چکے تھے، ہری پنت نے پونا پہنچ کر متعدد بار پرس رام بھاؤ کی سینہ زوری کے خلاف احتجاج کیا، لیکن اس کو نانا فرنویس کی تائید حاصل تھی اور پیشوا کے دربار میں ہری پنت کی چیخ و پکار بے نتیجہ ثابت ہوئی، لیکن ماہ اگست کے آخر میں سندھیا، جو پیشوا کے بعد مرہٹوں پر سب سے زیادہ اثر و رسوخ کا مالک تھا۔ پونا پہنچا۔ اور اس کی کوششوں سے پونا کی حکومت کے طرز عمل میں نمایاں تبدیلی رونما ہونے لگی۔ جنگ

کے بعد فرحت پر اپنے بیٹے کی جدائی کے اثرات مرتب ہو رہے تھے۔ مسلسل بے خوابی اور بے چینی کے باعث اس کی صحت آئے دن بگڑتی جا رہی تھی۔ پھر جب چند دن بعد شہر میں یہ افواہ پھیل گئی کہ پرس رام نے جنگی قیدیوں کو قتل کر دیا ہے۔ تو فرحت کی رہی سہی ہمت بھی جواب دے گئی، ایک دن وہ شدید بخار کی حالت میں پڑی ہوئی تھی اور منیرہ اور مراد علی اس کے پاس بیٹھے ہوئے تھے منور خان کمرے میں داخل ہو ااور اس نے منیرہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ بی بی جی ایک آدمی آپ سے ملنا چاہتا ہے۔ کون ہے وہ، منیرہ نے پریشان ہو کر پوچھا۔ بی بی جی وہ آپ کے ملک کا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ لیکن میں نے اسے اس سے پہلے کبھی نہیں دیکھا، ایک فرانسیسی افسر اس کے ساتھ آیا تھا، اور اسے دیوان خانے میں بٹھا کر واپس چلا گیا ہے۔ وہ کوئی بڑا آدمی معلوم ہوتا ہے۔ فرنسیسی افسر نے جاتے وقت اسے بڑے ادب سے سلام کیا تھا۔ وہ کون ہو سکتا ہے منیرہ نے پریشانی اور تذبذب کی حالت میں مراد علی کی جانب دیکھتے ہوئے کہا، میں دیکھتا ہوں اور مراد علی یہ کہتا ہوا اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا، تھوڑی دیر بعد وہ واپس آیا اور منیرہ کی طرف دیکھتا ہوا بولا۔ بہن اس کا نام جولین ہے۔ منیرہ نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ بیٹی تم ڈر کیوں گئی، جولین کون ہے۔ فرحت نے نحیف آواز میں پوچھا، امی جان وہ لیگر انڈ کا بھائی ہے، فرحت نے مراد علی سے مخاطب ہوتے ہوئے کہا۔ بیٹا جاؤ اور اسے اندر لے آؤ۔ اور نچلی منزل کے کمرے میں بٹھا دو نہیں امی جان میں وہیں جاتی ہوں، بھائی جان آپ امی جان کے پاس رہیں، منیرہ یہ کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ دیوان خانے کے ایک کمرے میں جولین کے سامنے کھڑی تھی۔ اور جولین شکایت کے لہجے میں کہہ رہا تھا کہ جین مجھے سرنگا پٹم پہنچنے سے پہلے لیگر انڈ کی

موت کے متعلق کوئی علم نہ تھا، کاش تم نے ہمیں اطلاع دی ہوتی۔منیرہ بہت مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کر رہی تھی۔جولین نے اسے بازوؤں سے پکڑ کر ایک کرسی پر بٹھا دیا۔اور کہا، اب تمہارا یہاں رہنا ٹھیک نہیں، تم جلد از جلد سفر کی تیاری کرو۔نہیں جولین میں ابھی سرنگاپٹم نہیں چھوڑ سکتی۔جولین بددل سا ہو کر اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھ گیا، اور کچھ دیر سر جھکا کر سوچنے کے بعد کہنے لگا، میں یہاں پہنچتے ہی جن فرانسیسی افسروں سے ملا ہوں، انھوں نے مجھے بتایا ہے کہ یہ لوگ بہت رحم دل ہیں اور تمہارے ساتھ ان کا سلوک بھی بہت اچھا ہے، لیکن تم ان کے ساتھ ساری زندگی جلاوطنی کی زندگی نہیں بسر کر سکتیں، میں جانتا ہوں کہ تمہارے دل پر اب تک پیرس کے المناک حادثات کی یاد تازہ ہے، لیکن اب فرانس کے حالات بدل چکے ہیں، وہ بھیانک رات جس کی تاریکیوں سے تم پناہ لینے کے لیے نکلی تھیں اب گزر چکی ہے اب تمہیں اپنے وطن میں ایک نئی روشنی دکھائی دے گی، منیرہ نے کہا۔میرے لیے موجودہ حالات میں کوئی فیصلہ کرنا ممکن نہیں، مجھے سوچنے کے لیے وقت کی ضرورت ہے، جولین نے کہا میں نے یہ نہیں کہا کہ ہم آج ہی واپس جا رہے ہیں، میری چھٹی کے ابھی تین مہینے باقی ہیں، اور میں چند ہفتے یہاں گزار سکتا ہوں، تمہیں سوچنے کے لیے کافی وقت مل جائے گا۔منیرہ نے کہا اس گھر کی معزز خاتون مجھے اپنی بیٹی سمجھتی ہے، وہ ان دنوں سخت بیمار ہے، اور اس کا ایک بیٹا ابھی تک مرہٹوں کی قید میں ہے۔ ان حالات میں میں اگر فرانس جانے کا ارادہ کروں تو بھی میرے لیے سرنگاپٹم کو چھوڑنا بہت مشکل ہوگا، ممکن ہے کہ چند دن تک حالات بدل جائیں، ان کی صحت ٹھیک ہو جائے۔اور ان کا بیٹا گھر واپس آجائے، اور پھر میں یہاں رہنے کے متعلق اپنا ارادہ بھی بدل دوں۔لیکن جب تک مجھے یہ اطمینان نہیں ہوتا کہ یہاں اب میری

ضرورت باقی نہیں رہی، میں اپنے وطن جانا پسند نہیں کروں گی، میں ان لوگوں کے احسانات نہیں بھول سکتی۔ انھوں نے ہمیں اس وقت سہارا دیا تھا جب خدا کی سر زمین ہمارے لیے تنگ ہو چکی تھی، میں نے اس گھر میں اس وقت قدم رکھا تھا جب اس کا ہر گوشہ مسرت کے قہقہوں سے آباد تھا اور اس کے در و دیوار پر تاریک سائے دیکھ کر میں یہاں سے بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گی۔ جولین کچھ دیر سر جھکا کر سوچتا رہا۔ بالآخر اس نے منیرہ کے چہرے پر نظریں گاڑتے ہوئے کہا، میں ان لوگون کے متعلق کیپٹن فرانسسک سے بہت کچھ سن چکا تھا اور یہان پہنچتے ہی میں اپنے جن ہم وطنوں سے ملا ہوں، انھوں نے بھی میری معلومات میں کافی اضافہ کیا ہے، جین سچ بتاؤ کیا تمہارے یہاں ٹھہرنے کی وجہ صرف یہی ہے کہ تم اپنے دل پر ان لوگوں کے احسانات کا بوجھ محسوس کرتی ہو، کیا یہ وجہ کافی نہیں، نہیں میں مانتا ہوں کہ یہ لوگ بہت اچھے ہیں اور انہوں نے تم پر بہت احسان کیے ہوں گے، لیکن تمارے ساری عمر یہان ٹھہرنے کی وجہ یہ کافی نہیں۔ جین برا نہ ماننا۔ فرنسیسی کیمپ سے میں اس نوجوان کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں، جو ان دنون مرہٹون کی قید میں ہے۔ ایک ثانیہ کے لیے منیرہ کی آنکھون کے سامنے انور علی کی تصویر آ گئی۔ اس نے ایک جھرجھری لی اور کہنے لگی کہ میں آپ کا مطلب نہیں سمجھی۔ آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔ کچھ نہیں جین میں صرف یہ دعا کرتا ہوں کہ تم نے اس سے کوئی غلط توقع نہ وابستہ کی ہو، ایک فرانسیسی نے یہ خیال ظاہر کیا تھا کہ شاید تم ــــــــــــــ جولین نے اپنا فقرہ پورا کرنے کی بجائے منیرہ کے چہرے پر نظریں گاڑ دیں، منیرہ جلدی سے اٹھی لیکن دروازے کی طرف چند قدم اٹھانے کے بعد رک گئی۔ جولین نے کہا جین جین ٹھہرو میں نے ابھی اپنی بات ختم نہیں کی تم اس سے محبت کرتی ہو، تم اس نوجوان

سے محبت کرتی ہو، جس کی دنیا تمہاری دنیا سے مختلف ہے، منیرہ چند ثانیے دم بخود کھڑی رہی، اس کی نگاہوں کے سامنے اچانک ایک ایسی حقیقت کے چہرے کا نقاب اٹھ چکا تھا، جو بیک وقت دلکش بھی تھی اور بھیانک بھی، اور ایک ایسے طوفان کے بند ٹوٹ چکے تھے جسے وہ ایک مدت سے اپنے سینے کی گہرائیوں میں دبائے ہوئے تھی، اس نے مڑ کر جولین کی طرف دیکھا اور کانپتی ہوئی آواز میں کہا، ہاں جولین میں اس سے محبت کرتی ہوں، لیکن میں نے اس سے کوئی توقع وابستہ نہیں کی، جولین نے قدرے نرم ہو کر کہا، نادان لڑکی بیٹھ جاؤ، تم اپنے سوا اور کسی کو دھوکہ نہیں دے سکتی۔ منیرہ نڈھال سی ہو کر بیٹھ گئی۔ اور اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا کر ایک بچے کی طرح سسکیاں لینے لگی۔ جولین نے کہا مجھے یقین ہے کہ وہ اپنے متعلق تمہارے احساسات سے بے خبر نہیں ہوگا، منیرہ نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں روکتے ہوئے جواب دیا، اسے میرے متعلق کچھ معلوم نہیں، اور میں کبھی یہ گوارا نہیں کروں گی کہ اسے میرے احساسات کا علم ہو، اور اس کے باوجود تم یہاں رہنا چاہتی ہو، ہاں، منیرہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا، فرض کرو کہ وہ اگر میری موجودگی میں یہاں پہنچ جائے اور پھر تمہیں یہ معلوم ہو جائے کہ اس کی دنیا میں تمہارے لیے کوئی اور جگہ نہیں، تو تم اس صورت میں بھی میرے ساتھ جانا پسند نہیں کرو گی؟ مجھے معلوم نہیں۔ فرانسسک نے مجھے بتایا تھا کہ اس سے تمہاری ملاقات پانڈی چری میں ہوئی تھی، ہاں، اور پھر تم نے وہاں سے اس کے ساتھ سرنگا پٹم تک کا سفر کیا تھا۔ منیرہ نے کانپتی ہوئی آواز میں کہا، خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجئے، اس کے ساتھ سفر کے دوران میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ وہ کسی دن میری توجہ کا مرکز بن جائے گا۔ ہو سکتا ہے کہ اس وقت تمہیں اپنے احساسات کا صحیح علم نہ ہو اور یہ تلخ حقیقت تم نے

لیگر انڈ کی بیوی بننے کے بعد محسوس کی ہو۔ کہ تمہاری زندگی میں کوئی خلا باقی رہ گیا ہے، منیرہ نے کرب آنگیز لہجے میں کہا۔ آپ جی بھر کر مجھے کوس سکتے ہیں، لیکن میں آپ کو یہ کہنے کی اجازت نہیں دوں گی کہ مجھے اپنے شوہر سے محبت نہیں تھی، جولین نے کہا، جین میرا مقصد تمہاری توہین کرنا نہیں تھا، میری نگاہوں میں تم ایک فرشتہ ہو، لیکن میں تمہیں یہ بتانا چاہتا ہوں کہ محبت میں اور رحم میں بہت فرق ہے۔ تمہیں ایک سے محبت تھی اور دوسرے پر رحم آتا تھا، پھر تمہارا رحم تمہاری محبت پر غالب آ گیا، اور تم نے لیگر انڈ سے شادی کر لی۔ منیرہ نے کہا یہ بات شاید آپ کی سمجھ میں نہ آسکے۔ لیکن خدا گواہ ہے کہ میں ایک بے وفا بیوی نہیں تھی، تمہیں یہ کہنے کی ضرورت نہیں جین، میں جانتا ہون کہ تمہارے جیسی رحم دل لڑکی بے وفا نہیں ہوسکتی۔ اور یہ تمام باتیں میں نے تمہارا دل دکھانے کے لیے نہیں کیں، میرے لیے یہ جاننا ضروری تھا کہ یہاں رہنے کے متعلق تمہارے اصرار کی اصل وجہ کیا ہے اور اب میں مطمئن ہوں، اب اگر تم چاہو بھی تو میں تمہیں اپنے ساتھ لے جانا پسند نہیں کروں گا، لیگر انڈ کی روح کے لیے بھی اس سے بڑا اطیمنان اور کیا ہوسکتا ہے، کہ اس کے بعد تم اس دنیا میں تنہا نہیں ہو، ایک افسر نے میرے ساتھ گفتگو کے دوران یہ امید ظاہر کی تھی کہ اب مرہٹے جنگی قیدیوں کو رہا کرنے پر آمادہ ہو جائیں گے، خدا کرے کہ وہ میری موجودگی میں یہاں پہنچ جائے، اور میں تمہاری تمام الجھنیں دور کر سکوں۔ ورنہ میں اپنے حصے کا کام کسی اور کے سپرد کر جاوٴں گا، اب مجھے اجازت دو۔ آپ کہاں جا رہے ہیں، میں فرانسیسی کیمپ میں قیام کروں گا، آپ یہاں کیوں نہیں ٹھہرتے، نہیں میرا وہاں ٹھہرنا مناسب ہے، وہاں مجھے لوگوں کے ساتھ ملنے جلنے کی آزادی ہو گی، ایک فرانسیسی میرا بچپن کا دوست نکل آیا ہے اور اس نے میرے لیے میسور میں

شکار کا بندوبست کرنے کا وعدہ کیا ہے، لیکن میں اپنے قیام کے دوران میں برابر تم سے ملتا رہوں گا، منیرہ نے کہا میں نے ابھی تک آپ کی بیوی کے متعلق آپ سے کچھ نہیں پوچھا۔ وہ کیسی ہے۔ وہ بالکل ٹھیک ہے اور اب دو بچیوں کی ماں بن چکی ہے، آپ اب تک مرشیس میں ہیں، ہاں لیکن میرا خیال ہے کہ میری رخصت ختم ہونے پر مجھے فرانس بلا لیا جائے گا۔ آپ کا عہدہ کیا ہے، میں کرنل بن چکا ہوں، جولین یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا، لیکن منیرہ نے کہا، ٹھہریئے میں مراد علی کو بھیجتی ہوں، وہ آپ کو کیمپ تک پہنچا آئے گا، نہیں نہیں اسے تکلیف دینے کی ضرورت نہیں مجھے راستہ معلوم ہے، منیرہ جولین کے ساتھ کمرے سے باہر نکلی۔ اور ڈیوڑھی کے دروازے کے قریب اسے رخصت کرنے کے بعد رہائیشی مکان کی طرف چل پڑی



تھوڑی دیر کے بعد وہ فرحت کے کمرے میں داخل ہوئی۔ فرحت نے اس کے پاؤں کی آہٹیں سن کر آنکھیں کھولیں۔ اور نیرہ کچھ کہے بغیر اسکے بستر کے قریب کرسی پر بیٹھ گئی، فرحت نے کہا کیا بات ہے بیٹی تم بہت پریشان معلوم ہوتی ہو، لیگرانڈ کا بہنوئی کوئی بری خبر لے کر تو نہیں آیا، منیرہ نے مسکرانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا، نہیں امی جان وہ کوئی بری خبر لے کر نہیں آیا، فرحت مراد علی کی طرف متوجہ ہوئی، بیٹا تم جا کر مہمان کے پاس بیٹھو، منیرہ نے کہا امی جان وہ چلا گیا ہے، وہ کہتا ہے کہ میں فرانسیسی کیمپ میں رہوں گا، وہاں پر اس کا کوئی دوست ہے، بیٹی وہ تمہارا مہمان تھا اور تمہیں اسے یہاں ٹھہرانا چاہیئے تھا، امی جان وہ اپنے کسی دوست کے پاس ٹھہرنے کا وعدہ کر چکا تھا اور میں نے آپ کی علالت کے پیش نظر یہاں ٹھہرنے پر اصرار نہیں کیا، فرحت نے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا، بیٹا تم جا کر اپنے بھائی کا

پتہ کرو شاید فوج کے دفتر میں کوئی اطلاع آئی ہو، بہت اچھا امی جان ۔ مراد علی یہ کہہ کر اٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔ فرحت قدرے توقف کے بعد منیرہ سے مخاطب ہوئی۔ بیٹی سچ کہو، لیگرانڈ کا بہنوئی تمہاری کسی بات سے خفا ہو کر تو نہیں چلا گیا؟ نہیں امی جان اس نے وعدہ کیا ہے کہ وہ یہاں قیام کے دوران میں میرے پاس آتا رہے گا۔ فرحت نے کہا بیٹی مجھے ڈر ہے کہ وہ تمہیں اپنے ساتھ چلنے کے لیے کہے گا، امی جان میں اس کے ساتھ جانے سے انکار کر چکی ہوں۔ ایک ثانیے کے لیے فرحت کے نحیف اور لاغر چہرے پر تازگی آ گئی ۔ اور اس نے کہا کہ بیٹی ابھی تھوڑی دیر پہلے جب تم نیچے گئی تھیں تو میں یہ سوچ رہی تھی کہ میرے دل میں کتنی باتیں ہیں جو ابھی تک میں نے تم سے نہیں کیں، میرا ایک بیٹا مسعود علی اننت پور کے قلعے کی حفاظت کرتا ہوا شہید ہو گیا تھا اور اس کا بڑا بھائی صدیق علی ان جنگی قیدیوں کے ساتھ تھا جنہیں انگریزوں نے اس قلعے کی فصیل کے ساتھ کھڑا کر کے گولیوں کا نشانہ بنایا تھا، صدیق علی کی شہادت کا انتہائی دردناک پہلو یہ تھا کہ ایک جوان اور حسین لڑکی اسے بچانے کے لیے انگریز سپاہیوں کی بندوقوں کے سامنے آ گئی تھی اور اس نے گولی کھانے کے بعد میرے بیٹے کی لاش سے لپٹ کر جان دے دی تھی ۔ ان کی لاشیں اننت پور کے قلعے کے پاس ایک ہی گڑھے میں دفن ہیں، مجھے انتہایہ جستجو کے باوجود ان سوالات کا تسلی بخش جواب نہ مل سکا ۔ کہ وہ لڑکی کون تھی کہاں سے آئی تھی اور وہ ایک دوسرے کو کب سے جانتے تھے؟ اس کی خیالی تصویریں میری نگاہوں کے سامنے رہا کرتی تھیں ۔ میرے دل میں اس کے لیے وہی محبت تھی، جو ایک ماں کے دل میں اپنی بیٹی کے لیے ہو سکتی ہے، میں تصور میں اس کے ساتھ باتیں کیا کرتی تھی۔ اس کے بال سنوارا کرتی تھی ۔ پھر جب تم ہمارے گھر آئیں ۔ تو میں یہ محسوس کرتی

تھی کہ قدرت نے میری بے بسی پر رحم کھا کر مجھے ایک جیتی جاگتی بیٹی عطا کردی ہے، اور میں اس لڑکی کے حصے کی تمام شفقت اور محبت تمہیں دینا چاہتی تھی۔فرحت یہاں تک کہہ کر رک گئی اور کچھ دیر تک منیرہ کی طرف دیکھنے کے بعد بولی، مجھے اپنے خیالات کے اظہار کے لیے الفاظ نہیں مل رہے۔ مجھے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ میرا وقت قریب آچکا ہے،اور شاید قدرت مجھے اپنی زندگی کا اہم فریضہ پورا کرنے کی اجازت نہ دے، مجھے آج تک یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ انور علی کے متعلق تمہارے خیالات کیا ہیں۔لیکن میں تم سے یہ وعدہ لینا چاہتی ہوں، کہ اگر میں مرجاؤں تو تم اس کا انتظار کیے بغیر یہاں سے نہیں جاؤ گی، میرے بعد اس گھر کو تمہاری ضرورت رہے گی، منیرہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا، امی جان اگر اس گھر میں میری ضرورت نہ بھی ہو تو بھی میں خوشی کے ساتھ اسے چھوڑنا پسند نہیں کروں گی، بیٹی میں یہ چاہتی ہوں کہ تم انور علی کے ساتھ شادی کرلو،منیرہ نے کچھ کہنے کی بجائے اپنا سر جھکا لیا فرحت بستر سے اٹھ کر بیٹھ گئی اور اس نے اپنے ہاتھ پھیلاتے ہوئے کہا۔منیرہ یہاں آؤ،منیرہ آگے بڑھی اور فرحت نے اسے اپنے سینے سے لگالیا، وہ دیر تک اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتی رہی،منیرہ بڑی مشکلوں سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کررہی تھی، خادمہ نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔بی بی جی آپ کے لیے دودھ لے آؤں، نہیں ابھی مجھے بھوک نہیں،تم قلم دوات اور کاغذ لے آؤ، میں کچھ لکھنا چاہتی ہوں، خادمہ واپس چلی گئی اور کچھ دیر بعد اس نے لکھنے کا سامان لاکر فرحت کے قریب ایک تپائی پر رکھ دیا۔آپ کیا لکھنا چاہتی ہیں امی جان منیرہ نے پوچھا، میں ایک ضروری خط لکھنا چاہتی ہوں، آپ کو تکلیف ہوگی، مجھے لکھوا دیجیے یا تھوڑی دیر مراد علی کا انتظار کرلیجیے۔نہیں میں خود لکھوں گی،منیرہ اٹھ کر کرسی پر بیٹھ گئی

اورفرحت خط لکھنے میں مصروف ہوگئی، اس نے چند سطور لکھنے کے بعد ایک کاغذ پھاڑ کر پھینک دیا اور دوسرے کاغذ پر لکھنے میں مصروف ہوگئی تقریبا ایک گھنٹے کے بعد اس نے لکھا ہوا کاغذ تہہ کیا اور منیرہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا، بیٹی اگر انور علی میرے بعد گھر آئے تو اسے یہ خط دے دینا منیرہ نے کہا خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجئے، مجھے یقین ہے کہ جب وہ آئیں گے تو آپ ان کے استقبال کے لے نیچے کھڑی ہوں گی فرحت نے بستر پر لیٹتے ہوئے جواب دیا، بیٹی میری عمر کے انسان کو ہروقت اس دنیا دے کوچ کے لیے تیار رہنا چاہیئے ۔



اگلے دن فرحت کی حالت زیادہ تشویشناک ہوگئی۔اوروہ دو چار روز موت و حیات کی کشمکش میں مبتلا رہی، پانچویں روز آدھی رات کے وقت مراد علی اس کے قریب بیٹھا ہوا تھا۔اور خادمہ جس نے کئی دن بے آرامی کی حالت یں گزارے تھے، فرحت کے بستر کی دوسرطرف قالین پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی، فرحت نے مراد علی کی طرف دیکھتے ہوئے نحیف آواز میں کہا، بیٹا جاؤتم آرام کرو، میری فکر نہ کرو میں اب بالکل ٹھیک ہوں، مراد علی نے جواب دیا امی جان میں نے دن کے وقت کافی سو لیا تھا نہیں بیٹا جاؤ تمہاری آنکھیں نیند سے سرخ ہو رہی ہیں،، منیرہ آنکھیں ملتی ہوئی کمرے میں داخل ہوئی، اوراس نے کہا، بھائی جان آپ جا کر آرام کریں میں امی جان کے پاس بیٹھتی ہوں مراد علی نے کہا بہن آپ کو چند گھنٹے آرام کرنا چاہیئے تھا۔ میری نیند پوری ہو چکی ہے۔منیرہ نے مراد علی کے قریب دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔فرحت نے کہا جاؤ بیٹا اب آرام کرو، میری فکر نہ کرو۔مراد علی ماں کے پاس بیٹھنے پر بضد تھا، لیکن فرحت اور منیرہ کے اصرار پر وہ اٹھا اور بادل نخواستہ دروازے کی

طرف بڑھا۔ دو تین قدم اٹھانے کے بعد اس نے منیرہ کی طرف دیکھتے ہوئے کہا، بہن ایک گھنٹے کے بعد آپ امی جان کو دوائی کھلا دئیں۔ اور اگر ضرورت پڑے تو مجھے آواز دے دیجیئے گا، بیٹا تم جا کر آرام سے سوؤ۔ اگر ضرورت پڑی تو میں خود بلا لوں گی۔ بہت اچھا امی جان مراد یہ کہہ کر کمرے سے نکل گیا، پچھلے پہر مراد علی اپنے کمرے میں گہری نیند سو رہا تھا، خادمہ چیختی چلاتی اس کے کمرے میں داخل ہوئی۔ مراد علی نے ہڑبڑا کر آنکھیں کھولیں، اور ایک ثانیے کے لیے سکتے کی حالت میں خادمہ کی طرف دیکھتا رہا۔ مراد مراد خادمہ نے بڑی مشکل سے اپنی چیخیں روکتے ہوئے کہا بی جی فوت ہوگئی ہیں۔ مراد علی بستر سے اٹھا اور بھاگتا ہوا برابر کے کمرے میں داخل ہوا، فرحت کے پرسکون چہرے سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سو رہی ہے، منیرہ کرسی پر بے حس و حرکت بیٹھی اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔ امی جان امی جان۔ مراد علی فرحت کی نبض پر ہاتھ رکھ کر کرب ناک آواز میں چلایا، پھر اس نے منیرہ کا بازو پکڑ کر اسے جھنجھوڑ کر ہلایا، منیرہ نے ایک ہچکی لی اور اپنی نگاہیں مرد علی کے چہرے پر مرکوز کر دیں۔، آن کی آن میں اس کی خوبصورت نیلی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہوگئیں، اس نے مڑ کر فرحت کی طرف دیکھا اور سسکیاں لیتی ہوئی اس کی لاش سے لپٹ گئی۔ مراد علی کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا، اور پھر خادمہ کی طرف جواب بے حس و حرکت کھڑی تھی، متوجہ ہوا، کاش تم نے مجھے پہلے جگا دیا ہوتا۔ خادمہ نے بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا، جی میں سو رہی تھی، جب منیرہ کی چیخ سن کر میں بیدار ہوئی تو بی بی جی کا دم نکل چکا تھا۔ منیرہ نے گردن اٹھا کر دوبارہ مراد علی کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ بھائی جان آخری وقت تک انہوں نے مجھے اس بات کا احساس نہیں ہونے دیا، کہ ان کا وقت قر

یب آچکا ہے، میں یہ سمجھتی رہی کہ ان کی حالت بہتر ہو رہی ہے،، انہوں نے میرے ساتھ باتیں کرتے کرتے اچانک آنکھیں بند کرلیں، اور مجھے یہ محسوس ہوتا تھا کہ انہیں نیند آگئی ہے۔



فرحت کی وفات سے تین ہفتے کے بعد ایک دن منیرہ پڑوس کی چند عورتوں کے ساتھ اپنے کمرے میں بیٹھی ہوئی تھی کہ خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا بی بی جی آپ کو مراد علی صاحب بلاتے ہیں، کہاں ہیں وہ منیرہ نے اٹھ کر سوال کیا،، جی وہ برآمدے میں کھڑے ہیں منیرہ تیزی سے قدم اٹھاتی ہوئی برآمدے کی طرف مڑی، مراد سپاہیانہ لباس پہنے ہوئے تھا منیرہ نے سوال کیا،، آپ اتنی جلدی کیسے واپس آگئے، کہیے ان کے متعلق کچھ پتا چلا، مراد علی نے جواب دیا، فوجدار نے اس خبر کی تصدیق کی ہے کہ مرہٹوں نے نرگند اور دوسرے تمام مقامات سے قیدی رہا کردئے ہیں، آج صبح فوج کے چند افسر راستے میں ان کا استقبال کرنے کے لیے روانہ ہو چکے ہیں، میں نے بھی ساتھ جانے کی اجازت مانگی تھی لیکن مجھے ایک اور ذمہ داری سونپ دی گئی ہے، کیسی ذمہ داری، سلطان معظم تاوان کی دوسری قسط سے انگریزوں کے حصے کا روپیہ دے کر ہمیں مدارس بھیج رہے ہیں، آپ کب جا رہے ہیں منیرہ نے سوال کیا، ہمیں ایک گھنٹے کے اندر اندر یہاں سے کوچ کا حکم مل چکا ہے، میں آپ کے متعلق بہت پریشان ہوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ میری واپسی تک بھائی جان یہاں پہنچ جائیں گے، میں مدارس جانے پر خوش نہ تھا لیکن جب مجھے علم ہوا کہ سلطان معظم نے اس ذمہ داری کے لیے فوج کے بڑے بڑے افسروں کے مقابلے میں میرا نام پسند فرمایا ہے تو مجھ سے انکار نہ ہو سکا۔ میں نے جولین کا پتہ کیا

ہے وہ ابھی تک شکار سے واپس نہیں آیا، شاید دو تین دن تک یہاں پہنچ جائے۔ منیرہ نے کہا، آپ کو یقین ہے کہ انور علی رہا ہونے والے قیدیوں کے ساتھ یہاں آئیں گے۔ مراد علی نے جواب دیا ابھی تک رہا ہونے والے قیدیوں کی فہرست یہاں نہیں پہنچی۔ لیکن یہ بات بہر حال یقینی ہے کہ مرہٹوں نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا، اور بھائی جان ان کے ساتھ ہیں۔ سر دست ہمارے پاس دعاؤں کے سوا کچھ نہیں۔ اب مجھے اجازت دیجیے آپ اگر تنہائی محسوس کریں تو پڑوس کی کسی عورت کو اپنے پاس بلا لیں، خدا حافظ۔ منیرہ نے ڈوبتی ہوئی آواز میں خدا حافظ کہا۔ اور مراد علی تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا، اگلے روز دوپہر کے وقت آسمان پر بادل چھا رہے تھے جب منور خان منیرہ کے کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا کہ موسیو جولین آپ سے ملنا چاہتا ہے، انھیں یہاں لے آؤ، منور بھاگتا ہوا باہر نکل گیا، اور چند منٹ کے بعد جولین کمرے میں داخل ہوا۔ اس نے منیرہ کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا، جینن میں آج ہی واپس آیا ہوں، اور یہاں پہنچتے ہی مجھے مراد علی کی ماں کی موت کی خبر ملی ہے، مجھے افسوس ہے، اس دنیا میں ایسے بہت کم لوگ ملتے ہیں۔ جو دوسروں کے دکھ درد کو اپنا دکھ سمجھتے ہیں، کیمپ میں یہ خبر مشہور ہے کہ مرہٹوں نے تمام قیدیوں کو رہا کر دیا ہے، لیکن انور علی کے متعلق مجھے کوئی تسلی بخش معلومات حاصل نہیں ہو سکیں، جینن میں پورے خلوص کے ساتھ یہ دعا کرتا ہوں کہ وہ واپس آ جائے۔ لیکن موجودہ حالات میں تمہیں اچھی یا بری ہر طرح کی خبر کے لیے تیار رہنا چاہیے، میں مرہٹوں کی وحشت اور بربریت کے متعلق بہت کچھ سن چکا ہوں، فرض کرو اگر انور علی کے متعلق کوئی اچھی خبر نہ آئی تو سرنگا پٹم میں تمہارا مستقبل کیا ہو گا، منیرہ نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا، خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کیجیے، جولین نے شفقت آمیز لہجے میں

کہا، میں تمہارا دشمن نہیں ہوں، جین میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ تم حقیقت پسندی کا ثبوت دو، انور علی کے بغیر یہ ملک تمہارے لیے سپنوں کی جنت نہیں ہو گا، میں تمہارے ساتھ یہ وعدہ کرتا ہوں کہ میں اس وقت تک نہیں جاؤں گا، جب تک مجھے اس کے متعلق پوری طرح تسلی نہیں ہو جاتی، رہا ہونے والے قیدی چند دن تک یہاں پہنچ جائیں گے، اور اگر ضرورت پڑی تو میں مزید رخصت کے لیے درخواست بھیج دوں گا۔لیکن یہ نہیں ہوسکتا کہ میں ان حالات میں تمہیں یہاں چھوڑ جاؤں، منیرہ نے کہا، جولین میں ناشکر گزار نہیں ہوں،، میں جانتی ہوں کہ تم میری بہتری کے لیے یہ باتیں کہہ رہے ہولیکن میں بے بس ہوں، اس گھر کے درو دیوار میری زندگی کا ایک حصہ بن چکے ہیں، اب میں جیتے جی سرنگا پٹم نہیں چھوڑ سکتی، جب آپ نے پہلی بار اس موضوع پر گفتگو کی تھی تو میں نے یہ سوچا تھا کہ اس وقت انور علی کی والدہ زندہ ہیں اور اگر انور علی نے واپس آکر مجھ پر یہ ظاہر کرنے کی کوشش کی کہ اس کی دنیا میں میرے لیے کوئی جگہ نہیں ہے تو شاید میرا غرور مجھے یہاں ٹھہرنے کی اجازت نہ دے لیکن اب انور علی کی والدہ فوت ہو چکی ہیں اور میرے دل میں غرور کے لیے کوئی جگہ باقی نہیں رہی، تمہیں اس بات کی پروا نہیں ہو گی کہ اس گھر میں تمہارا مقام کیا ہے، منیرہ نے جواب دیا ہاں اب مجھے ایک خادمہ کی حیثیت سے بھی یہاں رہنے پر کوئی اعتراض نہ ہو گا، اور اگر انور علی واپس نہ آیا تو میں یہ سمجھوں گی کہ ماں کی موت کے بعد مراد علی کو ایک بہن کی ضرورت ہے، جولین کرسی سے اٹھ کر تھوڑی دیر کمرے میں ٹہلتا رہا، اور پھر اچانک منیرہ کے قریب رک کر بولا۔جین مجھے معلوم نہ تھا کہ میسور کی آب و ہوا نے ایک فرنسیسی لڑکی کے دل و دماغ میں اتنا بڑا انقلاب برپا کر دیا ہے، اب آئندہ میں تمہارے ساتھ اس موضوع پر کوئی گفتگو نہیں کروں گا،

لیکن میں تم سے صرف یہ ایک وعدہ لینا چاہتا ہوں، اور وہ یہ ہے کہ اگر یہاں کے حالات کسی دن تمہیں اپنے خیالات بدلنے پر مجبور کردیں تو تم مرداعلی کی طرح مجھے بھی اپنا بھائی سمجھو گی۔ منیرہ نے اپنے ہونٹوں پر ایک مغموم مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا، میں آپ کو اس وقت بھی اپنا بھائی سمجھتی ہوں تو پھر میرے ساتھ یہ وعدہ کرو کہ اگر کسی دن تمہیں اپنے وطن کی یاد ستانے لگے تو تم مجھے ضرور اطلاع دو گی، میں تمہارا خط ملتے ہی یہاں پہنچ جاؤں گا، میں وعدہ کرتی ہوں اور میں یہ چاہتی ہوں کہ جب تک آپ یہاں ہیں، کسی اور کے پاس ٹھہرنے کی بجائے یہاں ہارے پاس ٹھہریں، اس مکان کی نچلی منزل کے تمام کمرے آپ کے لے خالی کردیئے جائیں گے، جولین نے جواب دیا، نہیں مجھے شکار پر روانہ ہونے سے پہلے ہی یہ حکم دے دیا گیا تھا کہ واپسی پر مجھے شاہی مہمان کی حیثیت سے ٹھہرایا جائے گا، آپ کے پاس آتے وقت میں نے اپنا سارا سامان سرکاری مہمان خانے میں بھجوا دیا تھا، لیکن میں یہ وعدہ کرتا ہوں کہ اگر انور علی چند دن تک یہاں پہنچ گیا تو میں آپ کے پاس آجاؤں گا،

اکیسواں باب

رات کے وقت فضا میں کچھ حبس باقی تھا اور منیرہ بالائی منزل کی چھت پر ایک برساتی کے نیچے سو رہی تھی۔ آدھی رات کے قریب موسلا دھار بارش شروع ہوئی اور ہوا کے تیز جھونکوں کے ساتھ بارش کے چھینٹوں نے اسے گہری نیند سے بیدار کر دیا، وہ بستر سے اٹھی اور برساتی سے نکل کر زینے کی طرف بڑھی گھٹاٹوپ اندھیرے میں پھونک پھونک کر قدم رکھتے ہوئے وہ مکان کی دوسری منزل میں داخل ہوئی اور ہاتھوں سے اپنا راستہ ٹٹولتی ہوئی ایک کمرے کے دوازے کی طرف بڑھی، اچانک اسے نچلی منزل کے ایک کمرے سے کوئی آواز سنائی دی۔ اور وہ ٹھٹھک کر کھڑی ہو گئی، چند ثانیے بعد وہ بے چینی اور اضطراب کی حالت میں زینے کے راستے نچلی منزل کا رخ کر رہی تھی۔ برآمدے کے قریب پہنچ کر اسے چند قدم دور ایک کمرے کے کھلے دروازے سے روشنی دکھائی دی اور وہ کچھ دیر آگے بڑھنے یا مڑنے کا فیصلہ نہ کر سکی، پھر اسے کریم خان کی آواز سنائی دی، منور تم جا کر خادمہ کو جگاؤ، اور اسے کہو کہ فورا کھانا تیار کرے، ـــــــــــــ کسی نے مانوس اور دلکش آواز میں جواب دیا، نہیں نہیں خادمہ کو جگانے کی ضرورت نہیں، میں راستے میں کھانا کھا چکا ہوں، اور منیرہ کی کائنات زندگی کے دلکش نغموں سے لبریز ہو گئی وہ بولنا چاہتی تھی لیکن اس کے حلق میں آواز نہ تھی۔ وہ بھاگ کر کمرے میں داخل ہونا چاہتی تھی لیکن اس کے پاؤں میں سکت نہ تھی۔ برآمدے کی تاریکی اور کمرے کی روشنی کے درمیان چند قدم کا فاصلہ اسے ایک پہاڑ نظر آتا تھا کمرے سے منور علی خان کی آواز سنائی دی، جناب چھوٹی بی بی جی اوپر برساتی کے نیچے سو رہی ہیں انھیں جگا دوں، نہیں نہیں اس وقت بے آرام کرنے کی ضروت نہیں تم جاؤ منیرہ کا دل مسرت کی دھڑکنون کی

بجائے شکایات سے لبریز ہو گیا، منور اور کریم خان کمرے سے باہر نکلے اور وہ دیوار کے ساتھ سمٹ کر کھڑی ہو گئی، جب وہ صحن میں روپوش ہو گئے تو وہ جھجک جھجک کر قدم اٹھاتی ہوئی کمرے کی طرف روانہ ہوئی ہر لحظہ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہو رہی تھی، اس نے جھانک کر اندر دیکھا، وہ کچھ سوچ کر آگے بڑھنے کی بجائے ایک طرف ہٹ گئی اور اس نے دروازے پر دستک دے دی۔کون ہے انور علی نے کہا، میں اندر آسکتی ہوں، منیرہ نے دہلیز پر پاؤں رکھ کر اندر جھانکتے ہوئے کہا، جیین، انور علی چونک کر بستر سے اٹھا، اور اس کے سامنے کھڑا ہو گیا، منیرہ کمرے میں داخل ہوئی وہ چند ثانیے کمرے میں ایک دوسرے کے سامنے بے حس و حرکت کھڑے رہے۔ بالآخر انور علی نے کرسی اٹھا کر اس کے قریب رکھ دی اور کہ مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ جاگ رہی ہیں، تشریف رکھیئے، منیرہ بیٹھ گئی، اس کی آنکھوں سے آنسو چھلک رہے تھے اور اس کی نگاہیں انور علی کے چہرے پر مرکوز تھیں،، اس نے شکایت کے لہجے میں کہا، آپ کب یہاں پہنچے۔ مجھے یہاں پہنچے ایک گھنٹہ ہو چکا ہے، ---------

---امی جان کے متعلق مجھے راستے میں اطلاع مل گئی تھی، آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔ یہ مرہٹوں کی قید کا اثر ہے، یا آپ تھکے ہوئے ہیں بیٹھ جائیے،۔ انور علی ایک کرسی گھسیٹ کر بیٹھ گیا۔ منیرہ نے کہا، مراد علی مدارس جا چکا ہے۔ ہاں مجھے نوکروں نے بتایا تھا، آپ کھانا نہیں کھائیں گے، نہیں میں کھانا راستے میں کھا چکا ہوں، کاش آپ چند ہفتے پہلے آ جاتے، امی جان کو آخری وقت تک آپ کا انتظار تھا، یہ میرے بس کی بات نہ تھی۔ مرہٹوں کی قید سے رہا ہونے کے بعد میں نے راستے میں بہت کم آرام کیا ہے، میرے ساتھی ابھی کئی منازل دور ہیں،، راستے میں یہ خیال کہ امی جان میری راہ دیکھ رہی ہیں میرے لیے ایک بہت بڑا سہارا تھا، اور مجھے تھکاوٹ کا

احساس تک نہ تھا۔ لیکن کل جب ایک چوکی سے مجھے یہ اطلاع ملی، کہ امی جان فوت ہو چکی ہیں، تو میری ہمت جواب دے گئی۔ منیرہ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ یہ عجیب بات ہے کہ قیدیوں کی رہائی کی خبر سننے کے بعد میں دن رات آپ کا انتظار کیا کرتی تھی لیکن آج جب آپ کو یہاں آنا تھا تو میں شام ہوتے ہی سو گئی تھی۔ انور علی نے کہا جیین نوکرون نے مجھے بتایا ہے کہ آپ نے بیماری کے دوران امی جان کی بہت خدمت کی ہے، میں آپ کا شکر گزار ہوں۔ منور کہہ رہا تھا کہ آپ کا کوئی رشتہ دار یہاں آیا ہوا ہے، وہ کون ہے، وہ لیگر انڈ کا بہنوئی جولین ہے، تو پھر اسے یہاں ٹھہرنا چاہیے تھا۔ گھر میں امی جان بیمار تھیں، اس لیے میں نے اسے یہاں ٹھہرنے پر مجبور نہ کیا، اب وہ شاہی مہمان خانے میں ٹھہرا ہوا ہے۔ کچھ دیر دونوں خاموش بیٹھے رہے۔ انور علی کی گردن جھکی ہوئی تھی۔ اور اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار تھے، منیرہ اچانک کرسی سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی، اور اس نے کہا آپ کو آرام کی ضرورت ہے، ٹھہریئے میں آپ کو اوپر چھوڑ آتا ہوں، انور علی یہ کہہ کر اٹھا اور اس نے آگے بڑھ کر چراغ اٹھا لیا، وہ کمرے سے باہر نکلے، برآمدے میں داخل ہوتے ہی ہوا کا ایک جھونکا آیا، لیکن انور علی نے جلدی سے چراغ کے آگے ہاتھ تان کر اسے بجھنے سے بچا لیا، تھوڑی دیر کے بعد وہ ایک دوسرے سے کوئی بات کیئے بغیر بالائی منزل کے ایک کمرے میں داخل ہوئے، انور علی نے اپنے دیئے کی روشنی سے کمرے کا چراغ روشن کر دیا، پھر وہ منیرہ کی طرف متوجہ ہوا، اب آپ آرام کریں، منیرہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی، انور علی کا طرز عمل اس کے لیے ایک معمہ تھا، وہ جنت جو اس نے انور علی کے ساتھ دوبارہ ملاقات کے تصور سے آباد کی تھی چند منٹ کے اندر ویران ہو چکی تھی، اس کی حالت اس انسان کی سی تھی جو ٹھنڈے اور

میٹھے پانی کے چشمے کے کنارے بیٹھ کر واپس آ گیا ہو۔ چند منٹ پہلے انور علی کے کمرے میں داخل ہوتے وقت جو ولولے اس کے سینے میں بیدار ہوئے تھے، وہ اب سرد ہو چکے تھے، وہ نوجوان جسے اس نے پہلی بار پانڈی چری کی بندرگاہ پر دیکھا تھا بدل چکا تھا، اس کی روکھی پھیکی اور رسمی گفتگو اسے اپنے ساتھ قدرت کا بدترین مذاق محسوس ہو رہی تھی، انور علی کمرے سے نکل گیا، اور وہ نڈھال سی ہو کر کمرے میں بیٹھ گئی، انتہائی کوشش کے باوجود وہ انور علی کے طرز عمل کا جواز معلوم نہ کر سکی، وہ اپنے دل میں کہہ رہی تھی کہ میں جانتی ہوں کہ تم نے مرہٹوں کی قید میں ان گنت اذیتوں کا سامنا کیا ہوگا، اور میں یہ بھی جانتی ہوں کہ تمہارے لیے تمہاری ماں کی موت کا صدمہ نا قابل برداشت ہے۔ لیکن کاش تم اتنا سمجھ سکتے کہ میں ہر مصیبت میں تمہاری حصہ دار تھی، جب تم جنگ کے میدان میں تھے تو میں تمہارے لیے دعائیں کیا کرتی تھی۔ جب تم قید میں تھے تو میں تمہاری راہیں دیکھا کرتی تھی، اور تمہاری ماں کی موت کے بعد میں یہ محسوس کیا کرتی تھی کہ اس دنیا میں مجھ سے زیادہ بے بس اور بد نصیب کوئی نہیں، لیکن تم مجھ سے اتنا بھی نہ پوچھ سکے کہ تنہائی اور بے بسی کے یہ دن میں نے کس طرح سے گزارے ہیں۔



منیرہ بستر پر لیٹ گئی اور دیر تک بے چینی کے ساتھ کروٹیں بدلنے کے بعد سو گئی، چند گھنٹے کے بعد جب اس کی آنکھ کھلی تو نماز کا وقت گزر چکا تھا، آسمان پر بادل چھٹ چکے تھے اور دریچے سے سورج کی شعاعیں کمرے سے باہر آ رہی تھیں، وہ بستر سے اٹھ کے کمرے سے باہر نکلی، اور ہاتھ منہ دھونے کے بعد واپس آ گئی، پھر اس نے صندوق کھول کر کپڑوں کا ایک جوڑا نکالا، لیکن لباس تبدیل کرنے کی بجا

ئے کمرے میں ٹہلنے لگی، ، خادمہ نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا، بی بی جی مبارک ہو انور علی صاحب رات آ گئے ہیں، آج آپ بہت دیر سوئی ہیں ناشتہ لے آؤں، انھوں نے ناشتہ کرلیا، جی ہاں، مجھے اس وقت بھوک نہیں، تم نیچے جاؤ اور میرے پرانے کپڑوں کا بکس اٹھا لاؤ، چمڑے کا بکس، ہاں انور علی صاحب کیا کر رہے ہیں، جی وہ تو ناشتہ کرتے ہی منور کے ساتھ اپنی امی کی قبر پر چلے گئے ہیں، بہت کمزور ہو گئے ہیں وہ۔ خادمہ یہ کہہ کر واپس چلی گئی اور چند منٹ کے بعد ایک چمڑے کا بکس لے کر کمرے میں داخل ہوئی۔ تھوڑی دیر کے بعد منیرہ ہندوستانی لباس کی بجائے فرانسیسی لباس پہنے دریچے کے سامنے کھڑی باہر جھانک رہی تھی۔ انور علی نے دروازے پر دستک دیتے ہوئے کہ کیا میں اندر آ سکتا ہوں، آئیے یہ آپ کا گھر ہے، انور علی کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا کہ خادمہ کہتی ہے کہ آج آپ نے ناشتہ نہیں کیا، منیرہ اس سے اپنے لباس کی تبدیلی کے متعلق کچھ سننا چاہتی تھی، لیکن اسے مایوسی ہوئی اس نے جواب دیا کہ مجھے بھوک نہیں۔ انور علی نے ایک کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ جین بیٹھ جاؤ میں تمہارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں، وہ جھجکتی ہوئی اس کے سامنے بیٹھ گئی۔ انور علی کچھ دیر سر جھکائے سوچتا رہا، بالآخر اس نے کہا کہ میں صبح جب امی جان کی قبر پر گیا تھا تو میں فاتحہ پڑھنے کے بعد سرکاری مہمان خانے چلا گیا تھا، آپ جولین سے مل کر آئے ہیں، ہاں اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں ایک ہفتے تک یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا، رات تم نے مجھے یہ نہیں بتایا تھا کہ وہ تمہیں یہاں لینے آیا ہے، منیرہ نے کوئی جواب نہیں دیا، انور علی نے کہا جین میرے لیے یہ کہنا آسان نہیں ہو گا لیکن اس زندگی میں ہمیں کئی تلخیاں برداشت کرنا پڑتی ہیں، منیرہ نے کہا کہ آپ یہ چاہتے ہیں کہ میں اس کے ساتھ چلی جاؤں، انور علی نے

کچھ کہنے کی کوشش کی لیکن الفاظ اس کے حلق میں اٹک گئے، وہ اضطراب کی حالت میں کرسی سے اٹھا اور تھوڑی دیر کے بعد کمرے میں ٹہلنے کے بعد دریچے کے پاس جا کر کھڑا ہو گیا، منیرہ نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا کہ آپ نے میری بات کا جواب نہیں دیا، انور علی نے اپنے ہاتھوں کی مٹھیاں بھینچ لیں اور منیرہ کی طرف مڑ کر دیکھے بغیر کہا جین مجھے تمہارا مستقبل اپنی خواہشات سے زیادہ عزیز ہے۔وہ بولی موسیو میں یہاں رہ کر آپ کی پریشانیوں میں اضافہ نہیں کروں گی، مجھے صرف اس بات کا انتظار تھا کہ آپ یہاں آ کر مجھے اس بات کا حکم سنائیں، کہ اب اس گھر کے دروازے تمہارے لیے بند ہو چکے ہیں، انور علی نے مڑ کر دیکھا منیرہ کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے اور وہ بڑی مشکل سے اپنے ہونٹ بھینچ کر اپنی سسکیاں ضبط کر رہی تھی، اس نے کہا کہ موسیو جولین کو یہ پیغام دیجیے کہ میں تیار ہوں، ایک ہفتہ انتظار کرنے کی کوئی ضرورت نہیں، جین یہ ایک مجبوری ہے، مجھے معلوم ہے منیرہ نے اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپاتے ہوئے کہا، جولین ابھی یہاں آئے گا اور میں کوشش کروں گا کہ وہ مراد علی کی واپسی تک یہاں ٹھہر جائے، نہیں نہیں منیرہ نے سسکیاں لیتے ہوئے کہا، خدا کے لیے مجھے اس سے زیادہ سزا نہ دیجیے۔سزا۔۔۔۔۔۔۔

تم کیا کہہ رہی ہو کاش تمہیں علم ہوتا کہ تمہارے ساتھ اس گھر کی رہی سہی راحتیں بھی رخصت ہو جائیں گی، وہ بولی کہ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس گھر کو میری اب ضرورت نہیں رہی، انور علی نے دوبارہ منہ پھیر لیا، اور کچھ دیر سوچنے کے بعد کہا کہ جین میں یہ باتیں تمہارے ساتھ میسور کی کسی بندرگاہ سے جہاز پر سوار کراتے ہوئے کہنا چاہتا تھا، لیکن اب میں اس وقت کا انتظار نہیں کر سکتا، تمہیں میرے متعلق کوئی غلط فہمی نہیں ہونی چاہیے، میں نے تمہیں پہلی بار اس وقت دیکھا تھا جب میسور کے

آسمان کا آفتاب نصف النہار پر تھا، اور مجھے یہ اطمینان تھا کہ میں دو مصیبت زدہ انسانوں کو زندگی کی بے پناہ مسرتوں میں حصہ دار بنا سکتا ہوں، لیکن اب میرے سامنے بے پناہ تاریکیاں ہیں۔ میں میسور کے مستقبل سے مایوس نہیں لیکن وہ سہانی صبح جس کی روشنی میں میں تمہیں زندگی کی حسین منازل دکھا سکتا تھا، شاید بہت دور ہے، منیرہ نے گردن اوپر اٹھائی اور انور علی کی طرف پر امید نظروں سے دیکھنے لگی، انور علی نے کہا کہا ہمارے دشمن اس جنگ کے ساتھ ہی ایک نئی جنگ کا بیج بو چکے ہیں، اور میں یہ سوچنے پر مجبور ہوں کہ اگر کسی دن اس وحشت اور بربریت کا سیلاب، جس کے دلگداز مناظر میں اپنی آنکھوں دے دیکھ چکا ہوں، ہمارے گھروں تک پہنچ گیا تو تمہارا انجام کیا ہوگا، میں نے گذشتہ جنگ میں جیتے جاگتے انسانوں کی بستیوں کی جگہ راکھ کے ڈھیر دیکھے ہیں، میں نے اپنی قوم کے بیٹوں کی بے گور و کفن لاشیں دیکھی ہیں۔ میں تمہارے سامنے بیان نہیں کرسکتا کہ ان وحشی بھیڑیوں نے میری قوم کی بیٹیوں کے ساتھ کیا سلوک کیا ہے۔ جنگ میں زخمی ہونے کے بعد جب میں قیدیوں کی ایک بستی سے گزر رہا تھا تو مجھے گلیوں میں مردوں کی لاشیں دکھائی دے رہی تھیں اور مکانوں کے اندر مرہٹے سپاہیوں کے قہقہے اور بے بس عورتوں کی چیخیں سنائی دے رہی تھیں، میں نڈھال ہونے کے بعد ایک بیل گاڑی پر لیٹا ہوا تھا اور میرے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے۔ جین وہ دردناک چیخیں اب بھی میرے کانوں میں گونج رہی ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم کوئی نیا طوفان آنے سے پہلے اپنے وطن چلی جاؤ، اس لیے نہیں کہ اس گھر کو تمہاری ضرورت نہیں بلکہ اس لیے کہ فرانس میں تمہارا گھر اس گھر سے زیادہ محفوظ ہے۔ لیکن ان تمام باتوں کے باوجود اگر تم یہاں رہنا پسند کرتی ہو تو میں دوبارہ اس موضوع پر گفتگو نہیں کرونگا منیرہ نے کہا کہ

آپ کو یہ خیال کیسے آیا کہ میں آپ کو ناراض کر کے یہاں رہ سکتی ہوں، انور علی کی قوت برداشت جواب دے چکی تھی، اس نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ جین اگر تم یہ سننا چاہتی ہو کہ تمہارے متعلق میرے احساسات کیا ہیں تو سنو جب میں قید میں تھا اور مرہٹے مجھے ستانے کے لیے اس قسم کی خبریں سنایا کرتے تھے کہ اب ہم نے سرنگا پٹم کی مکمل ناکہ بندی کر لی ہے اور ہم چند دن کے اندر میسور کے دارالحکومت پر اپنے جھنڈے گاڑ دیں گے، تو میں یہ دعا کرتا تھا کہ کاش تم اپنے وطن فرانس واپس جا چکی ہو اور دوسرے دن یہ دعا مانگتا تھا کہ کاش میں ایک بار پھر تمہیں دیکھ سکوں، منیرہ کے چہرے سے حزن و ملال کے بادل چھٹ گئے، اور اس نے کہا کہ میں یہ سمجھتی تھی کہ آپ مجھ سے نفرت کرتے ہیں، جین تمہارا مطلب یہ ہے کہ میں انسان نہیں ہوں، تمہاری محبت میری زندگی کی سب سے بڑی آزمائش تھی۔ اور اس آزمائش کا دور اس وقت شروع ہوا جب میں نے پہلی بار تمہیں پانڈی چری کی بندرگاہ پر پہلی بار دیکھا تھا اور اس کا سب سے زیادہ صبر آزما اور تکلیف دہ مرحلہ وہ ہوگا جب میں تمہیں میسور کی بندرگاہ پر خدا حافظ کرونگا منیرہ نے کہ آپ کو اب بھی یہ خیال ہے کہ ہماری زندگی میں ایسا مرحلہ آسکتا ہے، انور علی نے کہا کہ جین میری محبت مجھے اس بات کی اجازت نہیں دیتی کہ میں تمیں اپنے آلام و مصائب میں حصہ دار بناؤں، لیکن اگر تم ایک ایسے آدمی کو اپنے لیے کوئی سہارا سمجھ سکتی ہو جس کے راستے میں قدم قدم پر مصائب کے پہاڑ کھڑے ہیں تو مجھے ناشکر گزار نہیں پاؤ گی، خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا کہ بی بی جی جولین صاحب تشریف لائے ہیں، منیرہ نے انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اگر آپ کو کوئی اعتراض نہ ہو تو اسے یہیں بلا لیا جائے، مجھے کیا اعتراض ہو سکتا ہے وہ آپ کا رشتہ دار ہے منیرہ نے خادمہ سے کہا کہ جاؤ اور انھیں

یہیں لے آؤ، خادمہ چلی گئی اور تھوڑی دیر کے بعد جولین کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا کہ جین میں تمہیں مبارکباد دیتا ہوں، اس نے جواب دیا کہ موسیو میرا نام جین نہیں منیرہ ہے، میرا وطن فرانس نہیں میسور ہے، اور میں پیرس میں نہیں بلکہ سر نگاپٹم میں پیدا ہوئی ہوں، جولین نے بدحواس ہو کر یکے بعد دیگرے منیرہ اور انور علی کی طرف دیکھا۔ منیرہ نے کہا موسیو حیران ہونے کی کوئی ضرورت نہیں میں اب مسلمان ہو چکی ہوں، کب جولین نے پوچھا، بہت دیر کی بات ہے، انور علی نے اپنی پریشانی پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا لیکن مجھے یہ بات کسی نے نہیں بتائی، میں نے نوکروں کو منع کر رکھا تھا۔ لیکن کیوں مجھے معلوم نہیں، جولین نے مسکراتے ہوئے کہا کہ موسیو مجھے آپ کی سادگی پر تعجب آتا ہے، اب یہ بتائیے کہ آپ کی شادی کب ہوگی۔ انور علی نے جواب دیا۔ میرا خیال تھا کہ آپ جین سے فرانس کے سفر کے متعلق مشورہ کرنے آئے ہیں، منیرہ نے کہا کہ میں پھر احتجاج کرتی ہوں کہ میرا نام جین نہیں ہے، منیرہ ہے۔ بہت اچھا منیرہ آئندہ مجھ سے یہ غلطی نہیں ہوگی لیکن آپ نے موسیو جولین کی بات کا جواب نہیں دیا، وہ یہ پوچھ رہے ہیں کہ ہماری شادی کب ہوگی، منیرہ کرسی سے اٹھی اور دروازے کی طرف بڑھتے ہوئے بولی، اس سوال کے جواب کے لیے موسیو کو کچھ دیر انتظار کرنا پڑے گا موسیو جولین نے کہا کہ میں ایک مہینہ انتظار کر سکتا ہوں، ٹھہرو تم کہاں جا رہی ہو، میں نے ابھی ناشتہ نہیں کیا، آپ کچھ کھائیں گے، نہیں تم جلدی آؤ منیرہ کمرے سے باہر نکل گئی، اس کا دماغ مسرت کے ساتویں آسمان پر تھا



جولین نے مسکراتے ہوئے انور علی کی طرف دیکھا اور کہا کہ میں اس غلط فہمی

میں تھا کہ آپ کے اور جولین کے درمیان آخری دیوار گرانے کے لیے میرا یہاں ٹھہرنا ضروری ہے، بہر حال مجھے خوشی ہے کہ آپ کو میری خدمات کی ضرورت نہیں پڑی، انور علی نی کہا کہ لیکن آپ تو یہ کہتے تھے کہ آپ صرف جین کو اپنے ساتھ لے جانے پر آمادہ کرنے کے لیے یہاں ٹھہرے ہوئے ہیں، میں صرف یہ معلوم کرنا چاہتا تھا کہ جین نے سرنگا پٹم کے ایک مغرور نوجوان کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر نے میں کہاں تک عقل مندی سے کام لیا ہے آپ کو یہ خیال کیسے ہوا کہ میں مغرور ہوں، جین کے ساتھ چند باتیں کرنے کے بعد میرے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ آپ کے درمیان جو چیز اب تک حائل رہی ہے وہ صرف آپ کا غرور ہے، کیا آپ کے نزدیک میرے لیے یہ بات کافی نہیں تھی کہ وہ میرے دوست کی بیوی تھی، موسیو جین کو صرف آپ کے غرور نے لیگر انڈ کے ساتھ شادی کرنے پر آمادہ کر دیا تھا، کہیں آپ یہ نہ سمجھیں کہ آپ کو مغرور کہنے سے میرا مقصد آپ کی توہین ہے، میں آپ کو ایک بلند ترین انسان سمجھتا ہوں، مجھے آپ کے ایثار و خلوص اور آپ کی نیکی اور شرافت کا اعتراف ہے۔ لیکن ان سب باتوں کے باوجود میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اگر آپ کی نگاہوں کے سامنے غرور کے پردے حائل نہ ہوتے تو آپ کو یہ جاننے میں اتنی دیر نہ لگتی کہ وہ بے بس لڑکی جسے آپ نے پہلی بار پانڈی چری کی بندرگاہ پر دیکھا تھا وہ آپ کو اپنی امیدوں کا مرکز بنا چکی ہے۔ موسیو پانڈی چری میں میں نے جس لڑکی کو دیکھا تھا وہ میرے دوست کی بیوی تھی۔ اور اگر میرے سامنے کوئی چیز حائل تھی تو وہ میرا غرور نہیں بلکہ ایک شریف آدمی کی حیا اور اخلاق تھا، اور میں جین کے متعلق یہ سننا پسند نہیں کروں گا کہ وہ ایک وفا شعار بیوی نہیں تھی، میں نے یہ نہیں کہا کہ جین وفا شعار نہیں تھی، اگر وہ میری بہن ہوتی تو بھی میرے دل میں اس کے

لیے اس سے زیادہ عزت نہ ہوتی۔ میں صرف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ آپ کو لیگر انڈ کی بے بسی پر رحم آیا اور آپ نے اس سے منہ پھیر لیا، اسی طرح جین کو اس پر رحم آیا، اور اس نے اس کے ساتھ شادی کر لی۔ لیگر انڈ میرا عزیز تھا اور میں اس مروت اور رحم دلی کے لیے آپ دونوں کا شکر گزار ہوں، لیکن جب میں آپ کے اور جین کے متعلق سوچتا ہوں تو مجھے یہ کہنا پڑتا ہے کہ لیگر انڈ آپ سے اتنی بڑی قربانی لینے کا حقدار نہ تھا۔ لیکن اب اس بحث سے کوئی فائدہ نہیں، میں صرف آپ کو یہ سمجھانے کے لیے آیا تھا کہ اب جین بیوہ ہو چکی ہے، اور اسے آپ کی ضرورت ہے، مجھے اس نے پہلے یہ بات نہیں بتائی کہ وہ آپ کے لیے اپنا مذہب بھی تبدیل کر چکی ہے، ورنہ میں یہاں آپ کا انتظار کرنے کہ بجائے آپ کے لیے ایک خط لکھ کر چھوڑ جاتا، اب اگر آپ اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں کہ آپ دونوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے تو سرنگا پٹم میں میرا کام ختم ہو جاتا ہے، میں اسی ہفتے واپس چلا جاؤں گا، اب آپ کو میرے ایک سوال کا جواب دینا ہے اور وہ یہ کہ آپ کی شادی کب ہو رہی ہے، انور علی کچھ دیر خاموشی سے جولین کی طرف دیکھتا رہا، بالآخر اس نے کہا کہ میں اس وقت اس سوال کا صحیح جواب نہیں دے سکتا، مجھے اپنے بھائی کی آمد کا انتظار کرنا پڑے گا، کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کچھ عرصہ اور یہاں ٹھہر جائیں، نہیں اگر یہ ضروری ہوتا تو میں ضرور ٹھہرتا لیکن اب مجھے جانا چاہیئے تو پھر آج سے آپ ہمارے مہمان ہیں، میں ابھی شاہی مہمان خانے سے آپ کا سامان منگوا لیتا ہوں، مجھے منظور ہے، انور علی نے کہا موسیو جولین آپ بہت ذہین آدمی ہیں، لیکن میں ایک بات کہنا ضروری سمجھتا ہوں، ـــــــــــــ ابتدا میں اگر مجھے جین کے ساتھ کوئی دلچسپی تھی تو اس کی وجہ صرف یہ تھی کہ لیگر انڈ میرا دوست تھا اور لیگر انڈ کی زندگی میں جین کے ساتھ

میرا رشتہ ایسا تھا جس پر بہن اور بھائی دونوں فخر کر سکتے ہیں، میں جب ماضی کی طرف دیکھتا ہوں تو مجھے یہ محسوس ہوتا ہے کہ اگر لیگر انڈ زندہ ہو جائے اور میں انہی حالات میں ایک بار پھر جین کے ساتھ پانڈی چری کی بندرگاہ سے سرنگا پٹم تک کا سفر کروں، تو میرے طرز عمل میں کوئی تبدیلی نہیں آئے گی، جولین نے کہا کہ میرے دوست تم کو یہ باتیں کہنے کہ ضرورت نہیں، مین یہ تسلیم کرتا ہوں کہ تم عام انسانون سے مختلف ہو، مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ میں یہاں پیدا نہیں ہوا، ورنہ آپ لوگوں کے ساتھ جینا مرنا میں اپنے لیے ایک سعادت سمجھتا۔ منور خان کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا، جناب چند آدمی آپ سے ملنا چاہتے ہیں، اچھا میں آتا ہوں، دیکھو جین نے اگر ناشتہ کرلیا ہو تو اسے اوپر بھیج دو، منور خان نے جواب دیا کہ جناب وہ نیچے محلے کی چند عورتوں کے ساتھ بیٹھی ہیں، انور علی نے جولین کی طرف متوجہ ہو کر فرانسیسی زبان میں کہا، مجھے ملنے کے لیے چند لوگ آئے ہیں، جین نیچے پڑوس کی عورتوں کے ساتھ مصروف ہے، آپ اطیمنان سے بیٹھیں میں ابھی آتا ہوں، جولین نے کہا کہ میرا خیال ہے کہ آپ آج سارا دن مصروف رہیں گے، اس لیے مجھے اجازت دیجیے، میں شام تک واپس آجاؤں گا۔ ویسے بھی آپ کے ہاں منتقل ہونے سے پہلے میرے لیے شاہی مہمان خانے کے ناظم سے اجازت لینا ضروری ہے، بہت اچھا لیکن شام کے وقت آپ ضرور آجایئے گا میں نوکر کو آپ کا سامان لینے کے لیے بھیج دوں گا، جولین اٹھ کر انور علی کے ساتھ چل دیا، مکان کی ڈیوڑھی کے قریب پہنچ کر انور علی نے جولین کو رخصت کیا، اور دیوان خانے میں چلا گیا، باقی سارا دن اس کے یہاں پڑوسیوں اور دوستوں کا تانتا بندھا رہا، اور اسے منیرہ کے ساتھ کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملا، رات کے وقت اس نے دیوان خانے کے ایک

کمرے میں جولین کے ساتھ کھانا کھایا، اور کچھ دیر اس کے اتھ باتیں کرتا رہا، دس بجے کے قریب وہ اپنے مہمان سے رخصت لے کر دیوان خانے سے باہر نکلا، تو رہا ئیشی مکان کے دوازے پر منور خان کھڑا تھا، انور علی نے کہا کون منور تم یہاں کیوں کھڑے ہو، جناب میں آپ کا انتظار کر رہا تھا انور علی نے پیار کے ساتھ اس کے سر پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا، جاوٴ آرام کرو، منور خان نے کہا جناب میں آپ سے ایک بات کرنا چاہتا ہوں، کہو لیکن مجھے ڈر ہے کہ بی بی جی خفا ہوں گی، اگر یہ بات ہے تو پھر تمہیں خاموش رہنا چاہیئے، لیکن جناب میں یہ سمجھتا ہوں کہ گھر کی کوئی بات آپ سے پوشیدہ نہیں رہنی چاہیئے، میں کوئی بات نہیں کہنا چاہتا، ---------

-----بات یہ ہے کہ بی بی جی مسلمان ہو چکی ہیں، اور ان کا نام اب جین نہیں بلکہ منیرہ ہے، میں نے اپنی آنکھوں سے انہین کئی بار نماز پڑھتے ہوئے دیکھا ہے، انور علی نے کہا کہ منور تم نے بہت اچھی خبر سنائی ہے اور صبح میں تمہیں انعام دونگا، منور خان نے کہا جناب میں آپ کو اور ایک بات بتانا چاہتا ہوں۔ابھی بی بی جی یہاں کھڑی آپ کا رستہ دیکھ رہی تھیں، میں قریب سے گزرا تو وہ مجھے دیکھ کر واپس چلی گئیں،

صحن میں پہنچ کر انھوں نے مجھے آواز دی، اور کہا جب آپ آئیں تو میں آپ کو یہ بتا دوں کہ وہ کھانا کھاتے ہی سو گئیں تھیں، میں اس سے پہلے بھی کئی بار انہیں آپ کا انتظار کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں، اچھا جاوٴ اور اب سو جاوٴ، انور علی یہ کہہ کر اندر داخل ہوا تھوڑی دیر کے بعد وہ جب اپنے کمرے میں لباس تبدیل کر رہا تھا تو اسے اپنے بستر کے تکیے پر ایک کاغذ دکھائی دیا، اس نے کاغذ اٹھا کر کھولا اور کرسی گھسیٹ کر چراغ دان کے قریب بیٹھ گیا، کاغذ پر اپنی ماں کے ہاتھ کی تحریر پہچان کر وہ اپنے دل میں

جذبات کا تلاطم محسوس کرنے لگا۔ انور علی کے نام فرحت کے ہاتھ کی آخری تحریر یہ تھی۔ نور چشم مجھے معلوم نہیں کہ تم کہاں ہو، اور کس حال میں ہو، میں بیماری کی حالت میں تمہیں یہ خط لکھ رہی ہوں، اب میں شاید زیادہ دیر تمہارا، انتظار نہ کرسکوں، لیکن مجھے یقین ہے کہ مرنے کے بعد میری روح کو یہ بے چینی نہیں رہے گی، کہ میرے بعد اس گھر میں تمہارے بھائی کے سوا تمہارا، انتظار کرنے والا کوئی نہیں، جب تم آؤ گے تو منیرہ تمہاری راہ دیکھ رہی ہوگی، اس کا ایک رشتہ دار اسے لینے کے آیا ہے، لیکن اس نے اپنے وطن جانے سے انکار کر دیا ہے۔ تم یہ سمجھ سکتے ہو کہ اس انکار کی وجہ کیا ہے، منیرہ اسلام قبول کر چکی ہے اور میری خواہش ہے کہ تم اس کے ساتھ شادی کرلو، ایک ماں سے اپنے بچوں کی کوئی بات پوشیدہ نہیں رہ سکتی، میں جانتی ہوں کہ تم دو نوں کو ایک دوسرے کی ضرورت ہے، منیرہ اگر میری اپنی بیٹی ہوتی تو بھی شاید اس سے زیادہ میری خدمت نہ کرسکتی، مجھے یقین ہے کہ تم ضرور آؤ گے، تمہارے متعلق میں نے جو خواب دیکھے ہیں وہ تمام غلط نہیں ہو سکتے، مجھے یہ بھی یقین ہے کہ میں تمہیں نہیں دیکھ سکوں گی، لیکن میری روح ہمیشہ تمہاری مسرتوں میں تمہاری شریک رہے گی، تمہاری ماں،

انور علی کی آنکھیں آنسوؤں سے لبریز ہو چکی تھیں، اس نے خط کو اپنے ہونٹوں سے لگایا، آنسو آنکھون سے چھلک کر خط میں جذب ہو چکے تھے، جولین انور علی کے ہاں ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد رخصت ہوا اور اس کے جانے کے دس دن بعد مراد علی مدارس سے واپس آ گیا، مراد علی کے گھر پہنچتے ہی انور اور منیرہ کی شادی کی تیاریاں شروع ہو گئیں، اور دو ہفتے کے بعد وہ رشتہ ء ازدواج میں منسلک ہو گئے، دعوت ولیمہ میں شہر کے معززین نے، حکومت کے بڑے بڑے عہدے دار اور فوج کے

افسر شریک تھے، مہمانوں میں کئی افسر ایسے بھی تھے جو انور علی کے ساتھ مرہٹوں کی قید میں رہ چکے تھے، بدرالزمان خان جسے مرہٹوں نے سب سے آخر میں آزاد کیا تھا، شادی سے دو دن قبل سرنگاپٹم پہنچا تھا اور وہ علالت کے باوجود دعوت میں شریک تھا۔ شادی کے کئی دن بعد تک شہر کے معزز گھرانوں کی بہو بیٹیاں مبارکباد کے لیے آتی رہیں اور دلہن کے لیے تحفے تحائف بھی لاتی رہیں، چنانچہ ایک دن منیرہ نے انور علی سے کہا کہ اب میرے پاس اتنے کپڑے جمع ہو گئے ہیں کہ آپ کو میرے لیے کئی سال تک نیا لباس بنوانے کی ضرورت نہیں پڑے گی۔ اگر آپ کی اجازت ہو تو میں چند جوڑے پڑوس کی بیوہ اور محتاج عورتوں میں تقسیم کر دوں، انور علی نے جواب دیا، ایک نیک کام کے لیے مجھ سے اجازت لینے کی ضرورت نہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ تم اپنے تمام فالتو کپڑے شہر کی ان عورتوں میں تقسیم کر دو جن کے شوہر جنگ میں شہید ہو چکے ہیں،



شادی سے چند ہفتے کے بعد انور علی سرنگاپٹم میں ایک ہزار سواروں کی کمان سنبھال چکا تھا، اور مراد علی رسالہ دار کے عہدے پر ترقی کر کے چتل دڑگ روانہ ہو چکا تھا، جنگ کے اختتام سے اگلے سال لارڈ کارنوالس انگلستان واپس چلا گیا۔ اور اس کی جگہ سر جان شور نے کمپنی کی زمام کار سنبھال لی۔ لارڈ کارنوالس کی واپسی کے تقریباً چھ ماہ بعد انگریزوں نے سلطان کے دو بیٹے جنہیں وہ یرغمال کے طور پر مدارس لے گئے تھے واپس بھیج دیئے۔ سلطان ٹیپو معاہدے کی شرائط کے مطابق پہلے سال ہی انگریزوں کو تاوان کی رقم ادا کر چکا تھا، اور اس کے بعد شہزادوں کو اتنی مدت روک کر رکھنے کی کوئی وجہ جواز نہ تھا۔ لیکن میر نواز علی کی مداخلت کے

باعث کمپنی کی حکومت صلح کی شرائط کے خلاف کئی مہینے شہزادوں کی واپسی کا مطالبہ ٹا لتی رہی۔ سلطان کے خلاف میر نظام علی کی مداخلت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ وہ جنگ کے نتائج سے مطمئن نہ تھا اور وہ ان ہڈیوں کو اپنے لیے ناکافی سمجھتا تھا، جو میسور کے مال غنیمت میں سے اس کے حصے آئی تھیں، وہ سلطان سے کرنول کا علاقہ چھیننے پر بضد تھا، انگریز کچھ مدت درپردہ اس کی حوصلہ افزائی کرتے رہے۔ لیکن جنوبی ہند کی سیاست میں اچانک ایک خوشگوار تبدیلی پیدا ہوئی اور انگریزوں نے بدلتے ہوئے حالات سے مجبور ہو کر نظام کے نامعقول مطالبات کی تائید وحمایت سے انکار کر دیا، مہاوجی سندھیا، جو مرہٹہ حکمرانوں میں سب سے زیادہ با اثر، ہوشیار اور دوراندیش تھا اور جس کی بساط سیاست پر دلی کے مفلوج اور بے بس حکمران شاہ عالم ثانی کی حیثیت ایک مہرے سے زیادہ نہ تھی پونا پہنچا اور اس نے اپنے غیر معمولی اثر ورسوخ سے مرہٹوں کی سیاست کا رخ بدل کر رکھ دیا، سندھیا جنوبی ہندستان میں میسور کی سلطنت کو انگریزوں کے راستے کی آخری دیوار سمجھتا تھا، اس نے پیشوا اور اس کے مشیروں اور جرنیلوں کو اس بات کا احساس دلایا کہ تم نے گزشتہ جنگ میں انگریزوں کا ساتھ دے کر غلطی کی ہے، تم ایک بیرونی خطرے کو اپنی سرحدوں کے قریب لے آئے ہو، تمہارا دشمن سلطان ٹیپو نہیں ہے جس کا خاندان برسوں سے جنوبی ہندوستان کی سرحدوں پر پہرہ دے رہا ہے، بلکہ وہ لوگ ہیں جن کے کندھے پر بندوقیں رکھ کر اس ملک کی آزادی اور عزت کے دشمن آہستہ آہستہ دلی کی طرف بڑھ رہے ہیں، ہمیں سلطان ٹیپو کی طاقت سے نہیں بلکہ میر نظام علی کی کمزوری سے خوف کھانا چاہیے جو اپنی حفاظت کے لیے ایسٹ انڈیا کمپنی کے سپاہیوں کی سنگینیوں کی ضرورت محسوس کرتا ہے، اگر تمہیں ہوش نہ آیا تو وہ دن دور نہیں جب حیدرآباد کے ہر شہر میں انگر

افراتفری کا یہ عالم تھا کہ کوئی رسی کھول رہا تھا اور کوئی لگام پر جھپٹنے کی کوشش کر رہا تھا، کوئی اپنے گھوڑے کی رکاب میں پاؤں ڈال رہا تھا اور دوسرا اس کا پاؤں کھینچ کر خود سوار ہونے کی کوشش کر رہا تھا، مراد علی نے فائر کرنے کا حکم دے اور آن کی آن میں چند آدمی زمین پر ڈھیر ہو گئے، کسی نے بلند آواز میں کہ کہ بھاگو بھاگو اپنی جانیں بچاؤ ہم چاروں طرف سے گھیرے میں آ چکے ہیں، مراد علی نے بارعب آواز میں کہا کہ تمہارے لیے کہیں کوئی بھاگنے کا رستہ نہیں اپنے ہتھیار پھینک دو، چند ڈاکوؤں نے ہتھیار پھینک دیے باقی چیختے چلاتے واپس مڑے، باغ کے عقب میں دائیں طرف سے گولیوں کی بوچھاڑ نے انہیں بائیں طرف بھاگنے پر مجبور کر دیا۔اس کے بعد مراد علی اور اس کے ساتھی تلواریں سونت کر باغ میں داخل ہو گئے اور شکست خوردہ ڈاکوؤں کو بھیڑ بکریوں کی طرح ہانکنے لگے، جن لوگوں کو گھوڑوں پر سوار ہونے کا موقع ملا تھا وہ باغ کے آگے جوہڑ عبور کر کے مغرب کی طرف نکل گئے، اور باقی پیدل ان کے پیچھے بھاگنے لگے، مراد علی کے ساتھی بھاگنے والوں کا پیچھا کرنے کا خیال چھوڑ کر ہتھیار ڈالنے والے ڈاکوؤں کو ایک جگہ جمع کرنے میں مصروف تھے، داغ ایک قوی ہیکل آدمی کے گلے میں رسی ڈال کر نمودار ہوا اور کہنے لگا کہ ہم نے ڈاکوؤں کے سردار کو گرفتار کر لیا ہے، اس کے ساتھی چار آدمیوں کو گھیرے میں لیے ہوئے تھے۔تھوڑی دیر کے بعد یہ لوگ اپنے قیدیوں کے سمیت باغ کو چھوڑ کر ایک کھلے میدان میں پہنچے، ڈھونڈیا داغ نے ادھر ادھر دیکھنے کے بعد کہا کہ گاؤں کے لوگ ابھی تک سہمے ہوئے ہیں، مراد علی نے کہا کہ وہ شاید ہمیں بھی ڈاکوؤں کے ساتھی سمجھتے ہوں، داغ نے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہ کہ گاؤں کے لوگ ہماری طرف سے دوستی کا ثبوت حاصل کیے بغیر باہر نہیں آئیں گے، اس لیے ان

قیدیوں کو درختوں کے ساتھ لٹکا دو اور سب سے پہلے ان کے سردار کو پھانسی دے دو۔ مراد علی نے کہا نہیں یہ لوگ ہتھیار ڈال چکے ہیں، میں یہ چاہتا ہوں کہ انہے ادھونی کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے، داغ نے جواب دیا کہ ادھونی میں جن کی حکو مت ہے وہ میرے خیال میں ان ڈاکوؤں سے بھی بدتر ہیں، بہر حال وہ ان لوگوں کے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کر سکتے، ڈاکوؤں کے سردار نے پر امید ہو کر کہا کہ سرکار اگر آپ میری جان بخشی کر دیں تو میں بھگوان کی قسم کھاتا ہوں کہ آئیندہ کوئی جرم نہیں کروں گا۔ مرادعلی نے کہ کہ اگر اس علاقے کے لوگ تمہاری جان بخشی پر کوئی اعتراض نہ کریں تو ہمیں کوئی اعتراض نہ ہوگا، چند آدمی سامنے کھڑے یہ تماشہ دیکھ رہے تھے، مراد علی نے آگے بڑھ کر بلند آواز میں کہا کہ بھائیو ہم تمہارے دوست ہیں، ڈاکو بھاگ گئے ہیں اور اب تم باہر آ سکتے ہو، داغ اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہوا اور کہنے لگا کہ تم اب یہاں سے واپس چلے جاؤ، اب یہاں تمہاری ضرورت نہیں، صرف آٹھ دس آدمی رہ جائیں، اگر ڈاکوؤں کا کوئی گھوڑا تمہیں پسند آ جائے تو لے جاؤ ورنہ گاؤں والوں کے لیے یہیں رہنے دو۔ ہم ابھی جنگل میں تم سے آملیں گے، مراد علی نے کہا کہ ان سے کہیں کہ ایک آدمی میرا گھوڑا یہاں پہنچا دے، مین یہیں سے اس گاؤں کے سردار کی طرف روانہ ہو جاؤں گا، داغ کے ساتھی وہاں سے چل دیئے اور تھوڑی دیر کے بعد تین آدمی گاؤں ں سے نمودرا ہوئے، مراد علی اور داغ نے آگے بڑھ کر ان کے ساتھ مصافحہ کیا اور پھر چند منٹ کے اندر اندر گاؤں کے لوگو ں کا وہاں ہجوم لگ گیا، مراد علی سے کچھ دیر باتیں کرنے کے بعد وہ یک زبان ہو کر قیدیوں کو موت کے گھاٹ اتار دینے کا مطالبہ کر رہے تھے، اچانک دائیں سمت سے گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی اور تھوڑی دیر میں سرپٹ سوار نمودار ہوئے، سب سے

آگے آنے والے سوار نے جس کے لمبے اور سنہری بال ہوا میں لہرا رہے تھے، ہجوم کے قریب پہنچ کر اپنی پوری قوت کے ساتھ گھوڑے کی باگ کھینچی اور گاؤں کے لوگ ادھر ادھر ہٹ گئے، ایک ثانیہ کے لیے مراد علی کی نگاہیں اس کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں، یہ ایک لڑکی تھی، مراد علی کو پہلی نظر میں یہ محسوس ہوا کہ ایک دلکش تصویر ماضی کے دھندلکوں سے نکل کر اچانک اس کے سامنے آ گئی ہے۔ ایک عمر رسیدہ آدمی نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا کہ آپ نے بہت دیر لگا دی، لیکن شکر ہے کہ ان لوگوں کی بروقت مدد سے ہمارا گاؤں بچ گیا، ۔ڈاکو بھاگ گئے اور ان کا سردار چند آدمیوں سمیت گرفتار ہو چکا ہے، ۔لڑکی نے ایک ہاتھ سے پیشانی پر بکھرے ہوئے بال پیچھے ہٹاتے ہوئے پوچھا کہ ڈاکوؤں کا سردار کہاں ہے، عمر رسیدہ آدمی نے ایک قوی ہیکل آدمی کی طرف کہ جس کے ہاتھ پاؤں بندھے ہوئے تھے اشارہ کر دیا، لڑکی گھوڑے سے اتر کر سردار کی طرف بڑھی۔ مراد علی نے دبی زبان میں گاؤں کے ایک آدمی سے پوچھا یہ کون ہے، یہ سردار اکبر خان کی بیٹی ہے، ثمینہ جی ہاں، مراد علی اس نسوانی حسن اور مردانہ وقار کے ایک پیکر مجسم کی طرف دیکھنے کی بجائے تصور میں ایک بھولی بھالی اور نازک لڑکی کا تصور کر رہا تھا، ثمینہ اس کے پاس سے گزرتے ہوئے ڈاکوون کے سردار کے پاس رکی اور اس نے ایک ثانیہ کے توقف کے بعد تماشائیوں کے ہجوم کیطرف دیکھا اور اچانک اپنی تلوار نیام سے نکالتے ہوئے کہ کہ یہ ابھی تک زندہ ہے، اور پھر پلٹ کر اچانک سردار پر یکے بعد دیگرے دو وار کر دیئے، جب اس نے تیسری بار ہاتھ اٹھایا تو مراد علی نے بھاگ کر اس کا ہاتھ پکڑ کر اسے ایک طرف دھکیل دیا اور کہنے لگا کہ بس کیجئے وہ مر چکا ہے، ثمینہ نے غضبناک ہو کر مراد علی کی طرف دیکھا لیکں اس کی آہنی گرفت میں بے بس ہو کر

رہ گئی، چند سوار گھوڑوں سے کود کر آگے بڑھے، لیکن دیہاتیوں نے ان کا راستہ روک لیا اور چلا چلا کر کہا کہ انہوں نے ہماری مدد کی ہے انہوں نے ہماری جان بچائی ہے، ثمینہ غور سے مراد علی کی طرف دیکھ رہی تھی اس کا غصہ اب حیرت میں بدل چکا تھا، اس نے پوچھا کہ آپ کون ہیں، میں مراد علی ہوں، ثمینہ نے گردن جھکا لی اور مراد علی اس کا بازو چھوڑ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔ تماشائی دم بخود ہو کر ان کی طرف دیکھ رہے تھے۔ ثمینہ نے دوبارہ مراد علی کی طرف دیکھا تو اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے، اس نے کہا کہ آپ کو علم نہیں ہے کہ ان لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا سلوک کیا ہے، مجھے معلوم ہے لیکن میں یہ برداشت نہیں کر سکتا کہ تم ---------

--------- یہاں تک کہہ کر مراد علی کی زبان رک گئی، نہیں آپ کو یہ معلوم نہیں کہ ان لوگوں نے کس طریقے کے ساتھ میرے باپ اور بھائی کو قتل کیا ہے، ورنہ آپ میرا ہاتھ نہ پکڑتے۔ مراد علی کا پورا جسم کپکپا اٹھا۔ اور اس نے کرب آمیز لہجے میں کہا کہ نہیں یہ مجھے معلوم نہ تھا۔ داغ نے آگے بڑھتے ہوئے مراد علی کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہ کہ میرے دوست ایسے لوگوں پر رحم نہیں کھانا چاہیے۔ اب بتائیے کہ باقی قیدیوں کے متعلق آپ کا کیا فیصلہ ہے، مراد علی نے جواب دیا کہ مجھے ان لوگوں کے متعلق فیصلہ کرنے کا کوئی حق نہیں، ثمینہ نے کہا کہ اگر آپ ان لوگوں کی جان بخشی کرنا چاہتے ہیں تو مجھے کوئی اعتراض نہیں، مراد علی نے جواب دیا کہ یہ لوگ کسی رحم کے مستحق نہیں لیکن میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ انہیں ادھونی کی حکومت کے حوالے کر دیا جائے، ثمینہ نے کہا کہ ادھونی کی حکومت کی طرف سے ہمیں ایسے فیصلوں کو پنچائیتوں کے حوالے کر دینے کا حکم ہے، داغ نے کہ کہ کاش میں آپ کی پنچایت کا فیصلہ دیکھ کر جاتا، لیکن اب مجھے دیر ہو رہی ہے، پھر وہ مراد علی

کی طرف متوجہ ہوا۔ میں آپ کی واپسی کا انتظار کروں گا، اب مجھے اجازت دیجیے۔ ثمینہ نے پوچھا کہ آپ ان کے ساتھ آئے ہیں، جی ہاں، لیکن آپ مرہٹے معلوم ہو تے ہیں، جی ہاں لیکن ہر مرہٹہ ڈاکو نہیں ہوتا، آپ نے میرے قبیلے کے لوگوں کی مدد کی ہے میں آپ کی شکر گزار ہوں، لیکن آپ کہاں جارہے ہیں بہن میں آپ کے پڑوس میں رہتا ہوں، ۔کس جگہ ۔جنگل میں اگر آپ کو پھر میری مدد کی ضروت پڑے تو مجھے آواز دے دیجیے گا، داغ یہ کہہ کر وہاں سے چل دیا، ایک آدمی نے آگے بڑھ کر ثمینہ سے کہا کہ گاؤں کے لوگ کہتے ہیں کہ ڈاکو جنگل میں زیادہ دور نہیں گئے، اور ان میں سے اکثر اپنے گھوڑے چھوڑ کر پیدل بھاگے ہیں، اگر آپ کی اجازت ہو تو ان کا پیچھا کیا جائے، ثمینہ نے جواب دیا کہ اب ان کا پیچھا کرنے سے کوئی فائدہ نہیں، وہ جنگل میں داخل ہو چکے ہیں اور اب شام ہونے والی ہے، تم بیس آدمیوں کو اس گاؤں کی حفاظت کے لیے چھوڑ دو، اور ان قیدیوں کو گاؤں کی پنچایت کے حوالے کردو،



گاؤں کے لوگوں سے کچھ دیر باتین کرنے کے بعد ثمینہ نے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا آیئے میں اب واپس جارہی ہوں، مراد علی نے جواب دیا کہ میں اپنے گھوڑے کا انتظار کر رہا ہوں، ثمینہ نے پوچھا کہ آپ کا گھوڑا کہاں ہے، ہم ڈاکووں پر حملہ کرنے سے پہلے اپنے گھوڑے یہاں سے دور جنگل میں چھوڑ آئے تھے۔ایک دیہاتی نے کہ کہ جناب جنگل میں ڈاکو کئی گھوڑے چھور گئے ہیں اگر آپ کہتے ہیں تو میں ان میں سے ایک آپ کے لیے لے آؤں، نہیں ڈاکووں کے گھوڑے آپ کے

پاس رہیں گے میرا گھوڑا ابھی چند منٹوں میں یہاں پہنچ جائے گا، چند منٹ کے بعد داغ کا ایک ساتھی مراد کا گھوڑا لے کر وہاں پہنچ گیا، اور وہ گاؤں کے لوگوں کی دعائیں لیتا ہوا ثمینہ کے ساتھ چل دیا، راستے میں مختلف بستیوں کے لوگ ان سے جدا ہوتے گئے، اور کوئی پانچ میل چلنے کے بعد ان کے ساتھ صرف تیس آدمی رہ گئے۔ مراد علی کے دل و دماغ پر اکبر خان اور شہباز کی موت کا گہرا اثر تھا۔ اور وہ راستے میں ثمینہ یا اس کے کسی ساتھی سے کوئی بات نہ کر سکا، اکبر خان اور شہباز کی مختلف تصویریں اس کے سامنے گھوم رہی تھیں، اور اسے اس بات کا احساس قطعاً نہ تھا کہ وہ کس راستے جا رہا ہے، کس سمت جا رہا ہے اور کتنا فاصلہ طے کر چکا ہے، ثمینہ جسے اس نے تھوڑی دیر ننگے سر دیکھا تھا، اب اپنے سنہری بالوں کو سفید اوڑھنی میں چھپائے ہوئے تھی، وہ کبھی کبھی بھاگتے ہوئے گھوڑے سے مراد علی کی طرف دیکھتی، لیکن اسے کچھ کہنے کا حوصلہ نہ ہوتا، ایک ٹیلے کے قریب پہنچ کر اس نے اپنے گھوڑے کی رفتار کم کر لی، اور قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے مراد علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا کہ اب ہم پہنچ گئے ہیں ہمارا گاؤں اس ٹیلے سے صرف ایک کوس دور ہے، مراد علی نے کہا کہ میں یہ سمجھتا تھا کہ آپ کا گاؤں اس بستی سے زیادہ دور نہیں ہوگا، ثمینہ نے جواب دیا کہ وہ بستی سرحد کے قریب ہمارے قبیلے کی آخری بستی ہے، اور ہمارے گاؤں سے کافی دور ہے، آپ کی امی جان اور بھائی کا کیا حال ہے، مراد علی نے جواب دیا کہ بھائی جان خیریت سے ہیں اور امی جان فوت ہو چکی ہیں، آپ کی امی جان کیسی ہیں، وہ ٹھیک ہیں، کچھ دیر دونوں خاموش رہے، بالآخر مراد علی نے پوچھا کہ چچا جان اور شہباز کب شہید ہوئے۔ انھیں شہید ہوئے چار مہینے ہو چکے ہیں، تنویر اور ہاشم حیدر آباد میں ہیں، جی ہاں وہ ابا جان اور بھائی جان کی شہادت کے بعد یہاں آئے تھے اور کوئی

ڈیڑھ مہینہ رہ کر واپس چلے گئے تھے، ٹیلہ عبور کرنے کے بعد ان کے چند اور ساتھی راستے کی ایک بستی میں رک گئے اور ثمینہ نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگاتے ہوئے کہ کہ اب ہمیں گھر جلدی پہنچنا چاہیئے امی جان پریشان ہو رہی ہوں گی، تھوری دیر کے بعد وہ گاؤں میں پہنچ گئے، آفتاب غروب ہو چکا تھا اور گاؤں کی مسجد سے اذان سنائی دے رہی تھی، مراد علی گھوڑے سے اتر پڑا اور ثمینہ کی طرف متوجہ ہو کر بولا کہ میں نماز پڑھ کر آتا ہوں، ایک آدمی نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑلی اور مراد علی اپنے کندھے سے بندوق اتار کر اس کے حوالے کرنے کے بعد مسجد کی طرف چل پڑا۔

تیسواں باب

۔۔۔مراد علی نماز سے فارغ ہو کر واپس آیا، تو گھر کے چند نوکر ڈیوڑھی پر اس کا انتظار کر رہے تھے، مراد علی ان کے ساتھ مصافحہ کر رہا تھا کہ ایک نوعمر لڑکا بھاگتا ہوا آیا اور اس نے کہا کہ جناب آپ کو بیگم صاحبہ نے بلایا ہے، مراد علی اس کے ساتھ چل دیا، مکان کے مردانہ حصہ سے نکل کر وہ اندرونی ڈیوڑھی کے ساتھ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے، کمرے میں چراغ روشن تھا وہ واپس چلا گیا، اور مراد علی ایک کرسی پر بیٹھ گیا، کمرے میں دیواروں کے ساتھ جگہ جگہ شیروں اور چیتوں کی کھالیں لٹکی ہوئی تھیں، ایک کونے میں لکڑی کا ایک بڑا صندوق پڑا ہوا تھا، اکبر خان کی بیوہ کے ساتھ ملاقات اسے ایک صبر آزما مرحلہ محسوس ہوا تھا۔ بلقیس کمرے میں داخل ہوئی اور مراد علی نے انتہائی کوشش کے بعد جو الفاظ اور احساسات ذہن میں جمع کیے تھے وہ منتشر ہو کر رہ گئے، وہ کرسی سے اٹھا اور لرزتی ہوئی آواز میں چچی جان سلام وعلیکم کہہ کر خاموش ہو گیا، بیٹا جیتے رہو، بلقیس یہ کہہ کر آگے بڑھی اور ایک ثانیہ توقف کے بعد کرسی پر بیٹھ گئی، مراد علی نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا کہ چچی جان مجھے ابھی تک چچا جان اور شہباز خان کی موت کا یقین نہیں آتا۔ بیٹا میں ان کی لاشیں دیکھ کر بھی اپنے آپ کو یہ دھوکہ دینے کی کوشش کر رہی تھی کہ وہ زندہ ہیں،، لیکن موت ایک ایسی حقیقت ہے جسے تسلیم کیے بغیر چارہ نہیں، ہم سب اس سال حج پر جانے کا ارادہ کر رہے ہیں، اور تمہارے چچا جان کی خواہش تھی کہ حج پر روانہ ہونے سے پہلے ہم چند دن کے لیے سرنگاپٹم جائیں گے، ثمینہ نے مجھے تمہاری امی جان کی وفات کی خبر سنائی ہے مجھے بہت افسوس ہوا ہے، چچی جان میں ایک مدت سے یہاں آنے کا ارادہ کر رہا تھا لیکن حالات ایسے تھے کہ میں آپ کی خدمت میں حاضر نہ ہو سکا،

بلقیس نے اپنے دوپٹے سے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا کہ وہ تمھیں بہت یاد کیا کر تے تھے۔چچی جان مجھے گاؤں کے کسی آدمی سے ان کی شہادت کی تفصیلات پوچھنے کی ہمت نہیں ہوئی مجھے ہمیشہ اس بات کا افسوس رہے گا کہ میں ان سے اتنی دور تھا، بیٹا مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں گاؤں سے باہر نکل کر اس کا راستہ روک سکوں، میں نے ایک نوکر کو اس کے پیچھے روانہ کیا لیکن وہ بھی اس کا ارادہ بدلنے میں کا میاب نہ ہو سکا ان کی موت کی تفصیلات بہت دردناک ہیں اور اگر تم یہاں ہو تے بھی تو کیا کر لیتے، قدرت کو یہی منظور تھا۔مراد علی کے مزید استفسار پر بلقیس بیگم نے اپنے بیٹے اور شوہر کی شہادت کی تفصیلات بیان کرتے ہوئے کہا۔ایک دن ہمیں حیدر آباد سے تنویر کے سسر کی موت کی اطلاع آئی اور اگلے دن ثمینہ کے ابا حیدر آباد جانے کے لیے تیار ہو گئے، ہم سب ان کے ساتھ جانا چاہتے تھے لیکن ان کے سمجھانے پر اپنا ارادہ ملتوی کر دیا، اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ہمیں حیدر آباد کے طویل سفر میں شہباز کی تکلیف کا خیال تھا، اس کی بینائی اس حد تک زائل ہو چکی تھی کہ وہ بڑی مشکل سے سیاہی اور سفیدی میں تمیز کر سکتا تھا

،شہباز کے ابا جان نے چھ آدمی اپنے ساتھ لیے اور علی الصبح حیدر آباد کے لیے روانہ ہو گئے کاش مجھے معلوم ہوتا کہ میں آخری بار انہیں رخصت کر رہی ہوں، اگلے دن پڑوس کی بستی کا چرواہا دہائی دیتا ہوا ہمارے گاؤں پہنچا اور اس نے بتایا کہ اس نے جنگل میں اپنے سردار اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں دیکھی ہیں، آن کی ان میں گا وں کے لوگ گھوڑے پر سوار ہو کر ان کے ساتھ روانہ ہو گئے۔مجھے کچھ دیر کے لیے اپنا ہوش نہ تھا اور جب میرے حواس درست ہوئے تو مجھے پتا چلا کہ شہباز بھی ان

کے ساتھ ہی چلا گیا ہے ثمینہ اپنے بھائی کے پیچھے جانے پر بضد تھی لیکن میں نے اسے روک لیا، شام کے وقت جب گاؤں کے لوگ واپس آئے تو وہ اپنے گھوڑوں پر تمہارے چچا جان اور شہباز کے علاوہ چودہ اور آدمیوں کی لاشیں لادے ہوئے تھے، گاؤں کے لوگوں نے ہمیں بتایا کہ وہ یہاں سے چند میل دور جنگل میں پہنچے تو ایک درخت کے ساتھ ثمینہ کے ابا اور ان کے ساتھیوں کی لاشیں لٹک رہی تھیں،، جب وہ درخت سے لاشیں اتار رہے تھے تو پاس ہی کسی گھنی جھاڑی سے گولیوں کی بوچھاڑ آئی اور ہمارے چند آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ ہمارے آدمیوں نے جوابی حملہ کیا اور مرہٹے زخمی ہو کر بھاگ گئے، انہوں نے پانچ مرہٹوں کو زندہ گرفتار کرلیا اور ان سے باز پرس کی تو پتہ چلا کہ مرہٹوں کی باقاعدہ فوج کے چند آدمی میسور کی جنگ سے فارغ ہو کر ادھر آ گئے ہیں، اور وہ سرحدی ڈاکوؤں کی رہنمائی کر رہے ہیں، گاؤں کے لوگ کہتے تھے کہ ڈاکوؤں کی پہلی گولی شہباز کے سینے پر لگی تھی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا تھا۔ان کا سایہ اٹھنے کی دیر تھی کہ سرحد پار کے وہ ڈاکو جو اس سرزمین پر پاؤں رکھنے کی جرات نہیں کرتے تھے شیر ہو گئے اور انہوں نے دس دن بعد اس علاقے کی ایک بستی پر حملہ کر دیا، ہمارے گاؤں کے چند آدمی یہ اطلاع ملتے ہی حملہ آوروں کے مقابلے پر جانے کے لیے تیار ہو گئے۔لیکن گاؤں کی اکثریت ان کا ساتھ دینے میں پس وپیش کر رہی تھی، جب وہ ہمارے مکان کے سامنے کھڑے ہو کر بحث کر رہے تھے تو ثمینہ مکان کی ڈیوڑھی میں سے ان کی باتیں سن رہی تھی ۔ تھوڑی دیر کے بعد نوکر بھاگتے ہوئے میرے پاس آئے اور انہون نے یہ اطلاع دی کہ ثمینہ گھوڑے پر سوار ہو کر باہر نکل گئی ہے،، میں جلدی سے ڈیوڑھی میں پہنچی تو ثمینہ گھوڑے کی زین پر سوار ہو کر تقریر کر رہی تھی، گاؤں کے لوگ اپنے سردار کی بیٹی

کے منھ سے بزدلی اور بے غیرتی کے طعنے برداشت نہ کر سکے اور آن کی آن میں ہر بوڑھا اور جوان لڑائی پر جانے کے لیے تیار ہو گیا، جب وہ سوار ہو کر یہاں سے نکلے تو ثمینہ کا گھوڑا سب سے آگے تھا، مجھ میں اتنی ہمت نہ تھی کہ میں آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک سکوں، میں نے ایک نوکر کو اس کے پیچھے روانہ کیا لیکن وہ اس کا راستہ روکنے میں کامیاب نہ ہو سکا۔ راستے میں گاؤں کے لوگ بھی، اس کو سمجھاتے رہے لیکن وہ سب کو یہی جواب دیتی رہی کہ میں سردار اکبر خان کی بیٹی ہوں اپنے گاؤں کے لوگوں کی حفاظت کرنا میری ذمہ داری ہے، راستے میں کئی اور بستیوں کے لوگ ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور دوپہر کے وقت ہمیں یہ اطلاع ملی کہ لٹیرے تیس لاشیں میدان میں چھوڑ کر بھاگ گئے ہیں، اور دس آدمیوں کو گرفتار کر لیا گیا ہے، جب شام کے وقت ثمینہ آئی تو اس نے مجھے یہ خبر سنائی کہ قیدیوں کو اسی درخت کے ساتھ پھانسی دے دی گئی ہے جس درخت کے ساتھ اس کے ساتھیوں اور ابا جان کی لاشیں پائی گئی تھیں، قبیلے کے لوگوں نے اپنے سردار کی موت کے بعد ہمارے خاندان کے ایک با اثر آدمی کے سر پر پگڑی باندھ دی تھی۔ لیکن اس واقعے کے بعد ثمینہ کا رتبہ سردار سے بلند سمجھا جاتا ہے اور قبیلے کے لوگ اس کے اشاروں پر جان دیتے ہیں، ہاشم اور اس کے خاندان کے کئی لوگ تعزیت کے لیے یہاں آئے تھے اور وہ ہمیں اپنے ساتھ حیدرآباد لے جانے پہ مصر تھے، میں بھی یہ محسوس کرتی تھی کہ یہ جگہ ہمارے لیے محفوظ نہیں، لیکن قبیلے کے لوگوں کی التجاؤں نے ہمیں اپنا ارادہ بدلنے پر مجبور کر دیا، نیا سردار ہر گاؤں کے بااثر افراد کا ایک وفد لے کر ہمارے پاس آیا اور اس نے کہا کہ اگر آپ لوگ چلے گئے تو ہم میں سے کوئی بھی یہاں رہنا پسند نہیں کرے گا، اس علاقے کے لوگوں کا حوصلہ بلند رکھنے کے لیے ثمینہ کا یہاں رہنا

ضروری ہے اور ثمینہ یہ کہتی تھی کہ میں آخری دم تک اپنے قبیلے کا ساتھ چھوڑنا پسند نہیں کروں گی، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ ثمینہ کے ابا جان کہا کرتے تھے کہ میری بھولی بھالی ثمینہ اپنے سینے میں ایک شیر کا دل رکھتی ہے ۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ اور آج ہمارا سارا قبیلہ اس کی بہادری کے گیت گاتا ہے، ۔شہباز اور اس کے ابا جان کی وفات کے دو مہینوں کے بعد مرہٹوں نے دوبارہ سرحد عبور کر کے ہماری بستیوں کو لوٹنے کی کوشش کی تھی، لیکن ثمینہ نے چند خونریز لڑائیوں کے بعد انہیں پھر بھگا دیا تھا۔ اس کے بعد کچھ دیر امن رہا، لیکن گذشتہ چند دن سے ڈاکوؤں نے پھر لوٹ مار شروع کر دی ہے، بلقیس یہاں تک کہہ کر خاموش ہو گئی، مراد علی نے کہا کہ چچی جان آج مجھے ثمینہ کی جرات نے بہت متاثر کیا، لیکن اس کے باوجود میں یہ سمجھتا ہوں کہ چچا جان اور شہباز کی موت کے بعد آپ کا یہاں رہنا مناسب نہیں، میں بھی یہی سمجھتی ہوں لیکن ثمینہ کی مرضی کے خلاف میرے لیے یہ گھر چھوڑنا ممکن نہیں، وہ یہ سمجھتی ہے کہ ہمارا، یہاں سے جانا اپنے قبیلے کے ساتھ بے وفائی اور بد عہدی کے مترادف ہو گا۔ بیٹا ثمینہ کی کئی باتیں میرے لیے معمہ ہیں، بھائی اور باپ کی موت کے بعد میں نے اس کی آنکھوں میں کبھی آنسو نہیں دیکھے، لیکن وہ ہر شام ان کی قبروں پر چراغ جلانے جاتی ہے، ،شہباز عام طور پر اس کے کمرے میں رہا کرتا تھا اور ثمینہ نے اس کے مرنے کے بعد اس کے یادگاریں اس کمرے میں جمع کر دی ہیں، اس صندوق میں اس کی تلواروں اور کپڑوں کے علاوہ اس کے جوتے ہیں، یہ اس کے گھوڑے کی زین ہے اور کمرے کی دیواروں کے ساتھ اس کے شکار کیے ہوئے شیروں اور چیتوں کی کھالیں لٹک رہی ہیں، ۔اس کمرے کو ہمیشہ قفل لگا رہتا ہے اور ثمینہ اپنے سوا کسی اور کو اس کی صفائی کرنے کی بھی اجازت نہیں دیتی۔ لیکن آج وہ میری توقع کے خلاف

وہ خود ہی تم کو یہاں ٹھہرانے پر اصرار کر رہی تھی۔ ثمینہ کو شہباز سے بہت پیار تھا اور آنکھوں سے محروم ہو جانے کے بعد تو وہ اس کی زندگی کی سب سے بڑی دلچسپی بن چکا تھا۔ وہ ہر وقت اس کے ساتھ رہا کرتی اور اسے کبھی اس بات کا احساس نہیں ہو نے دیتی تھی کہ وہ بینائی سے محروم ہو چکا ہے۔ جب شہباز گھر بیٹھے بیٹھے اکتاہٹ کا شکار ہو جاتا تو ثمینہ اسے گھر سے باہر لے جاتی۔ شروع شروع میں وہ اس کا ہاتھ پکڑ کر چلنے کا عادی تھا۔ لیکن بعد میں کسی وقت کے بغیر ثمینہ کے پیچھے پیچھے چلنے کا عادی ہو گیا تھا۔ وہ کہا کرتا تھا کہ ثمینہ مجھے آگے صرف ایک دھندلے آئینے کی صورت میں نظر آتی ہے لیکن اس کے قدموں کی آہٹ سے میں اپنا راستہ دیکھ سکتا ہوں، بینائی سے محروم ہو جانے کے باوجود گھوڑے پر سواری کرنے کے لیے شہباز کے شوق میں کوئی کمی نہیں آئی تھی۔ شروع شروع میں ہمارا خیال تھا کہ مکمل آرام سے اس کی بینا ئی واپس آجائے گی لیکن جب کوئی فائدہ نہ ہوا تو شہباز کے ابا نے اسے گھوڑے پر سواری کرنے کی اجازت دے دی۔ اور وہ اور ثمینہ ہر روز علی الصبح گھوڑے پر سواری کیا کرتے تھے، ثمینہ کو ہر وقت شہباز کے لیے کوئی نہ کوئی نئی دلچسپی تلاش کرنے کی فکر لگی رہتی تھی۔ ایک دن مجھے معلوم ہوا کہ شہباز ثمینہ کے ساتھ باہر کے احاطے میں بندوق کے نشانے کی مشق کر رہا ہے، اور مجھے سخت حیرت ہوئی، میں وہاں پہنچی تو شہباز اور ثمینہ چند نوکروں کے ساتھ صحن میں کھڑے تھے، اور ان کے سامنے دیوار کے ساتھ ایک لکڑی کا تختہ لٹکا ہوا تھا۔ شہباز کے ہاتھ میں بندوق تھی، ثمینہ نے ایک پتھر اٹھایا اور کہ کہ بھائی جان آپ تیار ہو جائیں، شہباز نے دیوار کی طرف بندوق سیدھی کرتے ہوئے کہا کہ میں تیار ہوں، پھر ثمینہ نے تختے پر پتھر مارا اور شہباز نے آواز سنتے ہی بندوق چلا دی، ۔ میں نے دیکھا کہ جس جگہ ثمینہ کا پتھر لگا تھا اس کے قر

یب ہی شہباز کی بندوق سے دیوار میں سوراخ ہو گیا تھا، ایک نوکر نے خالی بندوق اس کے ہاتھ سے پکڑ لی اور پھر بھری ہوئی بندوق اس کے ہاتھ میں دے دی، شہباز نے اس طرح کئی فائر کیے اور میں وہاں کھڑی دیکھتی رہی، جب ثمینہ نے اسے یہ بتا یا کہ آپ کا نشانہ میرے پتھر کے بالکل قریب لگا ہے تو اس کا چہرہ خوشی سے دمک اٹھتا، تھوڑی دیر کے بعد اس کے ابا جان بھی آ گئے انہوں نے یہ تماشا دیکھا تو مسکرا تے ہوئے دبے پاؤں آ کر ہمارے قریب کھڑے ہو گئے،۔شہباز کے چند نشانے دیکھنے کے بعد انہوں نے ایک لمبی چھری منگوائی اور کہا کہ بیٹا اب ثمینہ کی بجائے میں تمہاری رہنمائی کرتا ہوں، یہ کہہ کر وہ دیوار کی طرف بڑھے اور تختے کے بالکل قریب کھڑے ہو گئے،۔پھر انہوں نے چھری کی نوک سے تختے پر ٹھک کرنے کے بعد شہباز کو فائر کرنے کے لیے کہا، تو وہ بولا ابا جان مجھے آپ کی آواز اپنے ہدف کے بالکل قریب سنائی دے رہی ہے، انھوں نے جواب دیا کہ تم میری فکر نہ کرو میں تختے سے کافی دور ہوں،۔اب تیار ہو جاؤ، یہ کہہ کر انہوں نے تختے پر دوبارہ ٹھک ٹھک کی اور شہباز نے گولی چلا دی، اس کا یہ نشانہ بالکل صحیح تھا، اس کے بعد چند ہفتوں میں شہباز کو اتنی مشق ہو گئی تھی کہ وہ پچاس ساٹھ قدم سے ٹھک ٹھک سن کر نشانہ لگا سکتا تھا، اور ثمینہ اسے اپنی زندگی کا ایک بہت بڑا کارنامہ سمجھتی تھی، ثمینہ میرے سامنے کبھی اپنے بھائی یا ابا جان کا ذکر نہیں کرتی۔لیکن میں یہ سمجھتی ہوں کہ اس کی زند گی میری نسبت زیادہ المناک ہے، میں اپنی بپتا دوسروں کو سنا کر دل کا بوجھ ہلکا کر لیتی ہوں لیکن وہ اپنے غم میں کسی کو حصہ دار بنانا پسند نہیں کرتی، ایک نوکر نے کمرے میں جھانکتے ہوئے کہا کہ جناب گاؤں کے لوگ باہر جمع ہو رہے ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں،

بلقیس نے کہا کہ تم انہیں بٹھاؤ یہ اب کھانا کھا کر جائیں گے، مراد علی نے کہا، چچی جان یہ بہتر نہ ہوگا کہ میں کھانا کھانے سے پہلے انہیں مل آؤں نہیں بیٹا تمہیں وہاں دیر لگ جائے گی، میں کھانا بھیجتی ہوں، بلقیس یہ کہہ کر وہاں سے اٹھی اور کمرے سے باہر نکل گئی، ۔رات کے دس بجے مراد علی اسی کمرے میں بستر پر لیٹا ہوا تھا، دن بھر کے واقعات ایک خواب معلوم ہوتے تھے ۔ثمینہ اس کم سن اور بھولی بھالی لڑکی سے کس قدر مختلف تھی جسے اس نے پہلی بار اس گھر میں دیکھا تھا اور جس کے تصور سے ہونٹوں پر مسکراہٹ آجاتی تھی، وہ یہ سوچا کرتا تھا کہ اب ثمینہ بڑی ہو چکی ہوگی اور شاید وہ مجھے دیکھے تو پہچان بھی نہ پائے، اور شاید میں بھی اسے پہچان نہ پاؤں، اور چند سالوں کے بعد تو اسے میرا نام تک یاد نہ رہے گا، سرنگا پٹم سے روانہ ہونے کے وقت کے بعد راستے کی منازل میں اکبر خان اور شہباز خان کے ساتھ کئی گئی ملاقاتوں کے تصور میں کبھی کبھار اس کے تصور میں مبہم سی ثمینہ کی تصویر آجاتی تھی، اور وہ تھوڑی دیر کے لیے بھول جاتا تھا کہ اس کے ماضی اور حال کے درمیان چھ سال کا عرصہ حائل ہے، اور پھر اسے جب اچانک یہ خیال آتا کہ ثمینہ اب جوان ہو چکی ہوگی اور اس کے سامنے آنے سے اجتناب کرے گی تو اسے ایک بے نام سی الجھن ہونے لگتی، اور اب وہ ثمینہ کو دیکھ چکا تھا لیکن اس کی الجھن کم ہونے کی بجائے زیادہ ہونے لگی تھی، وقت کا یہ انقلاب جس نے اکبر خان کی بیٹی اور شہباز خان کی بہن کو پھولوں سے کھیلنے کی بجائے تلوار اٹھانے پر مجبور کر دیا تھا، مراد علی کے لیے ناقابل برداشت تھا، وہ بار بار اپنے دل میں کہہ رہا تھا کہ، ثمینہ ثمینہ کاش میں تمام عمر تمہارے گھر کے دروازے پر پہرہ دے سکتا، کاش میں انسانیت کے خرمن سے ظلم و وحشت کی وہ آگ بجھا سکتا، جس کی حرارت نے تمہیں گھر سے باہر نکلنے پر مجبور کر دیا

ہے،، دیر تک بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد مراد علی کو نیند آ گئی، علی الصبح اس کی آنکھ کھلی تو نماز کا وقت ہو چکا تھا، وہ جلدی سے باہر نکلا اور مسجد کی طرف چل دیا، جب وہ نماز سے فارغ ہو کر کمرے میں آیا تو ثمینہ اس کا بستر درست کر رہی تھی، وہ بے خیالی کے عالم میں کمرے کے اندر داخل ہوا اور اس نے پریشانی کے عالم میں کہا، معاف کیجئے گا مجھے معلوم نہ تھا کہ آپ یہاں ہیں، ثمینہ نے بے پروائی سے جواب دیا کہ میں آپ کا کمرہ صاف کر رہی تھی، پھر اس نے ایک کرسی پر پڑے ہوئے چند کپڑوں کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، یہ کپڑے آپ کے لیے ہیں، مراد علی نے کہا کہ آپ کو اس تکلیف کو کرنے کی کیا ضرورت تھی، میرے گھوڑے کی خورجین میں چند فالتو جوڑے پڑے ہوئے تھے، ثمینہ نے مراد علی کی طرف دیکھے بغیر کہا کہ بھائی جان نے اپنی موت سے پہلے چند جوڑے بنوائے تھے اور وہ اسی طرح پڑے ہوئے ہیں، یہ جوڑا میں نے خود تیار کیا تھا، ثمینہ یہ کہہ کر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی، مراد علی نے کہا کہ ثمینہ ٹھہرو، وہ رک گئی، میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں، ثمینہ نے مڑ کر اس کی طرف دیکھا اور مراد علی کے خیالات پریشان ہو کر رہ گئے، اس نے بڑی مشکل سے کہا کہ ثمینہ میں تمہیں بہت یاد کیا کرتا تھا، لیکن یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ ہم ان حالات میں ایک دوسرے کو دیکھیں گے، مجھے تمہارے بھائی جان اور ابا جان کی موت کا بے حد افسوس ہے، مجھے معلوم ہے کہ آپ کو ان کے ساتھ بہت محبت تھی اور میں آپ کی شکر گزار ہوں کہ آپ نے ادھونی میں میرے بھائی کی مدد کی تھی۔ وہ آپ کو بہت یاد کیا کرتے تھے، مراد علی نے کچھ دیر توقف کے بعد کہا کہ ثمینہ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ موجودہ حالات میں تمہیں اور چچی جان کو یہاں نہیں رہنا چاہئے، حیدر آباد آپ کے لیے زیادہ

محفوظ ہوگا، کاش حالات ایسے ہوتے کہ میں آپ کو سرنگا پٹم آنے کی اجازت دے سکتا، ثمینہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا کہ ہم یہاں رہنے کا فیصلہ کر چکے ہیں، اور آپ کو ہمارے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے، مراد علی کو کچھ اور کہنے کی ہمت نہ ہوئی، ثمینہ کمرے سے باہر نکل گئی اور وہ نڈھال سا ہو کر کمرے میں موجود ایک کرسی پر بیٹھ گیا، مراد علی کو اپنے قیام کے دوران میں ثمینہ سے کوئی بات کرنے کا موقع نہ ملا، لیکن بلقیس صبح و شام اس کے پاس آتی اور کئی کئی گھنٹے پرانے وقتوں کی باتیں کرتی رہتی، بلقیس کے سامنے بیٹھے بیٹھے جب وہ ثمینہ کے متعلق سوچتا تو اسے اپنے دل پر ایک نا قابل بیان بوجھ محسوس ہوتا، اپنے کمرے سے باہر اس کا بیشتر وقت آس پڑوس کی ان بستیوں کے لوگوں سے ملاقات میں گزرتا جو اسے اپنا محسن خیال کرتے تھے، پھر جب وہ واپس آتا تو کبھی کبھی کمرے کی صفائی یا ساز و سامان میں معولی سا تغیر و تبدل اس بات کی گواہی دیتا کہ ثمینہ اسکی غیر موجودگی میں وہاں آچکی ہے، کبھی اس کے دل میں یہ خیال آتا کہ ثمینہ عمداً اس سے اجتناب کرتی ہے، اور اس کا دل تھوری دیر کے لیے شکایات سے لبریز ہو جاتا، پھر خود ہی ثمینہ کے طرز عمل کے جواب میں مختلف دلائل تلاش کرتا، ثمینہ کے دل و دماغ پر اپنے بھائی اور باپ کی موت کا گہرا اثر ہے، اور میں نے یکا یک اسے گاؤں سے ہجرت کا مشورہ دے کر خفا کر دیا ہے،، پھر وہ تصور کے عالم میں ثمینہ کے سامنے اپنی صفائی پیش کرتا، ثمینہ میرا یہ مطلب نہ تھا میں جانتا ہوں کہ تم بہت بہادر ہو، تمہاری رگوں میں ایک غیور باپ کا خون ہے،، لیکن تم ایک لڑکی ہو اور قدرت نے تمہیں آگ کے طوفانوں کا مقابلہ کرنے کے لیے نہیں پیدا کیا۔ میں تم سے یہ کہنے کا حق رکھتا ہوں کہ تمہارے لیے یہ گاؤں محفوظ نہیں، پانچویں روز وہ عشاء کی نماز پڑھ کر گاؤں کی مسجد سے واپس آیا تو وہ لڑکا جو اس کے لیے صبح

وشام کھانا لایا کرتا تھا، اس کے کمرے کے دروازے کے سامنے کھڑا تھا، مراد علی نے اس سے کہا کہ تم جاؤ اور چچی جان سے کہو کہ میں ان سے ملنا چاہتا ہوں، لڑکا بہت اچھا جناب کہہ کر چلا گا اور مراد علی اپنے کمرے میں داخل ہوا، تھوڑی دیر کے بعد وہ بے چینی کی حالت میں کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔ کہ بلقیس اندر داخل ہوئی اور اس نے کہا کہ بیٹا کیا بات ہے۔ چچی جان تشریف رکھیے وہ ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور مراد علی نے اس کے سامنے دوسری کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا کہ چچی جان معاف کیجئے گا کہ میں نے اس وقت آپ کو یہاں آنے کی تکلیف دی ہے۔ بات یہ ہے کہ میں اب واپس جانا چاہتا ہوں، اگر آپ اجازت دیں تو میں صبح یہاں سے روانہ ہو جاؤں، نہیں بیٹا اتنی جلدی نہ کرو۔ چچی جان میں یہ چاہتا ہوں کہ آپ مجھے خوشی سے اجازت دیں، میں تمہیں مجبور نہیں کر سکتی لیکن کیا تم تھوڑی دیر اور نہیں ٹھہر سکتے، تمہیں یہاں دیکھ کر میں اپنے بہت سے غم بھول گئی تھی، چچی جان آپ جانتی ہیں کہ مجھے یہاں جانے سے خوشی نہیں ہو گی لیکن یہ ایک مجبوری ہے۔ بہت اچھا بیٹا لیکن یہ وعدہ کرو کہ تم ہمیں بھول نہیں جاؤ گے، چچی جان میں آپ کو کیسے بھول سکتا ہوں مراد علی نے مغموم لہجے میں جواب دیا، کچھ دیر تک دونوں خاموش رہے بالآخر مراد علی نے کہا کہ چچی جان میں نے ثمینہ کو یہ گاؤں چھوڑ دینے کے لیے کہا اور ثمینہ مجھ سے ناراض ہو گئی ہے، نہیں بیٹا وہ تم سے ناراض نہیں، وہ جانتی ہے کہ دنیا میں تم سے بڑھ کر ہمارا کوئی ہمدرد اور خیر خواہ نہیں۔ لیکن ابھی تک اس کے دل و دماغ پر اپنے بھائی اور ابا جان کی موت کا گہرا اثر ہے، مجھے یقین ہے کہ کچھ عرصے تک اس کی طبیعت سنبھل جائے گی، مراد علی نے کہا کہ چچی جان مجھے سب سے زیادہ افسوس اس بات کا ہے کہ میں آپ کو سرنگا پٹم آنے کی دعوت نہیں دے سکتا، گزشتہ جنگ کے بعد ہم میسور کے افق

پر ایک نئی جنگ کے آثار دیکھ رہے ہیں، لیکن مجھے یقین ہے کہ ہم اس طوفان سے سرخرو ہو کر نکلیں گے، اور میں کسی دن صرف آپ اور ثمینہ کو ہی نہیں، بلکہ قبیلے کے ہر فرد کو یہ خوشخبری سنانے کے لیے آؤں گا، کہ اب میسور کی سرزمین ہر فرد کے لیے جائے پناہ ہے، مراد علی اور بلقیس کچھ دیر باتیں کرتے رہے، بالآخر بلقیس نے اٹھتے ہوئے کہ کہ بیٹا تم نے صبح کو سفر کرنا ہے، مین صبح تم کو رخصت کرنے آؤں گی، نہیں چچی جان آپ تکلیف نہ کریں میں پچھلے پہر روانہ ہو جاؤں گا، بلقیس کچھ دیر تذبذب کی حالت میں کھڑی رہی، پھر اس نے آبدیدہ ہو کر کہا کہ بیٹا دوبارہ کب آؤ گے، چچی جان اگر میسور کے حالات بہتر ہو گئے تو میں بہت جلد دوبارہ آؤں گا، ممکن ہے کہ میرے ساتھ بھائی اور بھابھی جان بھی ہوں آپ دعا کیا کریں کہ جنگ کا خطرہ ٹل جائے، اپنے بھائی اور بھابھی جان کو میرا اسلام کہنا، بہت اچھا، اچھا بیٹا خدا حافظ ان الفاظ کے ساتھ ہی بلقیس بیگم کی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے، خدا حافظ چچی جان، بلقیس اپنے آنسو پونچھتی ہوئی باہر نکل گئی، چند منٹ کے بعد اس کے کم سن نوکر کمرے میں داخل ہوا، اور اس نے کہا کہ جناب بی بی جان کہہ رہی ہیں کہ آپ علی الصبح یہاں سے روانہ ہو جائیں گے، ہاں میں پچھلے پہر چاند نکلتے ہی یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا، بہت اچھا میں آپ کو جگا دوں گا، مجھے جگانے کی ضرورت نہیں تم باہر نکلتے ہی نوکروں سے کہہ دو کہ میرا گھوڑا تیار کر دیں اور یہ فالتو کپڑے یہاں سے لے جاؤ اور گھوڑے کی خورجین میں ڈال دو، نوکر نے دیوار کی کھونٹیوں سے کپڑے اکٹھے کرنے کے بعد کہا کہ جناب اگر پچھلے پہر آپ کی آنکھ نہ کھلے تو مجھے کیا کرنا چاہیے،،،،،،،، بیگم صاحبہ خفا ہوں گی کہ میں نے آپ کو جگایا نہیں، مراد علی مسکرایا، تم جا کر اطمینان سے سو جاؤ، ـــــــــ لیکن ٹھہرو اس نے اپنی جیب میں ہاتھ ڈال کر ایک اشر

فی نکالی، اور آگے بڑھ کر کچھ کہے بغیر نوکر کی جیب میں ڈال دی، کمسن لڑکے نے سرا پا احتجاج بنتے ہوئے کہا کہ نہیں جناب میں یہ نہیں لوں گا، وہ کیوں، جناب اگر ثمینہ بی بی کو پتا چل گیا تو وہ مجھے جان سے مار ڈالیں گی، مراد علی نے اسے بازو سے پکڑ کر دروازے کی طرف دھکیلتے ہوئے کہ کہ تم فکر نہ کرو ثمینہ بی بی کو پتا نہیں چلے گا، پچھلے پہر مراد علی تیار ہو کر کمرے سے نکلنے کا ارادہ کر رہا تھا کہ دروازے کے باہر کسی کے پاؤں کی آہٹ سنائی دی، پھر آہستہ آہستہ سے دروازے کا ایک کواڑ کھلا اور پھر ثمینہ ایک ثانیہ جھانکنے کے بعد جھجھکتی ہوئی اندر داخل ہوئی، مراد علی چند لمحے تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کھڑا رہا، ثمینہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر کہا کہ آپ جا رہے ہیں، ۔۔۔۔۔۔۔۔ہاں،،،،،،،،،،،،،اور مجھے افسوس اس بات کا ہے کہ میں جانے سے پہلے تمہیں نہیں دیکھ سکوں گا، ثمینہ نے کہا کہ رات امی جان نے مجھے بتایا تھا کہ آپ جا رہے ہیں، اور میں اسی وقت آپ کے پاس آنا چاہتی تھی لیکن پھر سوچا کہ آپ کے آرام کا وقت ہے، ۔۔۔۔۔۔۔۔۔مین آپ کو یہ بتانا چاہتی تھی کہ میں آپ سے خفا نہیں ہوں، مراد علی کا دل اب شکایات کی بجائے تشکر کے جذبات سے مغلوب ہو رہا تھا، اس نے کہا کہ ثمینہ بیٹھ جاؤ میں تم سے ایک ضروری بات کرنا چاہتا ہوں، ثمینہ نے ایک ثانیے کے لیے اس کی طرف دیکھا اور پھر آگے بڑھ کر ایک کرسی پر بیٹھ گئی، مراد علی نے مغموم لہجے میں کہا کہ سرنگا پٹم سے روانہ ہوتے وقت یہ بات میرے وہم و گمان میں بھی نہ تھی کہ میں تمہیں اس حال میں دیکھوں گا، ثمینہ اس وقت ہم ایک ایسے دور سے گزر رہے ہیں جب مستقبل کے متعلق کوئی بھی بات وثوق کے ساتھ نہیں کہی جا سکتی، تاہم میں اس امید کے ساتھ یہاں سے روانہ ہو رہا ہوں کہ جب میں یہاں دوبارہ آؤں گا تو یہاں کے حالات بدل چکے ہوں گے، اور میں

تمہارے چہرے پر ایک بار پھر وہ مسکراہٹ دیکھ سکوں گا جو کئی برس قبل دیکھی تھی، ثمینہ نے کہا کہ میرا خیال تھا کہ آپ چند دن اور یہاں ٹھہریں گے، کاش میسور کے حالات ایسے ہوتے کہ میں باقی تمام عمر اطمینان کے ساتھ یہاں گزار سکتا، لیکن جن فرائض کے احساس نے تمہیں یہاں رہنے پر مجبور کیا ہے وہی مجھے سرنگاپٹم بلا رہے ہیں، تم ایک قبیلے کے سردار کی بیٹی ہو اور میں میسور کے حکمران کا سپاہی ہوں، تمہیں زمین کے ایک چھوٹے سے ٹکڑے کے ساتھ اس لیے محبت ہے کہ اس پر تمہارے باپ اور بھائی کا خون گرا ہے، اور مجھے اس سلطنت کے ساتھ محبت ہے جس کی حفاظت کے لیے میرے دو بھائی اور والد صاحب جانیں دے چکے ہیں، ہم دونوں یکساں بے بس اور مجبور ہیں، لیکن اگر حالات نے اجازت دی تو میں ضرور آؤں گا اور اگر میں یہاں نہ آسکا تو یہ نہ سمجھنا کہ میں تمہیں بھول چکا ہوں، میں آگ اور خون کے طوفان میں کھڑا ہو کر بھی اکبر خان کی بیٹی اور شہباز خان کی بہن کو اپنی دعاؤں میں یاد رکھوں گا، ثمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی لیکن اس کی زبان گنگ ہو چکی تھی، اس نے مراد علی کی طرف دیکھا اور اٹھ کر کھڑی ہو گئی، ایک ثانیے کے لیے زندگی کی تمام حسیات سمٹ کر اس کی آنکھوں میں آ چکی تھیں، پھر اس نے ایک کپکپی لی اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا کہ میں مرتے دم تک آپ کی راہ دیکھتی رہوں گی، مراد علی نے کمرے کے ایک کونے سے اپنی بندوق اٹھا کر خدا حافظ کہا لیکن ثمینہ دوبارہ اس کی طرف دیکھنے کی جرات نہ کر سکی، مراد علی دروازے کی طرف بڑھا۔۔۔۔۔۔۔۔رکا،،،،، پھر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا باہر نکل گیا، ثمینہ کچھ دیر تک بے حس و حرکت کھڑی رہی، پھر آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی کمرے سے باہر نکل گئی، صحن عبور کرتے وقت اس کی آنکھوں کے سامنے پردے حائل ہو چکے تھے، وہ اپنے کمرے میں داخل ہوئی اور

سسکیاں لیتی ہوئی اپنے بستر پر گر پڑی، ثمینہ، ثمینہ کمرے کے دوسرے کونے سے بلقیس بیگم کی آواز سنائی دی، ثمینہ انتہائی کوشش کے اپنی سسکیاں ضبط نہ کر سکی۔ بلقیس اپنے بستر سے اٹھی اور اس کے پاس آ کر بولی کہ ثمینہ کیا ہوا تم رو رہی ہو، ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا کہ امی جان وہ جا چکے ہیں، بلقیس ثمینہ کا سر اپنی گود میں لے کر بیٹھ گئی اور اس کے بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے بولی۔ وہ پھر آئے گا بیٹی، ۔۔

۔۔۔۔۔۔۔۔۔ وہ ضرور آئے گا، ثمینہ نے کہا کہ امی جان، ہاں بیٹی، امی جان آپ غلط کہتی تھیں وہ مجھ سے خفا نہیں تھے، نہیں بیٹی میں نے یہ کہا تھا کہ تمہاری باتوں نے شاید اسے پریشان کر دیا، ڈھائی ماہ کے بعد مراد علی اور غازی خان شاہی محل کے ایک کشادہ کمرے میں چند ملاقاتیوں کے ساتھ بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک افسر داخل ہوا اور اس نے غازی خان کو سلام کرنے کے بعد کہا کہ جناب تشریف لائیے، غازی خان نے مراد علی کی طرف دیکھتے ہوئے کہا کہ تم یہیں ٹھہرو اگر ضرورت پڑی تو تمہیں اندر بلا لیا جائے گا، غازی خان فوجی افسر کے ساتھ کمرے سے باہر نکل گیا، اور مراد علی کچھ دیر پریشانی اور اضطراب کی حالت میں بیٹھا رہا۔ کوئی دس منٹ کے بعد وہی افسر دوبارہ کمرے میں داخل ہوا اور اس نے مراد علی سے مخاطب ہو کر کہا کہا آئیے۔ مراد علی کچھ کہے بغیر اس کے ساتھ چلا دیا، کچھ دیر چلنے کے بعد وہ ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوئے، مراد علی کا رہنما ایک کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کہا کہ آپ اندر تشریف لے جائیں، مراد علی کو یہ امید نہ تھی کہ غازی خان کے ساتھ اسے بھی سلطان کی خدمت میں حاضر ہونا پڑے گا، اس کا اضطراب اب خوف میں تبدیل ہو چکا تھا، وہ جھجکتا ہوا کمرہ کے اندر داخل ہوا، میسور کا حکمران اپنی مسند پر رونق افروز تھا، اور غازی خان اس کے سامنے بیٹھا ہوا تھا، مراد علی نے سلام کیا اور اس کے سامنے کھڑ

اہو گیا، سلطان نے کسی توقف کے بغیر کہا کہ ڈھونڈیا داغ کو تم نے کہاں دیکھا تھا، عا
لی جاہ میں اسے ادھونی کے ایک جنگل میں ملا تھا، تم وہاں کیسے گئے تھے، عالی جاہ
اس علاقے کے ایک خاندان کے ساتھ ہمارے دیرینہ مراسم ہیں، اور میں ان کے پا
س گیا تھا، سلطان نے کلاہ کہ ڈھوندیا داگ ایک خودسر آدمی ہے اور تمہیں غازی بابا کو
میرے پاس اس کی سفارش کے لیے نہیں لانا چاہیے تھا۔ مراد علی کا دل بیٹھ گیا تاہم
اس نے قدرے جرات سے کام لیتے ہوئے کہا کہ عالی جاہ وہ ایک اچھا سپاہی ہے
اور اپنی سابقہ غلطیوں پر پشیمان ہے، داغ ان لوگوں میں سے نہیں جو اپنی غلطیوں پر
پشیمان ہوا کرتے ہیں، عالی جاہ اب میسور کے سوا اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں،
بیٹھ جاؤ۔ سلطان نے ہاتھ سے اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ مراد علی غازی خاں کے قر
یب ایک کرسی پر بیٹھ گیا۔ سلطان کچھ دیر سوچتا رہا بالآخر اس نے کہا۔ میں ایسے لوگون
کو پسند نہیں کرتا جو جذبات سے مغلوب ہو کر سوچتے ہیں، لیکن مجھے اس کی خدمات کا
لحاظ ہے اس وقت وہ کہاں ہے، عالی جاہ وہ ادھونی کی سرحد پر ہماری طرف سے
آپ کے حکم کا انتظار کر رہا ہے، سلطان نے کہا کہ تم اسے ہماری طرف سے یہ پیغام
بھیج دو کہ وہ سرنگاپٹم آسکتا ہے لیکن یہ اس کے لیے آخری موقع ہوگا، اگر اس نے دو
بارہ کوئی غلطی کی تو اسے وہی سزا دی جائے گی جو ایک عام سپاہی کو دی جاتی ہے، ہم
میر نظام علی، انگریزوں اور مرہٹوں کے ساتھ آخری دم تک صلح نبھانا چاہتے ہیں ہمراد
علی کا چہرہ مسرت سے چمک اٹھا اور اس نے کہا کہ عالی جاہ میں داغ کے دو ساتھی
اپنے ساتھ لایا تھا، اگر حکم ہو تو انہیں آج ہی یہ پیغام دے کر واپس بھیج دوں، بہت
اچھا لیکن یہ یاد رکھو کہ اگر داغ نے دوبارہ کوئی غلطی کی تو غازی بابا دوبارہ اس کی سفا
رش لے کر میرے پاس نہیں آئیں گے، عالی جاہ وہ آپنے طرز عمل پر بہت شرمندہ

ہے اور مجھے یقین ہے کہ آئندہ اس سے کوئی غلطی نہیں ہوگی، مراد علی اور غازی اٹھے اور ادب سے سلام کرنے کے بعد کمرے سے باہر نکل آئے، مراد علی نے کہا کہ جناب میں آپ کا بہت شکرگزار ہوں، غازی خان نے بے پروائی سے جواب دیا بیٹا تمہیں شکرگزار ہونے کی کوئی ضرورت نہیں، میں نے تمہارے لیے کچھ نہیں کیا بلکہ اپنی فوج کے لیے ایک بہادر سپاہی کی سفارش کی ہے، ڈھونڈیا داغ کو میری طرف سے بھی یہ پیغام دو کہ میرے دستوں میں ایک تجربہ کار افسر کی جگہ خالی ہے، چھ ہفتے کے بعد سرنگا پٹم میں اس بات کے چرچے ہو رہے تھے کہ ڈھونڈیا داغ واپس آگیا ہے اور اس کے دو سو ساتھیوں کو دوبارہ سلطان کی فوج میں جگہ مل چکی ہے ---

------ پھر چند دن کے بعد یہ خبر سنی گئی کہ ڈھونڈیا داغ مسلمان ہو چکا ہے اور اس کے کئی ساتھی بھی مسلمان ہو چکے ہیں، اور اب اس نڈر سپاہی کو ڈھونڈیا داغ کی بجائے ملک جہان خان کے نام سے پکارا جائے،

چوبیسواں باب

جنگ کے بعد سلطان کی تمام تر توجہ سلطنت کے انتظام اور رعایا کی ترقی اور خوشحالی کے کاموں پر مرکوز ہو چکی تھی، لیکن میر نظام علی نے کرنول کا جھگڑا کھڑا کر کے پھر ایک ناخوشگوار صورت حال پیدا کر دی تھی، ابتداً میں میر نظام علی کو یہ توقع تھی کہ وہ کرنول پر اپنا حق جتانے کے لیے انگریزوں اور مرہٹوں کی تائید حاصل کر سکے گا، لیکن مرہٹے نظام کی خاطر سلطان ٹیپو کے ساتھ بگاڑ پیدا کرنے پر آمادہ نہ ہوئے اور سرجان شور بھی صرف نظام کے فائیدے کے لیے سلطان کے ساتھ الجھنے پر تیار نہ تھا، تاہم میر نظام علی کو اس بات کا یقین تھا کہ اگر وہ کرنول کے علاقے پر زبردست قبضہ کر لے تو سلطان ایک نئی جنگ کے خوف سے سر اٹھانے کی جرات نہیں کرے گا، اور اگر اس مسلئے پر جنگ چھڑ گئی تو انگریز اور مرہٹے اپنی مرضی کے خلاف بھی جنگ میں حصہ لینے پر مجبور ہو جائیں گے ۱۷۹۵ کے آخر میں سلطان پر دباؤ ڈالنے کے لیے میر نظام علی کی فوج نے نقل و حرکت شروع کر دی اور سلطان کی پریشان حال رعایا کو ایک بار پھر میسور کے افق پر جنگ کے بادل دکھائی دینے لگے، لیکن ایک دن میر نظام علی حیرت اور استعجاب کی حالت میں یہ خبر سن رہا تھا کہ پونا سے مرہٹوں کی ٹڈی دل فوج پیش قدمی کر رہی ہے اور اس مرتبہ اس کا رخ سرنگاپٹم کی بجائے حیدرآباد کی طرف ہے، پھر چند دن بعد اسے یہ خبر ملی کہ وحشت و بربیت کا یہ سیلاب دکن کی سرحد عبور کر چکا ہے، میر نظام علی کو بادل نخواستہ میدان میں آنا پڑا، مرہٹوں نے اسے عبرتناک شکست دی اور صلح کے لیے انتہائی توہین آمیز شرائط ماننے پر مجبور کر دیا، وہ مشیر الملک کو یرغمال کے طور پر اپنے ساتھ لے گئے، اور میر عالم اس کی جگہ وزیر اعظم کے عہدے پر فائز ہوا، جنگ سے اختتام کے ایک ہفتے کے بعد میر عالم اور

امتیاز الدولہ نظام کی مسند کے سامنے بیٹھے ہوئے تھے اور میر نظام علی نہایت اضطراب کی حالت میں میر عالم سے مخاطب ہو کر کہہ رہا تھا کہ تم تو کہتے تھے کہ ہم کر نول پر زبردستی قبضہ کر لیں تو مرہٹے اور انگریز ہمارے دیکھا دیکھی میسور کے چند اور علاقوں کا مطالبہ کر دیں گے، پھر جب مرہٹے فوج کی نقل و حرکت کی خبر آئی تو تم مجھے یہ خوش خبری سنا رہے تھے کہ مرہٹے میسور کے کسی علاقے پر قبضہ کرنے کے لیے ہم سے سبقت لے جانا چاہتے ہیں، اس کے بعد جب یہ اطلاع آئی کہ ان کا رخ ہماری طرف ہے تو تم بھی پورے وثوق کے ساتھ یہ کہتے تھے انگریز ہمارے خلاف ان کی کوئی زیادتی برداشت نہیں کریں گے سر جان شور بہت اچھا آدمی ہے، اور وہ مرہٹوں کے حملوں کی خبر سنتے ہی ہمارے لیے فوج روانہ کر دے گا۔ اب تم ایک ہفتے سے ہمیں یہ امید دلا رہے ہو کہ انگریز مرہٹوں کے خلاف ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو جائیں گے تم کیناوے کے ساتھ بات چیت کر رہے تھے، ہم یہ جاننا چاہتے ہیں کہ تمہاری بات چیت کا نتیجہ کب ظاہر ہو گا، میر عالم نے کہا کہ عالی جاہ سر جان کیناوے ابھی حضور کی خدمت میں حاضر ہو جائیں گے، امتیاز الدولہ نے کہ کہ عالی جاہ کیناوے کی حاضری ہماری شکست کا بدلہ نہیں ہو سکتی، وہ زیادہ سے زیادہ یہ کہے گا کہ سر جان شور کو ان واقعات کا بہت افسوس ہے اور میں اس کی زبان سے یہ فقرہ کئی بار سن چکا ہوں، میر عالم نے انتہائی غصے کے عالم میں امتیاز الدولہ کی طرف دیکا اور پھر نظام علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا عالی جاہ دکن پر یہ حملہ مرہٹوں نے سلطان کے ایماء پر کیا ہے، انگریز مرہٹوں کے عزائم سے بے خبر تھے ورنہ وہ ضرور مداخلت کرتے، ہم نے اس جنگ میں بہت نقصان اٹھایا ہے، لیکن اس سے اتنا فائدہ ضرور ہو گا کہ انگریز کرنول پر ہمارا حق تسلیم کرنے پر مجبور ہو جائیں گے، میں کینا

وے سے یہ بات منوا چکا ہوں کہ سلطان ٹیپو در پردہ مرہٹوں کا حلیف بن چکا ہے، امتیاز الدولہ نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا کہ مجھے یقین ہے کہ جب میسور کے ساتھ ایک نئی جنگ لڑنے کے لیے انگریزوں کی تیاریاں مکمل ہو جائیں گی تو وہ میر عالم کی ہر بات ماننے کے لیے تیار ہو جائیں گے، لیکن اس بات کی کیا ضمانت ہے کہ وہ جنگ جیتنے کے بعد میسور کے مفتوحہ علاقوں پر اپنا حق نہیں جتائیں گے، ۔۔۔۔

۔۔۔۔۔۔عالی جاہ میں ایک بار پھر یہ عرض کرتا ہوں، کہ جنوبی ہند میں سلطان ٹیپو کا کوئی دوست نہیں، آج مرہٹے بھی اس حقیقت کو سمجھ چکے ہیں، کہ انھوں نے گذشتہ جنگ میں سلطان ٹیپو کے خلاف انگریزوں کا ساتھ دینے میں غلطی کی تھی، لیکن ہم ابھی تک اپنے دوستوں اور دشمنوں میں تمیز نہیں کر سکے، ۔ایک افسر کمرے میں داخل ہوا اور اس نے کورنش بجالانے کے بعد کہا کہ عالی جان سرجان کیناوے حضور کی خدمت میں حاضر ہونے کی اجازت چاہتے ہیں، انہیں کہو کہ ہم ایک گھنٹے سے ان کا انتظار کر رہے ہیں، افسر فرشی سلام کرنے کے بعد کمرے سے نکل گیا،، چند ثانیے کے بعد سر جان کیناوے کمرے میں داخل ہوا اور میر نظام علی سے مصافحہ کرنے کے بعد میر عالم کے سامنے ایکل کرسی پر بیٹھتے ہوئے بولا، یور ہائی نس مجھے ابھی یہ اطلاع ملی ہی کہ مدارس کی حکومت نے پیشوا اور رنا فرنولیس کو احتجاجی مراسلے بھیج دیے ہیں، امتیاز الدولہ نے کہ کہ جناب ہم آپ کے شکر گزار ہیں، لیکن احتجاجی مراسلوں سے کیا ہوگا، مجھے یقین ہے کہ مرہٹے دوبارہ ایسی جرات نہیں کریں گے، اگر آپ کے احتجاجی مراسلے میں اتنا اثر ہے تو آپ کو جنگ سے پہلے یہ تکلیف کرنی چاہیے تھی، کیناوے نے امتیاز الدولہ کی طرف توجہ دینے کی بجائے

نظام سے مخاطب ہو کر کہا، یور ہائی نس میں آپ کو ایک اور خوش خبری سناتا ہوں

مجھے پونا سے یہ اطلاع ملی ہے کہ مرہٹے سرداروں میں پھوٹ پڑ چکی ہے، امتیاز الدولہ نے پھر کہا کہ مرہٹے سرداروں کی پھوٹ ہماری عزت اور آزادی کی ضمانت نہیں ہو سکتی، وہ کسی وقت بھی متحد ہو سکتے ہیں، ہم صرف یہ جاننا چاہتے ہیں کہ آئیندہ اگر وہ دکن پر حملہ کر دیں تو آپ کا طرز عمل کیا ہو گا، کیناوے نے جواب دیا کہ مجھے یقین ہے کہ مرہٹے دوبارہ ایسا قدم نہیں اٹھائیں گے، میر نظام علی نے کہا کہ مرہٹوں کو ایسے قدم سے باز رکھنے کے لیے ضروری ہے کہ ہمارے درمیان ایک دفاعی معاہدہ ہو جائے اور اگر آپ پسند کریں تو سلطان ٹیپو کو بھی اس معاہدے میں شامل کیا جا سکتا ہے، مرہٹوں نے ہمیں سلطان کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھانے پر مجبور کر دیا ہے، کیناوے نے کہ کہ سلطان ٹیپو آپ کے ساتھ صرف ایک شرط پر معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو گا اور وہ یہ کہ آپ اس کے مقبوضہ علاقے واپس کر دیں، اور میرے خیال میں یہ شرط آپ کے لیے کسی بھی صورت قابل قبول نہیں ہو گی، میر نظام علی سوچ میں پڑ گیا، امتیاز الدولہ نے کہا، اگر سلطان ٹیپو اپنے علاقوں کا مطالبہ کیے بغیر ہمارے ساتھ معاہدہ کرنے پر تیار ہو جائیں تو آپ کا کیا ردعمل ہو گا، کیناوے نے جواب دیا کہ پھر ہمیں سوچنا ہو گا کہ اس معاہدے کے خلاف مرہٹوں کا ردعمل کیا ہو گا،

کمرے میں تھوڑی دیر خاموشی طاری رہی اور نظام انتہائی بے بسی اور اضطراب کی حالت میں کیناوے کے طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر کیناوے نے کہا۔ یور ہائی نس آپ کو ہم پر اعتماد کرنا چاہیے۔ ہمیں یقین ہے کہ مرہٹوں پر ہمارا احتجاج بے اثر ثابت نہیں ہو گا اور اگر وہ راہ راست پر نہ آئے تو ہم پوری دیانت داری سے

آپ کا ساتھ دیں گے۔

میر نظام علی نے کہا لیکن آپ کو ہمارے ساتھ دفاعی معاہدہ کرنے میں کیا اعتراض ہے؟

ہمیں صرف یہ ڈر ہے کہ ایسا معاہدہ مرہٹوں کو برانگیختہ کر دے گا اور وہ ٹیپو کے ساتھ مل جائیں گے۔

نظام نے کہا۔ لیکن اگر ٹیپو ہمارے ساتھ معاہدہ کرنے کے لیے تیار ہو جائے تو پھر آپ کا یہ خدشہ دُور نہیں ہو جائے گا؟

نہیں۔

وہ کیوں؟

وہ اس لیے کہ مرہٹے ہماری نیت پر شک کرنے لگ جائیں گے۔ ہم اس بات کا ذمہ لینے کے لیے تیار ہیں کہ مرہٹے آپ کے ساتھ آئندہ کبھی لڑائی نہیں کریں گے۔ لیکن کمپنی سُلطان ٹیپو کے ساتھ دفاعی معاہدہ کر کے مرہٹوں کے خلاف فریق بننے کے لیے تیار نہیں ہو گی۔

سر جان کیناوے کوئی ایک گھنٹہ میر نظام علی کے ساتھ بحث کرنے کے بعد چلا گیا اور میر نظام نے امتیاز الدولہ سے کہا۔ امتیاز تم آج ہی سُلطان ٹیپو کو یہ پیغام بھیج دو کہ ہم ان کے ساتھ دفاعی معاہدہ کی بات چیت کرنے کے لیے تیار ہیں۔

چند ہفتے بعد ٹیپو کے ایلچی حیدر آباد پہنچ چکے تھے اور میر نظام علی کے ساتھ ان کی طویل ملاقاتیں شروع ہو چکی تھیں۔ سُلطان ٹیپو میر نظام علی کی تمام سابقہ غلطیاں بھول جانے پر آمادگی ظاہر کر چکا تھا۔ لیکن نظام علی سُلطان کی طرف اپنا میلان ظاہر کر کے صرف انگریزوں کی منڈی میں اپنی قیمت بڑھانا چاہتا تھا۔ وہ ایک طرف

سُلطان کے ایلچیوں سے ملاقاتیں کر رہا تھا اور دوسری طرف اس کے جاسوس سرجان کیناوے کو متاثر کرنے کے لیے اس قسم کی افواہیں پھیلا رہے تھے کہ میسور کا حکمران میر نظام علی کو انگریزوں کے خلاف اُکسا رہا ہے اور اس بات کے امکانات پیدا ہو گئے ہیں کہ دکن اور میسور کی حکومتیں مرہٹوں کے علاوہ انگریزوں کے خلاف بھی کوئی دفاعی معاہدہ کر لیں۔ میر نظام علی کی منافقانہ روش زیادہ عرصہ سلطان ٹیپو کو دھوکا نہ دے سکی اور اس نے اپنے ایلچیوں کو واپس بُلا لیا۔



گزشتہ جنگ میں آدھی سلطنت کی آمدنی سے محروم ہو جانے کے باوجود میسور کا عظیم معمار چند سال کے اندر اندر پھر ایک بار ایسٹ انڈیا کمپنی اور اپنے ہمسایہ حکمرانوں کی توجہ اپنی طرف مبذول کر چکا تھا۔ سرنگا پٹم، چتل ڈرگ، بنگلور، بدنور اور میسور کے دوسرے شہروں میں لاتعداد کارخانے قائم ہو چکے تھے۔ ان کارخانوں کی مصنوعات مشرق کی منڈیوں میں یورپ کے مال سے زیادہ مقبول تھیں۔

تجارت کے میدان میں انگریزوں اور فرانسیسیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے سلطان بیرونی ممالک میں تجارت خانے قائم کر رہا تھا۔ میسور کے شہروں میں فرانس، ترکی، عرب، ایران، چین اور آرمینیہ کے کئی تاجر آباد ہو چکے تھے۔ اپنی رعایا کو تجارت کی طرف مائل کرنے کے لیے سُلطان نے حکومت کی نگرانی میں ایک تجارتی کمپنی قائم کی تھی جس میں ہر آدمی حصہ دار بن سکتا تھا۔

اس کمپنی کے قیام کا مقصد امراء کی بجائے معمولی حیثیت کے لوگوں کو زیادہ فائدہ پہنچانا تھا مثلاً جو لوگ اس کمپنی میں پانچ ہزار سے زیادہ روپیہ لگاتے تھے انہیں ہر سال ۱۲ فیصد منافع ملتا تھا۔ اور جو لوگ پانچ ہزار تک لگاتے تھے انہیں ۲۵ فیصد

منافع تھا لیکن

زراعت کے میدان میں بھی سلطنت خُداداد ہندوستان کی دوسری ریاستوں کے مقابلے میں کہیں آگے تھی۔ باقی ریاستوں میں لاکھوں کسان چند بڑے زمینداروں یا جاگیرداروں کے لیے عیش و آرام کا سامان مہیا کرتے تھے لیکن میسور میں نئے نئے زرعی منصوبوں سے جو آراضیات آباد ہوتی تھیں ان پر کاشت کاروں کا حق مقدم سمجھا جاتا تھا اور بڑے بڑے زمینداروں کی فالتو آرضیات بھی کاشت کاروں میں تقسیم کی جارہی تھیں۔

اپنے محدود وسائل سے سُلطان ایک بڑی فوج رکھنے کے قابل نہ تھا۔ تاہم میسور کی تیسری جنگ کے بعد سلطان نے ملک کے دفاعی اور تجارتی ضرورت کے پیش نظر بڑی شدت کے ساتھ اپنے بحری بیڑے کو مضبوط بنانے کی کوشش کی چنانچہ منگلور اور واجد آباد کی گودیوں میں اس نے نئے جنگی اور تجارتی جہاز تعمیر کرنے کا حکم دیا اور ایک قلیل مدت میں میسور کے بحری بیڑے میں بائیس جنگی اور بیس تجارتی جہازوں کا اضافہ ہو چکا تھا اور ان جہازوں کے ماڈل سلطان نے خود تیار کیے تھے۔

میسور کے دشمن سلطان کی آدھی سلطنت چھیننے کے بعد یہ سمجھتے تھے کہ اب وہ دوبارہ سر اٹھانے کے قابل نہیں رہا اور اب اسے اپنی رعایا کے معاشی اور اقتصادی مسائل ہمیشہ پریشان رکھیں گے۔ لیکن وہ یہ دیکھ کر حیران تھے کہ میسور میں پھر ایک بارولولوں کی نئی دنیا آباد ہورہی ہے۔ اہلِ میسور کے وہ زخم جنہیں وہ دائمی ناسور خیال کرتے تھے۔ مندمل ہو چکے تھے۔ وہ قافلہ جسے انہوں نے بھیانک تاریکیوں کی آغوش میں دھکیل دیا تھا، ایک ناقابلِ یقین عزم و استقلال کے ساتھ اپنے روشن مستقبل کی طرف بڑھ رہا تھا۔ انہوں نے جن بستیوں کو ویران کردیا تھا وہ دوبارہ

آباد ہو رہی تھیں میسور کے چرواہے، کسان، مزدور، سپاہی،

بقیہ فٹ نوٹ: سے پانچ سو تک کے حصہ داروں کو ہر سال ۵۰ فیصد منافع دیا جاتا تھا۔ ملک کے پسماندہ طبقے کو سرکاری اعانت کا زیادہ مستحق سمجھنے کا یہ نتیجہ تھا کہ میسور میں ادنیٰ اور اعلیٰ طبقوں میں جو خلا تھا اُسے پُر کرنے کے لیے ایک متوسط طبقہ پیدا ہو رہا تھا۔

تاجر اور صنعت کار پھر ایک بار زبانِ حال سے یہ کہہ رہے تھے کہ میسور ہمارا ہے۔

اور انگریز یہ محسوس کر رہے کہ ہندوستان میں ان کے راستے کا آخری حصار پھر مضبوط ہو رہا ہے۔ اب دلی تک پہنچنے کے لیے یہ ضروری ہے کہ یہ قلعہ ہمیشہ کے لیے مسمار کر دیا جائے۔ سلطان ٹیپو کے خلاف انگریزوں کے نئے جارحانہ عزائم میں کچھ بیرونی محرکات بھی شامل تھے۔ نپولین بونا پارٹ کے عروج کے ساتھ فرانس کے تنِ مُردہ میں ایک نئی روح بیدار ہو رہی تھی۔ اس جواں سال جرنیل کی قیادت میں فرانس کی افواج آسٹریا کے شہنشاہ کو شکست دینے کے بعد اطالیہ پر اپنی فتوحات کے پرچم نصب کر چکی تھیں۔ ایک کمزور اور مفلوج بادشاہت کے خاتمے کے بعد فرانس کو ایک اولوالعزم لیڈر مل چکا تھا۔ نپولین نے ایک ہی یلغار میں یورپ میں طاقت کا توازن درہم برہم کر دیا تھا اور انگریز مشرق و مغرب میں اپنے اقتدار کے لیے ایک نیا خطرہ محسوس کر رہے تھے۔ ان کے لیے یہ سمجھنا مشکل نہ تھا کہ یورپ میں نپولین کے ساتھ اُلجھنے کی صورت میں ان کے لیے اپنے ہندوستانی مقبوضات کی حفاظت مشکل ہو جائے گی اور سلطان ٹیپو اپنی رہی سہی قوت کے ساتھ بھی ان کے لیے ایک خطرہ عظیم بن سکتا ہے۔ چنانچہ سر جان شور کے ریٹائر ہونے کے بعد انہیں ہندوستان

میں اپنے سامراجی مقاصد کو تقویت دینے کے لیے کسی مضبوط اور ہوشیار آدمی کی ضرورت محسوس ہوئی۔ یہ مضبوط اور ہوشیار آدمی جس میں ایک سامراجی بھیڑیے کے تمام خصائل بدرجہ اتم موجود تھے۔ رچرڈ ولزلی (ارل آف مانگٹن) تھا۔



ولزلی گورنر جنرل کے عہدے کا چارج لیتے ہی کسی تاخیر کے بغیر میسور پر دھاوا بولنے کے لیے بے تاب تھا۔ چنانچہ اس نے کمپنی کی افواج کو کارمنڈل اور مالابار کے ساحلوں پر جمع ہونے کا حکم دیا۔ میسور کی خلاف جارحانہ اقدام کے لیے ولزلی کو صرف ایک بہانے کی ضرورت تھی چنانچہ اس نے سلطان ٹیپو پر یہ الزام لگا دیا کہ وہ ایسٹ کمپنی کے خلاف فرانس کے ساتھ سازباز کر رہا ہے اور اس کے سفیر ماریشیس کے گورنر کی وساطت سے فرانسیسی حکومت کے ساتھ ایک دفاعی اور جارحانہ معاہدہ کر چکے ہیں۔ اصل واقعہ صرف یہ تھا کہ نظام اور مرہٹے اپنی فوجی قوت میں اضافہ کرنے کے لیے فرانسیسی سپاہیوں اور افسروں کو بھرتی کر رہے تھے۔ سلطان ٹیپو نے بھی چند تجربہ کار یورپین افسروں کی ضرورت محسوس کی۔ سرنگا پٹم کے دو تاجر اپنے کاروبار کے سلسلے میں ماریشیس جا رہے تھے اور سلطان نے انہیں ہدایت کی کہ اگر ماریشیس سے کوئی کارآمد آدمی ملیں تو انہیں اپنے ساتھ لیتے آئیں۔ ان تاجروں نے ماریشس پہنچ کر وہاں کے فرانسیسی گورنر سے ملاقات کی اور انہیں قریباً ایک سو بے کار آدمیوں کو اپنے ساتھ لانے کی اجازت مل گئی۔ لیکن ان سو آدمیوں میں سے بھی صرف چند ایسے تھے جو تھوڑا بہت فوجی تجربہ رکھتے تھے اور بیشتر وہ قیدی تھے جنہیں ماریشس کی حکومت نے جیلوں سے نکال کر سرنگا پٹم کے تاجروں کے ساتھ جہاز پر سوار کرا دیا تھا۔ لیکن کمپنی نے اس واقعہ کی آڑ لے کر سلطان کے خلاف بہتان تراشی کا ایک

طوفان کھڑا کر دیا۔ کلکتہ، مدراس اور بمبئی سے لے کر لندن تک برطانوی سامراج کے ڈھنڈورچیوں نے یہ افواہ پھیلا دی کہ انگلستان کے خلاف میسور اور فرانس کا معاہدہ ہو چکا ہے۔ ماریشس کے فرانسیسی فوج عنقریب ہندوستان کے ساحل پر اُترنے والی ہے اور سلطان ٹیپو ان کے پہنچتے ہی ایسٹ انڈیا کمپنی کے خلاف اعلان جنگ کر دے گا۔

ماریشس کے واقعات کے بارے میں ولزلی کے علاوہ کئی اور انگریزوں کے مُتضاد بیانات ان بے سروپا الزمات کو جھٹلانے کے لیے کافی ہیں۔ لیکن اگر یہ مان بھی لیا جائے کہ سلطان ٹیپو نے واقعی ماریشس کے گورنر کی وساطت سے فرانسیسی حکومت کے ساتھ کوئی معاہدہ کیا تھا تو بھی کوئی انصاف پسند آدمی انگریزوں کو سلطان پر اعتراض کرنے کا حق نہیں دے سکتا۔ گزشتہ واقعات کی روشنی میں سُلطان کے بدترین دشمن بھی ان پر الزم نہیں لگا سکتے کہ انہوں نے صلح کی شرائط پورا کرنے میں کوئی کوتاہی کی تھی اور انگریزوں کے بہترین وکیل بھی ان کی پے در پے بد عنوانیوں پر پردہ نہیں ڈال سکے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی سرنگا پٹم کے معاہدے کی مضحکہ خیز تاویلوں سے یہ ثابت کر چکی تھی کہ انگریز صلح یا جنگ میں کسی ضابطہ اخلاق کے پابند نہیں۔ ان کی مسلسل بد عہدیوں کے بعد یہ سلطان کا حق ہی نہیں بلکہ فرض تھا کہ وہ ان کا حساب چکانے کا کوئی موقع ضائع نہ کرتا۔ اگر سلطان فرانسیسوں پر اعتماد کر سکتا اور ان کی مدد سے انگریزوں کو اس ملک سے نکال سکتا اور اس کے باوجود ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہتا تو میں اسے اس کی بصیرت اور جذبہ حُریت کی توہین سمجھتا۔ لیکن میسور کا یہ رجلِ عظیم ان لوگوں میں سے نہ تھا جو دانستہ ایک ہی سوراخ سے بار بار ڈسا جانا گوارا کر سکتے

ہیں۔فرانسیسی منگلور کی جنگ میں فیصلہ کن مرحلہ میں اسے دھوکا دے چکے تھے اور اس کے بعد اس نے انگریزوں، مرہٹوں اور میر نظام علی کے ساتھ تمام جنگیں تن تنہا لڑی تھیں۔فرانسیسی حکومت کی بدعہدیوں کے خلاف اس کا ردِعمل اس بات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جنگ سے قریباً ایک سال بعد پانڈی چری کے فرانسیسی گورنر نے انگریزوں کی جارحیت سے مجبور ہو کر سلطان سے امانت کی اپیل کی تھی تو اس نے اس کا خط کا جواب دینے سے انکار کر دیا تھا اور فرانسیسوں کو بحالتِ مجبوری پانڈی چری خالی کرنا پڑا تھا۔

رہا یہ سوال کہ سرنگاپٹم کے تاجر سلطان کے ایما پر ماریشس سے چند آدمی اپنے ساتھ لے آئے تھے تو یہ بات کتنی مضحکہ خیز معلوم ہوتی ہے کہ مرہٹوں اور نظام کی فوج میں تو سینکڑوں فرانسیسی، انگریزوں کے لیے کسی خطرے کا باعث نہ تھے لیکن سلطان ٹیپو نے صرف سو آدمیوں کو اپنی ملازمت میں لے کر ان کے لیے ایک خطرہ پیدا کر دیا تھا۔پھر ان سو آدمیوں میں سے صرف چالیس فرانسیسی تھے اور باقی ماریشس کے مقامی باشندے تھے۔سلطان کی فوج میں کوئی فرانسیسی یا یورپین کسی اہم عہدے پر فائز نہ تھا لیکن میر نظام علی کی فوج کے پندرہ ہزار سپاہی ایک فرانسیسی جرنیل کے ماتحت تھے اور سندھیا کی چالیس ہزار فوج کو ایک فرانسیسی افسر تربیت دے رہا تھا۔

انگریزوں نے ماریشس کے واقعات کے آڑ لے کر دو باتیں مشہور کی تھیں۔ اول یہ کہ نپولین بوناپاٹ مصر اور مشرق وسطیٰ کے دوسرے ممالک کو فتح کرنے کے بعد خشکی کے راستے ہندوستان کا رُخ کرے گا اور سُلطان ٹیپو اس کے ساتھ شامل ہو جائے گا۔دوسرے یہ کہ ماریشس کے گورنر جنرل نے سُلطان ٹیپو کے سفیروں کے ساتھ یہ وعدہ کیا ہے کہ وہ عنقریب تیس چالیس ہزار سپاہی سلطان کی مدد کے لیے بھیج

دے گا۔ انگریزوں کے اپنے بیانات اس بات کو جھٹلاتے ہیں کہ ماریشس میں فرانسیسوں کی اتنی بڑی فوج موجود تھی اور سُلطان ٹیپو جیسے باخبر انسان کے متعلق یہ ماننے کے لیے تیار نہیں کہ اسے ماریشس کے حالات کا صحیح علم نہ تھا۔ دوسری بات اس سے بھی زیادہ مضحکہ خیز ہے۔ سلطان کی عمر کے بیشتر ایام جنگ کے میدان میں گُزرے تھے اور اس کے متعلق یہ باور نہیں کیا جا سکتا کہ اسے مصر اور میسور کے درمیان خشکی کے راستے سفر کی دشواریوں کا صحیح اندازہ نہ تھا۔

انگریزوں نے یہ تمام افواہیں صرف اس لیے پھیلائی تھیں کہ وہ نظام، مرہٹوں اور ہندوستان کے دُوسرے حکمرانوں کو زیادہ سے زیادہ پریشان کر سکیں اور ان پر یہ ثابت کر سکیں کہ سُلطان ٹیپو اور نپولین کے اتحاد کے باعث تمہیں ایک بہت بڑا خطرہ پیش آنے والا ہے۔

سلطان ٹیپو نے ان بے پناہ الزامات کی تردید کی۔ لیکن انگریز جنگ کا بہترین موقع کھونے کے لیے تیار نہ تھے۔ وہ نپولین کے خلاف مشرق، وسطٰی یا یورپ میں سینہ سپر ہونے سے پہلے ہی اس طاقت کے ساتھ نپٹ لینا چاہتے تھے جو ہندوستان میں ان کے لیے خطرے کا باعث ہو سکتی تھی۔

تاہم ولزلی اپنے پلان کے مطابق فوراً جنگ شروع نہ کر سکا۔ مدراش کے گورنر نے اسے یہ اطلاع دی کہ کمپنی کی فوج چھ ماہ سے پہلے جنگ کے لیے تیار نہیں ہو سکتی۔ ولزلی دانت پیس کر رہ گیا۔ پھر جب اسے یہ اطلاع پہنچی کہ جنرل بونا پارٹ کی افواج مصر میں داخل ہو چکی ہیں اور کچھ عرصہ ہندوستان کو اپنی ساری توجہ بحیرہ روم کی طرف مبذول رکھنی پڑے گی تو اس نے سلطان کے خلاف مُعاندانہ طرزِ عمل میں فوراً تبدیلی کی ضرورت محسوس کی۔ اب وہ میسور پر حملہ کرنے کی بجائے سلطان

کے ساتھ ان متنازعہ علاقوں کے بارے میں بھی گفتگو کرنے پر آمادگی ظاہر کر رہا تھا جن پر ایسٹ انڈیا کمپنی سرنگا پٹم کے معاہدے کے خلاف قبضہ جمائے ہوئی تھی۔ اب ترکی کے خلیفہ کی طرف سے سلطان ٹیپو کی خدمت میں اس قسم کے خطوط پیش کیے جا رہے تھے کہ اہلِ فرانس اسلام کی دشمن ہیں اس لیے کسی مسلمان حکمران کو ان کے ساتھ کوئی سروکار نہیں رکھنا چاہیے۔ اگر سلطان کو انگریزوں کے خلاف کوئی شکایت ہے تو ہم ثالثی کے لیے تیار ہیں۔



لارڈ ولزلی کے جارحانہ طرزِ عمل میں اچانک تبدیلی کی ایک اور وجہ یہ بھی تھی کہ اسے لاہور کی طرف زمان شاہ والیء افغانستان کی پیش قدمی کی اطلاع موصول ہو چکی تھی اور وہ یہ خطرہ محسوس کر رہا تھا کہ اگر زمان شاہ دلی پہنچ گیا تو سارے ہندوستان کے مُسلمان انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں گے اور سلطان ٹیپو ان حالات سے بھرپور فائدہ اٹھانے کی کوشش کرے گا۔ سلطان کے سفیر زمان شاہ کے دربار میں موجود تھے اور ان دو مسلمان حکمرانوں کے درمیان دوستانہ خط و کتابت ہو رہی تھی۔ لارڈ ولزلے جس قدر مصر میں نپولین کی موجودگی سے پریشان تھا اس سے کہیں زیادہ لاہور کی طرف شاہ زمان کی پیش قدمی سے خائف تھا۔ ان حالات میں مصلحت کا تقاضا یہی تھا کہ وہ مناسب وقت تک سلطان ٹیپو کے خلاف اپنے جارحانہ عزائم کو دوستی کے دبیز پردوں میں چھپائے رکھے۔

دلی سے زمان شاہ کی توجہ ہٹانے کے لیے انگریزوں نے اپنے ہوشیار جاسوس مہدی علی خاں کی خدمت حاصل کیں۔ مہدی علی خاں ایک ایرانی خاندان سے تعلق رکھتا تھا اور ایسٹ انڈیا کمپنی کی طرف سے بوشر میں رزیڈنٹ کے عہدے پر

فائز تھا۔ ولزلی کی ہدایات پر اس ملت فروش نے ایران کے حکمران کے دربار میں رسائی حاصل کی اور شیعہ سُنی منافرت کا سہارا لے کر اُسے زمان شاہ کے خلاف اس قدر بھڑکا کہ اس نے ایک طرف خراسان پر حملہ کر دیا اور دوسری طرف ہرات کے معزول شدہ گورنر کو فوجی مدد دے کر زمان شاہ کے خلاف بغاوت پر آمادہ کر دیا۔ ان حالات میں زمان شاہ کو دلی کی طرف پیش قدمی کا ارادہ ترک کر کے واپس جانا پڑا۔

مہدی علی خاں کی سازش نے ایک طرف ہندوستان کے مسلمانوں کا آخری سہارا چھین لیا جو گزشتہ چالیس سال سے پانی پت کے میدان میں پھر کسی احمد شاہ ابدالی کا انتظار کر رہے تھے۔ دوسری طرف حیدر آباد، پونا اور اودھ کی طرح شاہِ ایران کے دربار میں ایسٹ انڈیا کمپنی کے اثر و نفوذ کا راستہ کھول دیا۔ مہدی علی خاں نے ایران کے حکمران کو یہ بھی اُمید دلائی کہ انگریز زمان شاہ سے ایران کے کھوئے ہوئے علاقے واپس دلانے میں اس کی مدد کریں گے اور ایران کے حکمران نے خراسان اور ہرات پر اس وقت تک اپنا دباؤ جاری رکھا جب تک کہ انگریز ہندوستان میں اپنے ارادے پورے نہیں کر چکے تھے۔

بحیرہ روم میں نپولین کی جنگی بیڑے کی تباہی اور لاہور سے زمان شاہ کی واپسی کے بعد لارڈ ولزلی کے وہ خدشات دور ہو چکے تھے جن کے پیشِ نظر اس نے میسور پر اچانک دھاوا بولنے کا ارادہ ملتوی کر دیا تھا۔ اب وہ دلی کی طرف ایسٹ انڈیا کمپنی کے راستے کا آخری پتھر ہٹانے کے لیے بیتاب نظر آتا تھا اور سلطان کے ساتھ اس کے دوستانہ لب ولہجہ میں اچانک تبدیلی آ چکی تھی۔

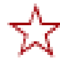
زمان شاہ کی واپسی ہندوستان کی تاریخ کا ایک انتہائی المناک واقعہ ہے۔ ۱۷۶۱ میں جب احمد شاہ ابدالی نے پانی پت کی جنگ لڑی تھی تو مرہٹے اپنے قومی اتحاد

کے باعث ایک عظیم فوج میدان میں لے آئے تھے۔ لیکن اب حالات بدل چکے تھے۔ مرہٹے ایک اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو رہے تھے اور ان میں زمان شاہ کا مقابلہ کرنے کی سکت نہ تھی۔ یہ درست ہے کہ دلی کا مظلوم اور بے بس حکمران شاہ عالم ثانی مہادجی سندھیا کے بعد اب دولت راؤ سندھیا کے ہاتھ میں ایک کھلونا تھا۔ لیکن دلی پر مرہٹوں کے اقتدار کی وجہ ان کی غیر معمولی قوت نہ تھی۔ بلکہ اس کی وجہ یہ تھی کہ دلی کا نام نہاد شہنشاہ اب اس قدر کمزور ہو چکا تھا کہ اسے اپنے تاج کا بوجھ اٹھانا بھی دوبھر ہو رہا تھا۔

دلی کے جنوب مغرب میں راجپوتوں کی ریاستیں بھی اندرونی خلفشار میں مبتلا ہو چکی تھیں۔ ان حالات میں انگریز ہندوستان کے اقتدار کے سب سے بڑے دعویدار بن چکے تھے۔ بنگال، بہار اور اڑیسہ پر ان کا قبضہ تھا۔ اودھ کی یہ حالت تھی کہ وہاں انگریز رزیڈنٹ شجاع الدولہ کے جانشینوں سے زیادہ با اختیار تھا۔ جنوب میں راجہ ٹراونکوران کا باجگذار تھا اور ارکاٹ کا حکمران ایک ایسی لاش تھی جسے انگریزوں نے اپنی سنگینوں کا سہارا دے کر تخت پر بٹھا رکھا تھا۔ پونا اور حیدر آباد کی ریاستیں عملاً ایسٹ انڈیا کمپنی کی سیادت تسلیم کر چکی تھیں۔ ان حالات میں دلی کے تخت و تاج پر قبضہ کرنے کیلیے ایسٹ انڈیا کمپنی کی بے تابی ایک قدرتی بات تھی۔ انگریز اپنے راستے کے کئی پتھر ہٹا چکے تھے لیکن زمان شاہ کی پیش قدمی نے ان کے حوصلے سرد کر دیے تھے۔ وہ یہ جانتے تھے کہ اگر انہیں زمان شاہ کے ساتھ جنگ لڑنی پڑی تو ٹیپو غیر جانب دار نہیں رہے گا اور صرف سلطان ٹیپو ہی نہیں بلکہ ہندوستان کے بیشتر حکمران بالخصوص مرہٹے جنہیں کمپنی کے جارحانہ عزائم کے متعلق اب کوئی غلط فہمی نہیں رہی۔ زمان شاہ کو ایک دشمن کی بجائے اپنا نجات دہندہ سمجھ کر اس کے جھنڈے تلے جمع ہو

جائیں گے۔

مصر کی طرف نپولین کی پیش قدمی اور پنجاب کی طرف زمان شاہ کی یلغار کے ایام میں برطانوی سامراج کے علمبردار اپنی تاریخ کے ایک نازک ترین دور کا سامنا کر رہے تھے لیکن ان دو عظیم خطرات کے دور ہوتے ہی ہندوستان پھر ایک بار ان بھیڑیوں کی شکار گاہ بن چکا تھا۔ ایسٹ انڈیا کمپنی مشرق یا مغرب میں کسی نئے خطرے کا سامنا کرنے سے پہلے میسور پر دھاوا بولنے کے لیے بیتاب نظر آتی تھی۔



ایک دن تیسرے پہر میسور کا دیوان میر صادق سلطان سے ملاقات کے بعد محل سے باہر نکلا تو ڈیوڑھی کے قریب **ملک** جہان خان ڈھونڈیا داغ اس کا راستہ روک کر کھڑا ہو گیا اور ملتجی ہو کر کہا حضور دیوان صاحب میں کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں۔

کیا بات ہے؟ میر صادق نے قدرے برہم ہو کر سوال کیا۔

جناب میں صبح سے یہاں کھڑا ہوں لیکن مجھے سُلطانِ معظم کی قدم بوسی کا موقع نہیں ملا۔ آپ میری مدد کریں۔ میرے لیے ان کی خدمت میں حاضر ہونا اشد ضروری ہے۔

سُلطان معظم ان دنوں سخت مصروف ہیں اور میں تمہاری کوئی مدد نہیں کرسکتا۔

جناب یہ بہت ضروری ہے، خدا کے لیے میرے مدد کیجیے۔

تم میرا وقت ضائع کر رہے ہو۔ میر صادق یہ کہہ کر ڈیوڑھی سے باہر نکل آیا لیکن **ملک** جہاں خاں نے آگے بڑھ کر پھر اس کا راستہ روک لیا اور کہا۔ ٹھہرے جناب میں سُلطان معظم کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ میسور کے خلاف کوئی خطرناک سازش

ہو رہی ہے۔

سازش؟ میر صادق نے چونک کر کہا۔

ہاں جناب میرے پاس ایک خط ہے۔

کس کا خط؟

جناب اس پر کسی کا نام نہیں لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ انگریزوں کے کسی جاسوس نے سرنگاپٹم کے کسی با اثر آدمی کے نام لکھا ہے۔

میر صادق کا چہرہ اچانک زرد پڑ گیا۔ لیکن اس نے فوراً سنبھل کر کہا۔ یہاں باتیں کرنا ٹھیک نہیں تم میرے ساتھ آؤ۔

ملک جہان خاں مذبذب سا ہو کر اس کے ساتھ چل دیا۔ کوئی دس منٹ بعد وہ میر صادق کے ساتھ اس کے خوبصورت مکان کے ایک کمرے میں داخل ہوا۔ میر صادق نے ایک کشادہ میز کے سامنے کرسی پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ بیٹھو اور اطمینان سے میرے ساتھ باتیں کرو؟

ملک جہان خاں نے اس کے سامنے بیٹھتے ہوئے کہا۔ جناب اگر آپ مجھے یہاں لانے کی بجائے سلطان کے سامنے لے جاتے تو یہ آپ کی بہت بڑی نوازش ہوتی۔ یہ معاملہ ایسا ہے کہ ہمیں سلطان کو کسی تاخیر کے بغیر اس طرف متوجہ کرنا چاہیے۔

میر صادق نے جواب دیا۔ سلطان معظم صبح سے کام کر رہے تھے اور اب انہیں تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔ میں شام کے وقت ان سے دوبارہ ملاقات کی کوشش کروں گا۔ اب تم یہ بتاؤ کہ وہ خط تمہاری ہاتھ کیسے لگا؟

جناب میں جنوب مشرق کی سرحدی چوکیوں کی حفاظت پر متعین تھا۔ دو

آدمیوں نے رات کے وقت ایک جگہ سے سرحد عبور کر کے ہمارے علاقے میں داخل ہونے کی کوشش کی تھی۔ پہریداروں نے انہیں روکا۔ لیکن جب انہوں نے بھاگنے کی کوشش کی تو پہریداروں نے گولی چلادی۔ ایک آدمی بچ کر نکل گیا۔ لیکن دوسرا زخمی ہو کر گر پڑا۔ سرحد کے محفوظا سے بیہوشی کی حالت میں میرے پاس لے آئے۔ میں نے اس کی جامہ تلاشی لی تو یہ خط برآمد ہوا۔ کچھ دیر زخمی نے کراہتے ہوئے آنکھیں کھولیں تو میں نے اس سے خط کے متعلق پوچھنے کی کوشش کی۔ وہ میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے کچھ دیر ٹکٹکی باندھ کر میری طرف دیکھتا رہا۔ پھر اچانک اس کی سانس اُکھڑ گئی۔ مرتے وقت اس کے ہونٹ ہل رہے تھے لیکن میں انتہائی کوشش کے باوجود مطلب کی کوئی بات نہ سُن سکا۔ میں یہ خط کر پہلے بنگلور کے فوجدار کے پاس جانا چاہتا تھا لیکن پھر مجھے یہ خیال آیا کہ سُلطان کی خدمت میں حاضر ہونا زیادہ بہتر ہوگا۔

میر صادق نے کہا۔ میں وہ خط دیکھنا چاہتا ہوں۔

ملک جہاں خاں نے قدرے تذبذب کے بعد اپنی جیب سے ایک کاغذ نکالا اور میر اصادق کو پیش کر دیا۔ میر صادق نے کاغذ کھول کر پڑھا اور اس کے چہرے پر پھر ایک بار زردی چھا گئی۔ خط کا مضمون یہ تھا۔

”جناب والا: حامل ہذا ایک قابلِ اعتماد آدمی ہے اور وہ آپ سے تمام ضروری باتیں زبانی عرض کر دے گا۔ آپ نے ہمیں جو ضروری اطلاعات فراہم کرنے کا وعدہ کیا تھا وہ ابھی تک نہیں پہنچیں۔ اب حالات ایسے ہیں کہ آپ کی طرف سے ذرا سی تاخیر بھی ہمارے لیے سخت نقصان دہ ہو سکتی ہے۔ میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ اگر آپ نے وعدوں کا پاس کیا تو آپ کے تمام مطالبات پورے کیے جائیں گے۔

اب آپ کو خط لکھنے کی بجائے زبانی پیغم پر اکتفا کرنا چاہیے۔ اپنے دوسرے ساتھیوں کو میرا اسلام پہنچا دیجیے۔ مجھے آپ کے جواب کا انتظار رہے گا۔

آپ کا دوست‘‘

میر صادق نے کاغذ جہاں خاں کو واپس دیتے ہوئے کہا۔ یہ خط میرے لیے ایک مُعما ہے۔ بہر حال یہ معاملہ سُلطانِ معظم کے سامنے پیش ہونا چاہیے۔ میں داروغہ کو پیغام بھیجتا ہوں لیکن آج وہ اس قدر مصروف ہیں کہ شاید مجھے بھی دوبارہ ان کی خدمت میں حاضر ہونے کا موقع نہ مل سکے۔ اس لیے یہ بہتر ہوگا کہ سُلطان معظم کے ساتھ آج کی بجائے کل ملاقات کی کوشش کی جائے۔

’’لیکن دیوان صاحب یہ مسئلہ بہت نازک ہے اور میں آج ہی واپس جانا چاہتا ہوں۔ میر صادق نے کہا۔ میں نے تمھیں بتایا ہے کہ آج سلطانِ معظم بہت مصروف ہیں اور میں اگر اسی وقت دوبارہ واپس جا کر ان سے ملاقات کے لیے اصرار کردوں تو میرے لیے یہ ضروری ہے کہ میں اس خط کے صحیح ہونے کے متعلق کوئی ناقابلِ تردید ثبوت پیش کرسکوں ورنہ سلطانِ معظم یہ محسوس کریں گے کہ میں نے انہیں خواہ مخواہ پریشان کیا ہے۔

جہان خاں نے کہا۔ دیوان صاحب معاف کیجیے میں آپ کا مطلب نہیں سمجھ سکا۔

میر صادق نے جواب دیا۔ میرا مطلب یہ ہے کہ مجھے یہ خط ایک مذاق معلوم ہوتا ہے۔ ممکن ہے کہ دشمن نے ہمیں پریشان کرنے کے لیے شرارت کی ہو۔ اس میں نہ تو لکھنے والے کا نام ہے اور نہ ہی مکتوب الیہ کی کوئی نشان دہی کی گئی ہے اور میں یہ نہیں چاہتا کہ سُلطان معظم مجھے بیوقوف خیال کریں۔ کل بھی سلطان معظم کے

ساتھ تمہاری ملاقات کا بندوبست کرتے وقت میں اپنی طرف سے اس خط کے صحیح یا غلط ہونے کے متعلق کوئی ذمہ دار نہیں قبول کروں گا۔ میں یہ صرف یہ کوشش کروں گا کہ تمہیں ملاقات کے لیے وقت مل جائے۔ لیکن اگر تم اسی وقت سُلطانِ معظم سے ملنا ضروری سمجھتے ہو تو یہ بہتر ہو گا کہ تم پورنیا کے پاس چلے جاؤ۔ سلطان معظم نے انہیں کسی مسئلے پر کوئی مشورہ دینے کے لیے سہ پہر کے وقت طلب کیا ہے۔ وہ اگر سلطان سے یہ کہہ دیں کہ تم کسی اہم مسئلے پر گفتگو کرنے کے لیے آئے ہو تو ممکن ہے تمہیں آج ہی ملاقات کا وقت مل جائے۔ اگر تم کہو تو میں پورنیا کو اپنی طرف سے ایک رقعہ لکھ دیتا ہوں۔

ملک جہاں خاں نے پریشان ہو کر کہا۔ میں آپ کا شکر گزار ہوں لیکن میں پورنیا سے اس خط کا ذکر نہیں کرنا چاہتا۔

تمہیں یہ معلوم ہونا چاہیے کہ سلطان معظم کے دربار میں پورنیا کا اثر و رسوخ میری نسبت کہیں زیادہ ہے۔

نہیں جناب آپ پورنیا سے اس خط کے متعلق کوئی ذکر نہ کریں میں کل تک انتظار کر سکتا ہوں۔

میر صادق نے غور سے جہاں خاں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم پورنیا کو اعتماد میں لینے سے گھبراتے ہو۔

جناب میرے گھبراہٹ بلاوجہ نہیں۔ مجھے ڈر ہے کہ اگر پورنیان کو اس خط کا پتہ چل گیا تو اس کی کوشش یہی ہو گی کہ۔۔۔۔

جہان خاں اپنا فقرہ پورا کیے بغیر تذبذب اور پریشان کی حالت میں میر صادق کی طرف دیکھنے لگا۔

میر صادق نے ذرا رُعب دار آواز میں کہا۔ تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

”جناب میرا خیال ہے کہ مرتے وقت دُشمن کے جاسوس نے پورنیا کا نام لینے کی کوشش کی تھی۔ میر صادق کے چہرے پر پہلی بار اطمینان کی جھلک دکھائی دی اور اس نے کہا۔ سُلطان کے ایک وزیر پر یہ الزام بہت سنگین ہے اور ان کے سامنے کوئی ایسی بات کہنے کی بجائے تمھیں اپنی جان کے متعلق اچھی طرح سوچ لینا چاہیے۔ تمھیں یقین ہے کہ جاسوس نے دیوان پورنیا کا نام لیا تھا؟“

”جناب اگر مجھے یقین ہوتا تو میں کسی سے مشورہ کیے بغیر اس کا سر کاٹ کر سُلطان کے حضور میں پیش کر دیتا۔ میں یہ دعویٰ نہیں کرتا کہ میں نے اچھی طرح پورنیا کا نام سُنا تھا لیکن مرتے وقت جاسوس کے ہونٹ ہل رہے تھے اور میں نے یہ محسوس کیا تھا کہ وہ پورنیا کا نام لے رہا ہے۔ ممکن ہے کہ یہ سراسر میرا وہم ہو۔

میر صادق نے کرسی سے اُٹھتے ہوئے کہا۔ میں ایک غیر ذمہ دار آدمی کی باتوں پر توجہ دینے کی غلطی کر چکا ہوں لیکن میں کسی مزید حماقت کے لیے تیار نہیں۔ میں تمہارے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ میں کل سُلطان معظم کے ساتھ تمہاری ملاقات کا انتظام کرنے کی کوشش کروں گا۔ اگر تم کل صبح محل کے دروازے پر پہنچ جاؤ تو میں یہ کوشش کروں گا کہ ملاقات کے لیے تمہاری درخواست سلطان کی خدمت میں پہنچ جائے۔ اس کے بعد مجھے اس سے کوئی سروکار نہیں ہوگا کہ تم کیا کہنا چاہتے ہو۔ میں بھی یہ تسلیم نہیں کروں گا کہ تم نے مجھ سے اس خط کا ذکر کیا ہے۔ تم ایک سپاہی ہو اور ممکن ہے کہ تمہارے خلوص سے متاثر ہو کر سُلطانِ معظم تمہاری کوئی غلطی نظر انداز کر دیں ہم میں ایک وزیر ہوں۔

جناب آپ مطمئن رہیں میں سلطان سے آپ کا ذکر نہیں کروں گا۔ مجھے

افسوس ہے کہ غازی بابا سرنگا پٹم سے باہر ہیں ورنہ میں آپ کو پریشان نہ کرتا۔ میں کل شاہی محل کے دروازے پر آپ کا انتظار کروں گا۔

تم کہاں ٹھہرو گے؟

جناب میں سُلطان کی فوج کے ایک افسر کے ہاں قیام کروں گا۔

اس افسر کا نام کیا ہے؟

مُراد علی! **ملک** جہاں خاں یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

میر صادق نے کہا۔ تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے صبح سے کھانا نہیں کھایا ہے؟

جناب میں نے کل شام سے کھانا نہیں کھایا ہے۔ رات بھر میں نے سفر کیا ہے اور صبح سے شاہی محل کی طواف کر رہا ہوں۔

تو بیٹھ جاؤ میں تمہارے لیے کھانا بھیجتا ہوں۔

نہیں جناب آپ تکلیف نہ کریں۔

کیسی تکلیف، سُلطان کے ایک وفادار سپاہی کی خدمت میرا فرض ہے۔ میر صادق یہ کہہ کر اُٹھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

تھوڑی دیر بعد میر صادق کا ایک نوکر **ملک** جہان خاں کو کھانا کھلا رہا تھا اور اس کے دو مُلازم ضروری پیغامات لے کر قمر الدین اور پورنیا کی قیام گاہوں کی طرف بھاگ رہے تھے۔

کھانے کے چند لقمے حلق میں اتارتے ہی **ملک** جہان خاں اپنے دماغ میں ایک غنودگی سی محسوس کرنے لگا۔ پہلے اس نے یہ محسوس کیا کہ یہ غنودگی گئی گھنٹوں کی تھکاوٹ اور بھوک کا نتیجہ ہے۔ لیکن جب اس پر بے ہوشی طاری ہونے لگی تو وہ جلدی سے اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ میر صادق کے نوکر نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے

ہوئے کہا۔ کیا بات ہے جناب آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں؟

میں بالکل ٹھیک ہوں۔ ملک جہان خاں نے ڈوبتی ہوئی آواز میں کہا۔ لیکن دروازے کی طرف چند قدم اٹھانے کے بعد وہ دھڑام سے فرش پر گر پڑا۔

نوکر نے جلدی سے اس کی جیب سے کاغذ نکالا اور باہر نکل کر کمرے کا دروازہ بند کر دیا۔ کچھ دیر بعد میر صادق مکان کے ایک کشادہ کمرے کے اندر ٹہل رہا تھا۔ میر قمر الدین داخل ہوا اور اس نے بغیر کسی تمہید کے کہا۔ میں آپ کا رُقعہ دیکھ کر گھبرا گیا تھا۔ ملک جہان خاں کہاں ہے؟

دوسرے کمرے میں بے ہوش پڑا ہے۔ آپ پہلے یہ خط پڑھ لیں۔ پھر میں آپ سے تمام واقعات بیان کروں گا۔

میر قمر الدین نے میر صادق کے ہاتھ سے خط لے کر پڑھا اور پھر سراسیمگی حالت میں اس کی طرف متوجہ ہو کر بولا۔ یہ خط جہان خاں کے ہاتھ کیسے آ گیا؟

جہاں خاں کے ساتھیوں نے آپ کے ایلچی کو واپسی پر سرحد عبور کرتے وقت قتل کر دیا تھا۔ میر قمر الدین کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ بالآخر اس نے دوبارہ خط کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ لیکن آپ کو یہ کیسے خیال آیا کہ اس خط کی وجہ ہمارے لیے کوئی خطرہ پیدا ہو گیا ہے؟

ایلچی نے مرتے وقت ہمارے ایک ساتھی کا نام ظاہر کرنے کی کوشش کی تھی۔

اور وہ کون تھا؟

پورنیا۔ میں نے اسے بھی پیغام بھیجا ہے لیکن وہ ابھی تک نہیں آیا۔ اب ملک جہان خاں کے متعلق کوئی مناسب بندوبست کرنا آپ کا کام ہے۔ میں نے اسے کھانے میں جو دوائی کھلائی ہے اس کا نشہ دو تین گھنٹے تک زائل ہو جائے گا۔

اپنا سفرِ حیات ختم کر چکا تھا۔

طبیب باہر جانے لگا تو انور علی نے جلدی سے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا۔ مجھے اُمید ہے کہ آپ نے جو باتیں اس کمرے میں سنی ہیں وہ اپنے تک محدود رکھیں گے۔ ملک جہان خاں ایک عرصہ سے لاپتہ ہے ممکن ہے کہ غازی خاں کے قاتل تلاش کرنے کے بعد ہمیں ملک جہاں خاں کا سراغ بھی مل جائے، اگر کوئی آپ سے پوچھے تو آپ صرف یہ کہنے پر اکتفا کریں کہ غازی بابا بیہوشی کی حالت میں وفات پا گئے تھے۔

طبیب نے کہا۔آپ مطمئن رہیں میری طرف سے کوئی بات ظاہر نہیں ہو گی۔

طبیب باہر نکل گیا تو انور علی نے باقی آدمیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔اس سلسلہ میں ہم سب کو انتہائی راز داری سے کام لینا پڑے گا۔غازی بابا کسی خطرناک سازش کے تحت قتل ہوئے ہیں۔وہ ہمارے اجتماع میں شرکت کے لیے آرہے تھے اور انہیں نو بجے یہاں پہنچنا تھا۔ان کی قیام گاہ اور قلعے کے درمیان کوئی دس بارہ منٹ کا راستہ ہے،اس لیے وہ کوئی پونے نو بجے روانہ ہوئے ہوں گے۔اس سلسلہ میں ہمیں کسی قیاس سے کام لینے کی بھی ضرورت نہیں غازی بابا کی روانگی کا وقت ان کی قیام گاہ سے معلوم کیا جا سکتا ہے۔اگر ہو نو بجے سے قبل روانہ ہوئے ہوں تو ہمارے لیے یہ سوال پیدا ہوتا ہے کہ وہ زخمی ہو کر یہاں پہنچنے سے پہلے کوئی ڈیڑھ گھنٹہ کہاں تھے۔ہمیں صرف اتنا معلوم ہے کہ وہ ملک جہاں خاں کی تلاش میں گئے تھے لیکن ہمارے پاس ان سوالات کا کوئی جواب نہیں کہ وہ کس طرف گئے تھے اور ملک جہان خاں کے متعلق انہیں کس نے خبر دی تھی لیکن مجھے یقین ہے کہ معمولی تحقیقات کے بعد اس معاملے کی تہ تک پہنچ جائیں گے۔غازی بابا کوئی غیر معروف

شخصیت نہ تھے۔انہیں سرنگا پٹم کا بچہ بچاہ جانتا ہے۔شہر کے بازاروں یا گلیوں میں چلتے وقت انہیں کسی نے ضرور پہچان لیا ہو گا۔کم از کم رات کے پہریداروں نے انہیں ضرور دیکھا ہو گا۔غازی بابا کو ملک جہاں خاں کے ساتھ بہت زیادہ اُنس تھا۔ ممکن ہے کہ ان کے قاتلوں نے انہیں ورغلانے کے لیے جہاں خاں کے متعلق کوئی فرضی کہانی سنائی ہو۔لیکن اگر ملک جہاں خاں سرنگا پٹم میں موجود ہے تو میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اس کی جان بھی خطرے میں ہے۔کیونکہ میسور کے جن دشمنوں نے غازی بابا کو قتل کیا ہے وہ ملک جہاں خاں کو زندہ چھوڑنے کا خطرہ مول نہیں لیں گے۔بالخصوص اس صورت میں جبکہ انہیں یہ بھی معلوم ہو جائے کہ غازی بابا مرنے سے پہلے ملک جہاں خاں کے متعلق کچھ کہہ گئے ہیں۔اس لیے میں آپ سے یہ درخواست کرتا ہوں کہ ہمیں اس حادثہ کی تحقیقات کے دوران میں انتہائی احتیاط سے کام لینا چاہیے۔

سید غفار نے شفقت سے انور علی کے کندے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔انور! میں تمہیں اس حادثے کی تفتیش کے لیے مکمل اختیارات دیتا ہوں۔



ایک رات منیرہ اپنے کمرے میں تنہا بیٹھی ہوئی تھی۔باہر مختلف اطراف سے لگاتار توپوں اور بندوقوں کے دھماکے سنائی دے رہے تھے۔فضا گندھک اور بارود کے دھوئیں سے متعفن ہو چکی تھی۔خادمہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔بیگم صاحبہ خان صاحب شاید آج بھی نہ آئیں۔اب بہت دیر ہو گئی ہے آپ کا کھانا لے آؤں؟

منیرہ نے جواب دیا۔نہیں مجھے ابھی بھوک نہیں۔تم جا کر سو جاؤ۔اگر وہ آ گئے

تو میں خود کھانا لے آؤں گی۔

خادمہ نے کہا۔ بی بی جی آج دشمن نے سارا دن دم نہیں لیا۔ ان کی توپیں صبح سے آگ برسا رہی ہیں۔ منور کہتا تھا کہ ابھی چند گولے ہمارے پڑوس میں گرے تھے اور ہمارے پاس ہی ایک مکان کی چھت میں شگاف پیدا ہو گئے ہیں۔

منیرہ نے جواب دیا۔ منور نے سب سے پہلے یہ خبر مجھے سنائی تھی اور پڑوس کے مکان کی چھت پر جو گولہ گرا تھا میں نے اس کا دھماکہ سنا تھا۔

خادمہ نے کہا۔ بی بی جی آپ چند نوالے کھا لیتیں تو بہتر ہوتا۔

میں کھا لوں گی تم جاؤ

خادمہ کمرے سے بارہ نکل گئی اور منیرہ کُرسی سے اُٹھ کر دریچے کے سامنے کھڑی ہو گئی۔ تھوڑی دیر بعد وہ بستر پر لیٹ گئی۔ آدھی رات بے چینی کی حالت میں کروٹیں بدلنے کے بعد اس پر نیند کا غلبہ ہونے لگا۔ لیکن اچانک سیڑھیوں پر کسی کے قدموں کی آہٹ سنائی دی وہ بستر سے اٹھ کر کھڑی ہو گئی۔ اس کی نگاہیں دروازے پر لگی ہوئی تھیں اور اس کا سینہ مسرت کے دھڑکنوں سے لبریز ہو۔ انور علی کمرے میں داخل ہوا اور وہ بے اختیار آگے بڑھ کر اس کے ساتھ لپٹ گئی۔ انور علی نے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے تھکی آواز میں کہا۔ منیرہ تم ابھی تک جاگ رہی ہو!

منیرہ نے گردن اٹھا کر اس کیطرف دیکھا۔۔۔ مسکرائی۔۔۔ اور اس کے ساتھ ہی اس کی خوبصورت آنکھوں سے آنسوؤں کے قطرے ٹپک پڑے۔

اس نے کہا تشریف رکھیں میں آپ کے لیے کھانا لاتی ہوں۔

انور علی نے بستر پر بیٹھتے ہوئے کہا۔ میں کھانا کھا چکا ہوں اس وقت مجھے

تھوڑی دیر آرام کی ضرورت ہے۔

آپ کی طبیعت ٹھیک ہے؟ آپ بہت کمزور ہو گئے ہیں۔منیرہ نے کرسی گھسیٹ کر اس کے قریب بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں تھک گیا ہوں منیرہ۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ اگر ہم تمام افسروں پر یکساں اعتماد کر سکتے تو جنگ بہت آسان تھی۔لیکن ہمیں ہر وقت یہ خدشہ رہتا ہے کہ بعض لوگ ہمیں کسی وقت بھی دھوکہ دے سکتے ہیں مجھے گزشتہ تین راتوں میں زیادہ سے زیادہ چھ یا سات گھنٹے سونے کا موقع ملا ہے۔آج میں تھکاوٹ اور نیند سے نڈھال ہو کر گر پڑا تھا اور سید غفار نے مجھے صبح تک گھر میں آرام کرنے کا حکم دیا ہے۔

منیرہ نے کہا۔مجھے یقین ہے نہیں آتا کہ میسور کا کوئی سپاہی سلطان کے ساتھ غداری کر سکتا ہے۔منیرہ ہمیں میسور کے عام سپاہیوں سے کوئی خطرہ نہیں۔وہ مرتے دم تک سلطان کے وفادار رہیں گے۔ہمیں صرف اُونچے طبقے کے ان مفاد پرست لوگوں سے خطرہ ہے جو تاریک گزرگاہوں میں قوم کا ساتھ نہیں دیا کرتے۔

منیرہ نے سوال کیا۔ایسے ناقابلِ اعتماد لوگوں کو فوج سے علیحدہ کیوں نہیں کیا گیا؟

انور علی نے جواب دیا۔منیرہ بعض اوقات ایک غلط وقت پر ایک صحیح اقدام بھی خاطر خواہ نتائج پیدا نہیں کرتا۔ ہمارے تاریخ کے یہ چند دن ایسے ہیں کہ ہم کسی اندرونی انتشار کا خطرہ مول نہیں لے سکتے۔لیکن ہمیں یقین ہے کہ اگر خُدا کا فضل شامل حال رہا تو دو ہفتوں کے اندر اندر جنگ کے حالات ہمارے لیے موافق ہو جائیں گے اور ہم اپنے اندرونی حالات پر پوری توجہ دے سکیں گے۔ابھی تک ہمیں

یہ بھی معلوم نہیں ہو سکا کہ دشمن کے ساتھ سازباز کرنے والے غداروں کی صحیح تعداد کیا ہے۔ تاہم تمہارے اطمینان کے لیے میں یہ بتا سکتا ہوں کہ جن لوگوں کی وفاداری مشکوک ہے انہیں جنگ کے دوران میں کوئی اہم ذمہ داری نہیں سونپی جائے گی۔ پھر جب مناسب وقت آیگا تو ہم ایک ساتھ دو اہم خبریں سنو گی۔ ایک یہ کہ ہم نے دشمن کو پسپائی پر مجبور کردیا ہے اور دوسری یہ کہ ہم نے سرنگا پٹم کے اندر اور سرنگا پٹم سے باہر دوسرے شہروں اور قلعوں میں سلطان کے خلاف ایک خطرناک سازش میں حصہ لینے والے تمام مجرموں کو گرفتار کرلیا ہے۔ یہ بھی ہوسکتا ہے کہ جو غدار ابھی تک ہماری نگاہوں سے پوشیدہ ہیں وہ بدلتے ہوئے حالات میں اپنے آپ کو بڑھ چڑھ کر سلطان کا وفادار ثابت کرنے کی کوشش کریں اور ہم فوج کے اندر بے چینی اور بد دلی کا خطرہ مول لیے بغیر اس سازش کے سرغنوں سے نجات حاصل کرلیں۔

منیرہ نے چند ثانیے کے بعد پوچھا۔ آپ کو یہ یقین ہے کہ چند دنوں تک جنگ کا پانسہ پلٹ جائے گا۔

ہاں منیرہ مجھے یقین ہے۔ وہ سپاہی جنہیں سُلطان ٹیپو جیسا رہنما ملا ہو خدا کی رحمت سے مایوس نہیں ہوسکتے۔ انور علی نے یہ کہہ کر اپنے جوتے اتارے اور ایک جمائی لے کر بستر پر لیٹ گیا۔ منیرہ نے ذرا آگے جھک کر کہا۔ غازی خاں کے قاتلوں کا سُراغ ملا؟

نہیں ابھی تک ہمیں کوئی کامیابی نہیں ہوئی لیکن مجھے یقین ہے کہ اس مرد مجاہد کا خون رائیگاں نہیں جائے گا۔

منیرہ نے کہا۔ میں ابھی آپ کے آنے سے پہلے یہ سوچ رہی تھی کہ اس وقت مراد کہاں ہوگا۔ لاہور سے افغانستان کا رُخ کرنے کے بعد اس نے کوئی اطلاع

نہیں بھیجی۔

مجھے یقین ہے کہ اگر زمان شاہ کے ساتھ اس کی ملاقات ہو گئی تو بہت جلد واپس پہنچ جائے گا۔ انور علی نے یہ کہہ کر آنکھیں بند کر لیں اور چند منٹ بعد وہ گہری نیند سو رہا تھا۔



غروبِ آفتاب سے کچھ دیر قبل اپنے شاندار محل کے ایک کمرے میں ٹہل رہا تھا۔ ایک نوکر نے دروازے سے جھانکتے ہوئے کہا۔ حضور سید صاحب تشریف لاتے ہیں۔

قمر الدین جلدی سے باہر نکلا تو میر معین الدین برآمدے کی سیڑھیوں کے قریب پہنچ چکا تھا۔ قمر الدین نے آگے بڑھ کر اس کے ساتھ مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ آپ نے بہت دیر لگائی میں سخت پریشان تھا۔ ابھی تک ہمارے باقی دوستوں سے بھی کوئی نہیں پہنچا۔

میر معین الدین نے کہا۔ انہیں میر صادق نے یہاں آنے سے منع کر دیا ہے۔

میر قمر الدین پریشانی اور اضطراب کی حالت میں میر معین الدین کی طرف دیکھنے لگا اور معین الدین نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ میر صاحب پریشانی کی کوئی بات نہیں موجودہ حالات میں ہمارا ایک دوسرے سے الگ تھلگ رہنا ضروری ہے۔ ابھی میر صادق کا ایک آدمی میرے پاس یہ پیغام لے کر آیا تھا کہ حکومت کے جاسوس خاص طور پر میرا اور آپ کا پیچھا کر رہے ہیں۔ اس لیے ہمارے باقی ساتھیوں کو ہم سے الگ تھلگ رہنا چاہیے۔ میرا اور آپ کا معاملہ میر صادق، بدر الزمان خان اور میر غلام علی سے مختلف ہے۔ بدر الزمان کے متعلق تو سلطان یہ سننے

کے لیے بھی تیار نہیں ہوگا کہ وہ کوئی بد عہدی کرسکتا ہے۔پورنیا فوجی معاملات میں اپنی نااہلیت اور بے سمجھی کا اعتراف کرنیکے بعد کافی حد تک سلطان کے شبہات دور کر چکا ہے۔لیکن جو افسر براہِ راست ہمارے ماتحت تھے ان پر کڑی نگرانی رکھی جارہی ہے، اگر ہمں ابھی تک گرفتار نہیں کیا گیا تو اس کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ سلطان کے دربار میں بدرالزماں خاں کا اثر ورسوخ کم نہیں ہوا اور ان کا یہ مشورہ مان لیا گیا ہے کہ حالات کی پوری چھان بین سے قبل اس سلسلہ میں کوئی قدم نہ اٹھایا جائے۔

قمرالدین مسکرایا۔سید صاحب ہمارے فوراً گرفتار نہ کیے جانے کی سب سے بڑی وجہ یہ ہے کہ میر صادق کی کوششوں سے غداروں کی فہرست میں کئی ایسے آدمیوں کے نام بھی شامل کردیے گئے ہیں جنہیں میسور کے سپاہی شک وشبہ سے بالاتر سمجھتے ہیں۔آپ یہ سُن کر حیران ہوں گے کہ محکمہ جاسوسی کا ایک بڑا افسر میر صادق کے ہاتھ میں ہے۔

وہ کون ہے؟

یہ مجھے معلوم نہیں۔میر صادق ہمیں تمام باتیں بتانا ضروری نہیں سمجھتا۔اس کے اپنے جاسوس ہر جگہ پھیلے ہوئے ہیں۔اسے سرنگا پٹم کے اندر اور سرنگا پٹم سے باہر ہمارے تمام ساتھیوں کا علم ہے لیکن ہمیں اس کے بیشتر ساتھیوں کے متعلق کوئی علم نہیں۔اسے یہ معلوم ہے کہ انگریز کس دن اور کس وقت سرنگا پٹم پر فیصلہ کن حملہ کریں گے۔فصیل کے کون سے حصے میں شگاف ڈالا جائے گا اور جنرل ہیرس کا راستہ صاف کرنیکے لیے کون سے اقدامات کیے جائیں گے۔

میر معین الدین نے کہا۔مجھے بار بار یہ خیال آتا ہے کہ کہیں ہم نے اتنے

ہوشیار آدمی کو اپنا ساتھی سمجھنے میں غلطی نہ کی ہو۔ اگر جنگ کے حالات بدل گئے تو ایسے ہوشیار آدمی سے یہ بات غیر متوقع نہیں کہ وہ دشمن کی کامیابی سے مایوس ہو کر اپنا مفاد سُلطان کے ساتھ وابستہ کر دے، اگر وہ سلطان کے ساتھ غداری کر سکتا ہے تو ہمیں بھی دھوکا دے سکتا ہے۔ ہمارے خلاف اس کے پاس اتنا مواد ہے کہ وہ جب چاہے ہماری گردن پھانسی کا پھندا ڈال سکتا ہے لیکن ہم اس پر کوئی جُرم ثابت نہیں کر سکیں گے۔

قمر الدین نے جواب دیا۔ سید صاحب جب تک ملک جہاں خاں سرنگا پٹم کے قید خانے میں موجود ہے ہمیں میر صادق سے کوئی خطرہ نہیں۔ اس نے پورنیا کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ملک جہاں خاں کے قتل کی مخالفت کی تھی۔ اب ہماری کوشش یہ ہوگی کہ جب تک ہمارے خدشات دور نہیں ہوتے ملک جہاں خاں کا بال بھی بیکا نہ ہو اور میں نے اس بات کا پورا انتظام کر لیا ہے۔ قید خانے کا داروغہ ہمارے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ میرے پاس ایک ایسی تحریر ہے جو آخری وقت تک میر صادق کی شہ رگ پر خنجر کا کام دیتی رہے گی۔

میر معین الدین دم بخود ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگا اور قمر الدین نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ میرے پاس سلطان کے نام ملک جہاں خاں کی ایک درخواست ہے جس میں اس نے اپنی گرفتاری کے تمام واقعات بیان کیے ہیں۔

یہ درخواست آپ کے پاس کیسے پہنچی؟

میر قمر الدین نے جواب دیا۔ میں نے قید خانے کے داروغہ کو مشورہ دیا تھا اور اس نے ملک جہان خاں سے یہ درخواست لکھوا کر میرے حوالے کر دی تھی۔ اب صورت یہ ہے کہ قید خانے کا داروغہ میر صادق اور میں ایک دوسرے کو دھوکا نہیں

دے سکتے۔ احتیاط کے طور پر اس درخواست کے متعلق پورنیا اور میر صادق کو بھی بتا چکا ہوں۔ ہمارے لیے اپنے تمام ساتھیوں کو اس بات کا یقین دلانا ضروری تھا کہ پھانسی کا پھندا ہم سب کے لیے یکساں تکلیف دہ ہوگا۔

معین الدین نے کہا۔ میر صاحب غازی خاں کا قتل میرے لیے ابھی تک ایک مُعما ہے۔ لیکن میرے لیے یہ معما نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اسے میر صادق کے آدمیوں نے قتل کیا ہے اور اسے قتل کرنے کی وجہ یہ تھی کہ وہ جس قدر ذہین اور تجربہ کار تھا اسی قدر ہمارے لیے خطرناک تھا۔

آپ نے میر صادق سے اس کے متعلق پوچھا ہے؟

نہیں۔ لیکن غازی خاں کے قتل سے پہلے میر صادق نے ایک دن میرے ساتھ جو باتیں کی تھیں ان سے مجھے اندازہ ہوا تھا کہ اس کے آدمی غازی خاں کے پیچھے لگے ہوئے ہیں؟

ستائیسواں باب

مئی ۱۷۹۹ کے آغاز کے ساتھ سرنگا پٹم پر دشمن کی گولہ باری انتہائی شدت اختیار کر چکی تھی۔ میسور کے غدار دفاعی استحکامات کے متعلق دشمن کو تمام ضروری معلومات فراہم کر چکے تھے اور شہر پناہ کے کمزور حصوں پر دشمن کی گولہ باری نسبتاً زیادہ شدید تھی۔ انگریز آہستہ آہستہ اپنی قلعہ شکن توپیں آگے لا رہے تھے اور ان کے پیادہ دستے حملے کے لیے فصیل کے ارد گرد خندقیں کھود رہے تھے قلعے کے بیرونی فصیل نے موروچوں سے دشمن پر اہل سرنگا پٹم کی گولہ باری کافی موثر ثابت ہو سکتی تھی اور انہیں بآسانی پیچھے ہٹایا جا سکتا تھا۔ لیکن جو افسر غدارانِ قوم کے ساتھ مل چکے تھے وہ صرف نمائشی کارگزاری پر اکتفا کر رہے تھے۔ دشمن کو صرف ان مورچوں سے شدید مزاحمت کا سامنا کرنا پڑ رہا تھا جہاں سلطان کے وفادار افسر موجود تھے۔

اس طوفان میں عام سپاہیوں کے حوصلے قائم رکھنا سلطان کے لیے ایک بہت بڑا مسئلہ بن چکا تھا۔ وہ کبھی پیدل اور کبھی گھوڑے پر سوار ہو کر جگہ جگہ دفاعی استحکامات کا معائنہ کرتا وا سے اپنی تھکاوٹ بھوک اور پیاس کا احساس نہ تھا۔ لیکن غدار اپنا کام کر چکے تھے۔ وہ سلطان کو دیکھتے ہی دشمن پر گولہ باری شروع کر دیتے اور جب سلطان کی توجہ کسی دوسرے محاذ پر مبذول ہوتی تو وہ ہاتھ پر ہاتھ دھر کر بیٹھ جاتے۔ سلطان کے وفادار افسر بھی اس صورت حال سے عہدہ بر آ ہونے کے لیے دن رات مصروف رہتے تھے۔ لیکن ان کی ہمت اور ان کا ایثار و خلوص دشمنانِ وطن کے ارادوں کا توڑ ثابت نہ ہو سکا۔ جو افسر میر صادق اور دوسرے غداروں کی ہدایات پر عمل کر رہے تھے وہ نمائشی گولہ باری کے وقت بھی اس بات کی تسلی کر لیتے تھے کہ دشمن کی ان کی توپوں اور بندوقوں کی زد سے باہر ہے۔

۴ مئی کے دن فصیل میں چند شگاف پیدا ہو چکے تھے اور شہر میں جگہ جگہ آگ لگی ہوئی تھی۔ سلطان آدھی رات تک مختلف مورچوں پر گشت کرتا رہا۔ تیسرے پہر اس نے محل میں جانے کی بجائے شمالی دیوار کے ساتھ ہی ایک خیمے میں کچھ دیر آرام کیا۔ صبح کے وقت وہ نماز سے فارغ ہو کر باہر نکلا تو خیمے کے دروازے کے سامنے فوج کے چند افسر اور چند ہندو سادھو اور جوتشی کھڑے تھے، ایک افسر نے آگے بڑھ کر سلام کرتے ہوئے کاہ۔ عالیجاہ! رات کے وقت دشمن کی مسلسل گولہ باری کے باعث شہر پناہ کے جنوب مغربی کونے میں ایک وسیع شگاف پڑ چکا ہے۔

سلطان نے کسی توقف کے بغیر اپنا گھوڑا لانے کا حکم دیا لیکن سرنگا پٹم کے مشہور جوتشی نے ہاتھ باندھتے ہوئے کہا۔ ان داتا آج کا دن آپ کے لیے بہت منحوس ہے۔ اس لیے آپ کو اپنے محل میں قیام کرنا چاہیے۔

سلطان مسکرایا۔ اگر تم مجھے موت سے ڈرانا چاہتے ہو تو تمہیں مایوسی ہوگی۔

نہیں نہیں ان داتا آج آپ باہر نہ نکلیں۔

سلطان نے کہا اس دنیا میں ہر مسافر کی ایک آخری منزل ہوتی ہے اور میں اپنی تقدیر سے بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔

جوتشی نے کہا۔ ان داتا بھگوان آپ کو رہتی دُنیا تک سلامت رکھے لیکن آج آپ دان ضرور کریں۔

سلطان نے پاس ہی ایک سپاہی کے ہاتھ سے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور رکاب پر پاؤں رکھتے ہوئے کہا۔ سونے اور چاندی کے دان کے لیے محل کے داروغہ کو میرا حکم پہنچ چکا ہے لیکن ایک حکمران کا سب سے بڑا دان یہی ہو سکتا ہے کہ وہ اپنی رعایا کی عزت اور آزادی کے لیے اپنے خون کے چند قطرے پیش کر دے۔

سُلطان نے زین پر بیٹھتے ہی گھوڑے کو ایڑ لگادی۔ تھوڑی دیر بعد وہ شگاف کے قریب پہنچ تو انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کا راستہ روک لیا اور گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے کہا۔ عالی جاہ آگے مت جایئے۔

سُلطان نے کہا۔ کیوں کیا بات ہے تم اس قدر بدحواس کیوں ہو؟

انور علی کی طرف سے کسی جواب سے قبل یکے بعد دیگرے توپ کے تین گولے چند قدم دور گرے اور لوہے کا ایک ٹکڑا سُلطان کا بازو چھوتا ہوا نکل گیا۔ بائیں طرف فوج کے افسروں اور سپاہیوں کا ایک ہجوم کھڑا تھا۔ تین آدمی سُلطان کو دیکھتے ہی بھاگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔ ان میں سے ایک بدرالزمان دوسرا میر صادق اور تیسرا یورپین دستوں کا افسر اعلیٰ موسیو چیوئے تھا۔ ان کے نزدیک آنے تک شگاف کے قرب چند اور گولے گرے۔ سُلطان اپنے گھوڑے سے اتر پڑا۔ بدرالزمان خان، میر صادق اور فرانسیسی افسر سلام کرنے کے بعد ادب سے سلطان کے سامنے کھڑے ہو گئے اور فرانسیسی افسر نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔ حضور میں کچھ عرض کرنے کی اجازت چاہتا ہوں۔

کہو!

عالی جان آپ کے جاں نثاروں کے لیے یہ صورت حال بہت پریشان کن ہے۔ اب مجھے یہ کہنے میں تامل نہیں کہ ہماری فوج میں کوئی ایسے غدار ضرور ہیں جو ہمارے مورچوں کے اندر بیٹھ کر دشمن کی رہنمائی کر رہے ہیں۔ یہ قلعے کا سب سے کمزور حصہ ہے اور اس پر مسلسل گولہ باری اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ دشمن سے ہماری کوئی کمزوری پوشیدہ نہیں۔ دشمن چاروں طرف اپنے مورچے اتنے قریب لا چکا ہے کہ وہ کسی وقت بھی سرنگاپٹم پر یلغار کر سکتا ہے۔

ہمارے لیے جنگ کو موسمِ برسات تک طول دینا زندگی اور موت کا مسئلہ ہے لیکن بعض انتہائی ذمہ دار افسروں کے سابقہ کردار کے پیشِ نظر مجھے یہ توقع نہیں کہ ہم زیادہ دیر دشمن کو سرنگا پٹم کی دیواروں سے باہر روک سکیں گے۔ اگر مجھے بزدل یا نمک حرام نہ سمجھا جائے تو میں کہو تم رُک کیوں گئے۔ اگر تم کوئی مفید تجویز پیش کر سکتے ہو تو ہم سُننے کے لیے تیار ہیں۔

عالی جاہ! میرا مشورہ یہ ہے کہ آپ سرنگا پٹم کی بجائے سرائے چتل ڈرگ کو اپنا مستقر بنا کر دشمن کے ساتھ جنگ جاری رکھیں۔ اگر آپ دس ہزار سوار اور پانچ ہزار پیادہ سپاہی اپنے ساتھ لے جائیں تو بھی سرنگا پٹم کی دفاعی قوت میں کوئی خاص کمی واقع نہیں ہوگی۔ سرنگا پٹم کو اگر کوئی خطرہ ہے تو وہ ان غداروں کی طرف سے ہے جن کی سازشوں کے باعث ابھی حضور کے وفادار سپاہوں کو اپنی بہادری کے جوہر دکھانے کا موقع نہیں ملا۔ اگر آپ میری تجویز مانیں تو میں آخری دم تک سرنگا پٹم کی حفاظت کا ذمہ لیتا ہوں۔

میر صادق نے بدرالزمان کی طرف دیکھا اور اس نے کہا۔ عالی جاہ موسیو چیپوئے اور ان کے ساتھیوں کے خلوص اور وفاداری کا مجھے اعتراف ہے لیکن حضور کے سرنگا پٹم سے چلے جانے کے بعد ہمارے سپاہیوں کے حوصلے ٹوٹ جائیں گے۔ مجھے یقین نہیں آتا کہ سرنگا پٹم میں کوئی سازش ہو رہی ہے۔ لیکن ہم میں اگر کوئی نمک حرام موجود ہے تو بھی حضور کو یہاں سے نہیں جانا چاہیے۔ ورنہ ان کے حوصلے بہت بلند ہو جائیں گے۔

میر صادق نے کہا۔ عالی جاہ میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ ہمارے ڈھال اور تلوار صرف آپ کی ذات ہے۔ ہمارے پاس، ہماری توپیں اور بندوقیں یا ہماری

فصیلیں اور خندقیں آپ کی جگہ نہیں لے سکتیں۔

فرانسیسی افسر نے مایوس ہو کر کہا۔ عالی جاہ اگر حضور کو میری یہ تجویز منظور نہ ہو تو میں عرض کرنا چاہتا ہوں کہ انگریزوں کو حضور کے خلاف سب سے بڑی شکایت یہ تھی کہ ہم فرانسیسی جنہیں وہ اپنا بدترین دشمن سمجھتے ہیں آپ کی فوج میں ملازم ہیں۔ اگر ہماری قربانی دے کر آپ دشمن کے ساتھ مصالحت کر سکیں تو میسور کی خاطر میرے تمام ساتھی انگریزوں کی قید میں جانے کے لیے تیار ہیں۔

نہیں سلطان ٹیپو نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ یہ نہیں ہو سکتا۔ میں ان شریف اور بہادر، وفادار ساتھیوں کو دشمن کے حوالے نہیں کر سکتا۔ جو میری دعوت پر اپنا وطن چھوڑ کر یہاں آئے تھے۔ یہ بات میسور کے ایک معمولی سپاہی کے لیے بھی ناقابلِ برداشت ہو گی۔

سُلطان گھوڑے پر سوار ہو کر سپاہیوں کے ہجوم کی طرف بڑھا اور وہ صف بستہ کھڑے ہو گئے۔ سلطان نے ان کے قریب پہنچ کر کہا۔ تم نے اس شگاف کی مرمت کیوں نہیں کی؟

ایک افسر نے جواب دیا۔ عالی جاہ ہم نے پچھلے پہر سید غفار کے حکم سے اس کی مرمت شروع کر دی تھی لیکن میر صاحب کا خیال تھا کہ ہمیں دشمن کی گولہ باری تھم جانے کا انتظار کرنا چاہیے۔

کون سے میر صاحب؟ سلطان نے غصے کے لہجے میں سوال کیا۔

دیوان صاحب عالی جاہ!

سلطان نے مڑ کر پیچھے دیکھا۔ اتنی دیر میں میر صادق اور اس کے ساتھی قریب پہنچ چکے تھے۔ سلطان نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑتے ہوئے میر صادق سے

کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ اس شگاف اور دشمن کی خندقوں کے درمیان زیادہ فاصلہ نہیں۔ اس کے باوجود تم نے انہیں شگاف بند کرنے سے منع کیا ہے؟

عالی جاہ! دشمن کی گولہ باری بہت شدید تھی اور میں نے اپنے سپاہیوں کی جانیں بلاوجہ خطرے میں ڈالنا مناسب خیال نہ کیا۔

سلطان نے کہا۔ چند جانوں کے لیے پورے میسور کی عزت اور آزادی خطرے میں نہیں ڈالی جا سکتی۔ میں حکم دیتا ہوں کہ یہ شگاگ کسی تاخیر کے بغیر بند کر دیا جائے اور باقی افسروں کو حکم دو کہ وہ اپنے اپنے مورچوں میں چلے جائیں۔

بہت اچھا عالی جاہ!

اس کے بعد سلطان نے مشرق کی طرف باگ موڑی اور گھوڑے کو ایڑ لگا دی۔ قریباً تین گھنٹے شہر کے تمام مورچوں کا معائنہ کرنے، افسروں اور سپاہیوں کو ضروری ہدایات دینے اور رات کی لڑائی میں زخمی ہونے والے سپاہیوں کو دیکھنے کے بعد وہ اپنے محل کا رُخ کر رہا تھا۔



دوپہر کے وقت شمالی فصیل کے وسطی حصے پر سخت گولہ باری ہو رہی تھی۔ سید غفار اپنے چند افسروں کے ہمراہ شہر کے مختلف حصوں میں گشت کرتا ہوا وہاں پہنچا اور گھوڑے سے کود کر بھاگتا ہوا ایک بُرج کی طرف بڑھا۔ دائیں طرف سے کسی کی آواز آئی۔ فوجدار صاحب ٹھہریں۔

سید غفار رُک گئے اور سرنگاپٹم کے قید خانے کے داروغہ نے آگے بڑھ کر کہا۔ میں بڑی دیر سے آپ کے پیچھے بھاگ رہا ہوں۔ میں نے جنوبی دروازے کے قریب بھی آپ کا راستہ روکنے کی کوشش کی تھی۔ لیکن آپ میری طرف توجہ دیے بغیر

آگے نکل گئے تھے۔آپ سے پہلے میں سلطان معظم کی خدمت میں حاضر ہونے کی کوشش کر چکا ہوں لیکن مجھے کامیابی نہیں ہوئی۔

پاس ہی فصیل پر ایک گولہ پھٹا اور اینٹوں کے کئی ٹکڑے ادھر اُدھر گر پڑے سید غفار نے کہا۔تم جو کچھ کہنا چاہتے ہو جلدی کہو میرا وقت ضائع مت کرو۔

داروغہ نے کہا۔ جناب قلعے کے جنوب مغربی کونے میں جو بڑا شگاف پیدا ہو چکا ہے آپ کو اس کی طرف فوری توجہ دینی چاہیے۔

تم کو شگاف کے متعلق پریشان نہیں ہونا چاہیے۔آج شام تک وہ بند کر دیا جائے گا۔اور میں نے وہاں کافی سپاہی بھیج دیے ہیں۔میر صادق وہاں موجود ہیں۔ اگر تم کوئی بہتر مشورہ دے سکتے ہو تو ان کے پاس چلے جاؤ۔

سید غفار یہ کہہ کر تیزی سے سیڑھیوں پر چڑھنے لگا اور آن کی آن میں برج پر جا پہنچا۔بُرج کے اندر تین توپیں نصب تھیں اور انور علی دوربین کی مدد سے دریا کے پار دشمن کی نقل و حرکت کا جائزہ لینے کے بعد توپچیوں کو ضروری ہدایات دے رہا تھا۔ سید غفار آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے دوربین پکڑ لی اور آنکھ سے لگاتے ہوئے کہا۔معلوم ہوتا ہے کہ آج دشمن اپنی توپوں کو آگے لے آیا ہے لیکن دریا کے کنارے ان کی خندقوں میں مکمل سکوت ہے۔

انور علی نے کہا۔فصیل کے مشرقی حصے کے سامنے ہم نے دشمن کے بیشتر توپ خانوں کو پیچھے ہٹا دیا ہے۔سید غفار نے دوربین نیچے کرتے ہوئے کہا۔ مجھے پانی دو۔

ایک سپاہی نے اپنی چھاگل اتار کر پیش کر دی اور پانی کے چند گھونٹ پینے کے بعد سید غفار کے تھکے اور مرجھائے ہوئے چہرے پر قدرے تازگی آ گئی۔قید خانے کا

داروغہ سیڑھیوں سے نمودار ہوا اور اس نے آگے بڑھ کر کہا۔ جناب میں آپ سے ضروری بات کہنا چاہتا ہوں۔

سید غفار نے برہم ہو کر کہا۔ میں نے تمہیں میر صادق کے پاس جانے کا مشورہ دیا تھا۔ جناب اگر میں میر صادق سے کوئی بات کر سکتا تو مجھے تمام شہر میں آپ کو تلاش کرنے کی ضرورت نہ تھی۔ اگر میر صادق کو یہ معلوم ہو جائے کہ اس وقت میں آپ کے پاس کھڑا ہوں تو وہ مجھے بات کرنے کا موقع نہیں دے گا۔

تم کیا کہنا چاہتے ہو؟

جناب میں یہ کہنا چاہتا ہوں کہ گزشتہ رات پچھلے پہر ایک انگریز افسر بڑے شگاف کا معائنہ کرنے کے لیے آیا تھا اور میر صادق نے شگاف سے باہر نکل کر اس کے ساتھ راز و نیاز کی باتیں کی تھیں۔

سید غفار پر ایک ثانیہ کے لیے سکتہ طاری ہو گیا۔ پھر اس نے سنبھلنے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ تمہیں معلوم ہے کہ موجودہ حالات میں ایسی خطرناک افواہیں پھیلانے والوں کی سزا موت ہے؟

مجھے معلوم ہے جناب۔ لیکن یہ افواہ نہیں۔ جب میر صادق جنرل ہیرس کے جاسوس سے سرنگا پٹم کا سودا چکا رہا تھا تو وہاں چند افسر موجود تھے اور ان میں سے ایک میرا بیٹا تھا۔

تمہارا بیٹا! سید غفار اور انور علی نے یک زبان ہو کر کہا۔

انور علی اور سید غفار کی طرح توپ خانے کے سپاہی بھی حیرانی اور اضطراب کی حالت میں داروغہ کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سید غفار نے ان میں سے ایک افسر کے ہاتھ میں دُوربین دیتے ہوئے کہا۔ تم اپنا کام جاری رکھو!

انور علی نے داروغہ سے مُخاطب ہو کر کہا۔ آپ کے بیٹے کا نام سلیمان ہے؟

جی ہاں!

وہ یہ گواہی دے گا؟

جی نہیں۔ وہ مر چکا ہے۔ آج نو بجے کے قریب اسے زخمی حالت میں میرے پاس پہنچایا گیا تھا۔ مرتے وقت اس نے یہ درخواست کی تھی کہ میں سُلطان کے پاس جا کر اس کے اور اپنے جرم کا اقبال کر لوں۔ اس نے مجھے بتایا تھا کہ انگریز آج پورے ایک بجے اس شگاف کی طرف سے حملہ کریں گے۔ آپ میر صادق کی غداری پر یقین نہیں کریں گے لیکن میرے پاس اس کا ایک زندہ ثبوت ہے۔ آپ ملک جہان خاں کو جانتے ہیں وہ اس وقت سرنگا پٹم کے قید خانے کی ایک زمین دوز کوٹھڑی میں پڑا ہوا ہے۔ میں نے میر صادق، میر قمر الدین، پورنیا اور معین الدین کے حکم پر اسے قید خانے میں رکھا تھا۔ انہوں نے مجھے اس جرم پر آمادہ کرنے کے لیے ایک معقول رقم دی تھی اور اس کے ساتھ ہی یہ دھمکی دی تھی کہ اگر میں نے یہ راز ظاہر کر دیا تو مجھے موت کے گھاٹ اُتار دیا جائے گا۔

پچھلے دنوں میں اپنے ضمیر کی علامت سے مجبور ہو کر غازی خاں کے پاس اپنا آدمی بھیجا تھا اور انہیں اس واقعے کی اطلاع دینے کی کوشش کی تھی لیکن وہ قید خانے کے راستے میں قتل کر دیے گئے اور میرا آدمی جوان کے ساتھ آرہا تھا ان پر حملہ کے وقت بھاگ آیا تھا۔ قاتلوں کے متعلق مجھے معلوم نہیں کہ وہ کون تھے۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ قتل بھی انہی غداروں کی سازش کا نتیجہ تھا جو غازی بابا کا زندہ رہنا اپنے لیے خطرناک سمجھتے تھے۔ غازی خاں کے قتل کے بعد میں نے اپنا مستقبل پھر انہی لوگوں کے ساتھ وابستہ کر دیا تھا۔ انہوں نے میرے بیٹے کو انگریزوں سے بہت بڑی جاگیر

دلوانے کا وعدہ کیا تھا۔ اب مجھے نہ تو اپنی زندگی سے کوئی دلچسپی ہے اور نہ موت کا ڈر ہے۔ مجھے صرف اس بات کا افسوس ہے کہ یہ انکشاف اب آپ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچائے گا۔ میرے بیٹے نے مرتے وقت یہ بتایا تھا کہ دشمن دوپہر کے وقت ایک بجے عام حملہ کردے گا۔

ایک بجے۔ سید غفار نے جلدی سے اپنی جیب سے گھڑی نکالتے ہوئے کہا۔

اور ایک بجنے میں صرف دس منٹ باقی ہیں۔ تم نے ہمارا اتنا وقت ضائع کردیا۔

سید غفار اور انور علی بھاگتے ہوئے فصیل سے نیچے اترے۔ سوار ابھی تک سیڑھیوں کے سامنے کھڑے تھے سید غفار نے اپنے گھوڑے کی زین پر کودتے ہوئے بلند آواز میں کہا۔ تم فوراً افسروں کو میرا یہ حکم پہنچا دو کہ وہ اپنے تمام فالتو دستے جنوب مغرب کی طرف بڑے شگاف کی حفاظت کے لیے بھیج دیں۔ دُشمن اس طرف سے حملہ کر رہا ہے۔

سید غفار نے اپنے گھوڑے کو ایڑ لگا دی اور انور علی اس کے پیچھے ہولیا۔ باقی سوار گھوڑے دوڑاتے ہوئے ادھر ادھر نکل گئے۔ چند منٹ بعد سید غفار اور انور علی شگاف کے قریب پہنچ چکے تھے لیکن یہ دیکھ کر سید غفار کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی کہ جس جگہ کچھ دیر قبل سلطان کے حکم سے دو ہزار سپاہی متعین کیے گئے تھے۔ وہاں صرف پندرہ بیس آدمی کھڑے تھے۔ آس پاس فصیل کے مورچوں پر بھی سپاہیوں کی تعداد بہت کم معلوم ہوتی تھی۔ سید غفار سپاہیوں کے قریب گھوڑا روکتے ہوئے چلایا۔ باقی آدمی کہاں ہیں؟

ایک سپاہی نے جواب دیا۔ جناب وہ خزانے سے تنخواہیں وصول کرنے گئے ہیں۔

کس کی اجازت سے

جناب دیوان صاحب میر صادق نے حکم دیا تھا۔

سید غفار اور انور علی گھوڑے سے کود کر بھاگتے ہوئے شگاف سے تھوڑی دور ایک سیڑھی کے راستے فصیل پر چڑھے اور دریا کے پار دشمن کی خندقوں کی طرف دیکھنے لگے۔ وہاں کسی نقل و حرکت کے آثار نہ پا کر سید غار نے قدرے مطمئن ہو کر انور علی کی طرف دیکھا اور کہا۔ مجھے داروغہ کے بیان پر یقین نہیں آتا۔ اب ایک بج چکا ہے۔

ادھر دیکھیے۔ انور علی نے جلدی سے ایک طرف ہاتھ کا اشارہ کرتے ہوئے کہا۔

سید غفار نے آنکھیں پھاڑ کر جنوب مشرق کی طرف دیکھا تو ہزاروں انگریز خندقوں اور مورچوں سے نکل کر بے تحاشا فصیل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اس کے ساتھ ہی ایک افسر فصیل پر بھاگتا ہوا آیا اور دور سے ہی سید غفار کو پہنچا کر چلانے لگا۔ جناب دشمن شمال مشرق کے مورچوں سے نکل کر دریا عبور کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔

سید غفار نے انور علی سے کہا۔ انور تم فوراً سلطان کی خدمت میں پہنچنے کی کوشش کرو اور انہیں اس بات پر آمادہ کرو کہ وہ کسی تاخیر کے بغیر سرنگا پٹم سے نکلنے کی کوشش کریں۔ اب دشمن کے ساتھ جنگ جاری رکھنے کی آخری صورت یہی ہے کہ وہ چتل ڈرگ پہنچ جائیں۔ انور بھاگتا ہوا فصیل سے نیچے اترا اور گھوڑے پر سوار ہو گیا۔

☆

خندقوں سے قریباً سو گز آگے حملہ آور فوج کے راستے میں دریا حائل تھا اور دریا کا پاٹ تین سو گز کے قریب تھا۔ موسم گرما کے آغاز سے اب تک بارش کی کمی کے باعث پانی کی گہرائی کسی جگہ ٹخنے اور کسی جگہ کمر کے برابر تھی۔ دریا سے آگے کوئی ساٹھ گز چوڑی خندق تھی اور اس خندق سے آگے فصیل کا شگاف تھا۔ فوجی لحاظ سے دن کے وقت جنرل ہیرس کا یہ حملہ خودکشی کے مترادف تھا اور آس پاس کے برجوں پر مٹھی بھر سپاہیوں کی مزاحمت بھی بڑی سے بڑی فوج کے عزائم خاک میں ملا سکتی تھی لیکن شگاف کے آس پاس فصیل پر جو افسر موجود تھے ان میں سے بیشتر ایسے تھے جو غدارانِ وفن کے ساتھ اپنے ضمیر کا سوادکر چکے تھے۔ سید غفار کی ڈانٹ ڈپٹ اور دھمکیوں سے مرعوب ہو کر انہوں نے فائرنگ شروع کی۔ لیکن ان کی توپوں اور بندوقوں کا کوئی نشانہ ٹھکانے پر نہیں لگتا تھا۔ صرف چند وفادار تھے جو فرض شناسی کا ثبوت دے رہے تھے۔

حملہ آوروں کی ایک ٹولی خندق کے قریب پہنچ چکی تھی۔ سید غفار نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے بندوق چھین کر یکے بعد دیگرے چند فائر کیے اور چند آدمی زخمی ہو کر گر پڑے۔ اس کے ساتھ ہی ایک افسر اور پانچ سپاہی فصیل پر بھاگتے ہوئے شگاف کے قریب ایک مورچے میں داخل ہوئے اور انہوں نے تین غداروں کو موت کی گھاٹ اتارنے کے بعد مورچے کی توپوں پر قبضہ کر لیا اور دشمن پر گولہ باری شروع کر دی۔ اس کے بعد دشمن کے توپ خانے حرکت میں آ گئے اور شگاف کے آس پاس گولے برسنے لگے۔ سید غفار فائر کرنے کے بعد بندوق بھر رہا تھا اور اس کے دائیں بائیں اور آگے پیچھے توپوں کے گولے گر رہے تھے ایک وفادار سپاہی نے آگے بڑھ کر اس کا بازو پکڑتے ہوئے کہا جناب یہاں سے ہٹ جائیں۔

سید غفار نے گرج کر کہا۔ تم میری طرف دیکھنے کی بجائے دشمن کی طرف خیال کرو۔

سپاہی کچھ کہے بغیر پیچھے ہٹ گیا۔ سید غفار نے اپنے دائیں طرف دیکھا تو ایک اور سپاہی چند قدم دور کھڑا اپنی بندوق زمین کی بجائے آسمان کی طرف کیے ہوئے تھے۔

غدار! سید غفار نے غصے سے کانپتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھ ہی بجلی کی سی تیزی کے ساتھ نیام سے تلوار نکالی اور اس کا سر قلم کر دیا۔ پھر وہ بلند آواز میں چلایا! ظالمو تم اگر اب بھی سنبھل جاؤ تو ہم یہ جنگ جیت سکتے ہیں۔ چند منٹ میں فوج کے دس ہزار سپاہی یہاں جمع ہو جائیں گے۔ سلطانِ معظم خود یہاں تشریف لا رہے ہیں۔ خدا کے لیے ان لوگوں کا ساتھ دینے کی کوشش نہ کرو جو ذلت کے چند ٹکڑوں کی عوض تمہیں ہمیشہ کے لیے انگریزوں کا غلام بنا جائیں گے۔ اس کے ساتھ ہی توپ کا ایک گولہ سید غفار کے سر پر لگا اور فصیل پر اس کی لاش دکھائی دے رہی تھی۔

سید غفار کے گرتے ہی کسی نے فصیلہ پر سے سفید جھنڈا بلند کر دیا۔ پھر چند منٹ بعد جب سپاہیوں کے دستے وہاں پہنچے تو انہیں معلوم ہوا کہ دشمن چند منٹ کے اندر اندر اُس دریا، اُس خندق اور اُس فصیل کو عبور کر چکا ہے جو برسوں سے اجنبی اقتدار کا راستہ روکے ہوئے تھی فصیل کے شگاف پر انگریزوں کا جھنڈا اس حقیقت کی گواہی دے رہا تھا کہ جو قوم اپنے آغوش میں غداروں کو پناہ دیتی ہے اس کے عظیم ترین قلعے بھی ریت کے گھروندے ثابت ہوتے ہیں۔

شگاف کے آس پاس پاؤں جمانے کے بعد انگریزوں کی فوج دو حصوں میں تقسیم ہو کر شمال اور جنوب کی فصیل پر یلغار کر رہی تھی اور جو دستے فصیل کے نیچے جمع

ہو رہے تھے انہیں سید غفار کی موت اور میر صادق کی غداری کی اطلاعات نے اس قدر بدر بد دل کر دیا تھا کہ وہ جوابی حملہ کرنے کی بجائے اندرونی فصیل کی طرف بھاگ رہے تھے۔ اندرونی اور بیرون فصیلوں کے درمیان ایک اور خندق تھی جو پانی سے بھری ہوئی تھی۔ یہ خندق اگرچہ بیرونی خندق کی طرح زیادہ چوڑی نہ تھی تاہم اسے عبور کرتے وقت اندرونی فصیل کی حفاظت کرنے والے سپاہیوں کی گولہ باری انتہائی تباہ کن ثابت ہو سکتی تھی۔ لیکن انگریزوں کے چند دستوں نے کسی توقف کے بغیر حملہ کر دیا اور میسور کے سپاہوں کو دائیں بائیں دھکیلنے کے بعد دوسری خندق عبور کر کے اندرونی فصیل کے بعض حصوں پر قبضہ کر لیا۔

انور علی گھوڑا بھگاتا ہوا منتشر سپاہیوں کے قریب گیا اور اس نے ایک عقابی نگاہ سے صورتِ حال کا جائزہ لینے کے بعد بلند آواز میں کہا۔ میسور کے مجاہد و ہمت سے کام لو۔ سُلطان معظم تشریف لا رہے ہیں اور تھوڑی دیر میں ہمارے بیشتر فوج یہاں جمع ہو جائے گی۔ آگے بڑھو اور دشمن کی مزید فوج کو اندر آنے سے روکنے کی کوشش کرو۔ دشمن کے جو دستے قلعے کے اندر داخل ہو چکے ہیں ان پر یہ ثابت کر دو کہ چند گیڈر ہزاروں شیروں کی آزادی کا سودا نہیں کر سکتے۔

انور علی نے یہ کہہ کر گھوڑے سے چھلانگ لگا دی اور تلوار سونت کر انگریزوں کے ایک دستے پر جو اندرونی فصیل کی طرف بڑھ رہا تھا ٹوٹ پڑا۔ جانبازوں کے چند دستوں نے اس کا ساتھ دیا اور انگریز اندرونی خندق کے قریب کئی لاشیں چھوڑنے کے بعد بیرونی فصیل کی طرف ہٹنے لگے۔

لیکن تھوڑی دیر میں انگریزوں کے کئی اور دستے وہاں پہنچ گئے اور میسور کے سپاہی اندرونی خندق کے ساتھ ساتھ مشرق کی طرف ہٹنے لگے۔ میسور کے چند سوار

گھوڑے دوڑاتے ہوئے لڑنے والے سپاہیوں کی عقب میں پہنچے اوران میں سے کسی نے بلند آواز میں کہا۔سپاہیو! دشمن ہمارے بیشتر موروچوں پر قبضہ کر چکا ہے۔ اب بے فائدہ جانیں دینے کی کوشش نہ کرو۔ہتھیار ڈال دو میں تمہاری جانیں بچانے کا ذمہ لیتا ہوں۔

انور علی نے مڑ کر دیکھا۔یہ میر معین الدین تھا اوراس کے ساتھ دوسرا اسوار جو سفید جھنڈا اٹھائے ہوئے تھا۔میر صادق تھا۔تیسرا غدار قمر الدین اپنے ساتھیوں سے چند قدم پیچھے تھا۔انور علی غضبناک ہوکر بلند آواز میں چلایا۔سپاہیو! وہ غدار ہیں جنہوں نے ذلت کے چند ٹکڑوں کے عوض فرنگیوں کے ساتھ تمہاری عزت اور آزادی کا سودا کیا ہے۔اس جنگ میں تمہارے جو بھائی اور بیٹے شہید ہوں گے ان سب کا خون ان کی گردنوں پر ہے۔

انگیریزی فوج کے افسروں نے ان غداروں کو پہچانتے ہی اپنے سپاہیوں کو روک لیا اور ایک ثانیہ کے لیے لڑائی بند ہوگئی۔سرنگاپٹم کے سپاہی تذبذب اور پریشانی کی حالت میں کبھی دشمن اور کبھی میر معین الدین اوراسکے ساتھیوں کی طرف دیکھ رہے تھے۔اچانک میر قمر الدین نے اپنے گھوڑے کی باگ موڑ کر ایڑ لگادی۔ انور علی پھر چلایا۔بیوقوفو اپنے غداروں کو بھاگنے کا موقع نہ دو۔سُلطانِ معظم انہیں موت کے گھاٹ اتارنے کا حکم دے چکے ہیں۔

معین الدین اوراس کے ساتھیوں نے بھی اپنے گھوڑوں کی باگیں موڑ لیں۔ انور علی نے اپنا طپنچہ نکال کر فائر کیا میر صادق کے بازو پر گولی لگی اوراس کے ہاتھ سے سفید جھنڈا گر پڑا۔اس کے ساتھ ہی چند اور ساتھیوں نے بھی فائر کر دیے اور سات آدمی زخمی ہوکر بھاگتے ہوئے گھوڑوں سے گر پڑے۔ایک گولی میر معین

الدین کے گھوڑے کی ٹانگ میں لگی۔ گھوڑا زخمی ہو کر خندق کے قریب گر پڑا اور میر معین الدین زین سے اچھل کر خندق میں جا گرا اس کے ساتھ ہی انگریزوں نے حملہ کر دیا اور انور علی اور اس کے بیشتر ساتھی ان کا سامنا کرنے پر مجبور ہو گئے۔ لیکن چند آدمی بھاگتے ہوئے میر معین الدین کی طرف بڑھے۔ وہ خندق سے نکل کر بھاگا۔ لیکن ایک نوجوان نے اسے مشرقی دروازے سے کچھ فاصلے پر جا لیا۔ میر معین الدین چلایا۔ خدا کے لیے مجھے چھوڑ دو میں نے کوئی غداری نہیں کی۔ میں صرف تم لوگوں کو تباہی سے بچانا چاہتا تھا۔ میں تمہارا وزیر ہوں۔ میں تمہارے سلطان کا خادم ہوں۔ میں۔۔۔۔

میر معین الدین اپنا فقرہ پورا نہ کر سکا۔ سپاہی کی تلوار اس کے سر پر لگی اور وہ زمین پر گر کر تڑپنے لگا۔ اس عرصہ میں تین سوار میر قمر الدین اور میر صادق کے پیچھے روانہ ہو چکے تھے۔

سلطان اپنے باڈی گارڈ دستوں کے ساتھ نمودار ہوا اور اسے دیکھتے ہی شمال کی اندرونی اور بیرونی فصیلوں کے درمیان لڑنے والے مجاہدین میں زندگی کی ایک نئی لہر دوڑ گئی۔ اور وہ دشمن پر ٹوٹ پڑے، سلطان اپنے گھوڑے سے کود کر ان کی اگلی صف میں پہنچ گیا۔ تھوڑی دیر میں مختلف اطراف سے میسور کے کئی دستے اس کے گرد جمع ہو کر جان کی بازی لگا رہے تھے۔ لیکن اس دوران میں انگریزوں نے دونوں فصیلوں کے درمیان کئی مورچوں پر قابض ہو چکے تھے اور بلندی سے ان کی گولیاں سلطان کے جانبازوں کے لیے سخت مشکلات پیدا کر رہی تھیں۔

۔ وہ افسر جو وطن کے غداروں کے ساتھ اپنا مستقبل وابستہ کر چکے تھے اس محاذ سے غیر حاضر تھے لیکن یہ مسئلہ اب میسور کے جانبازوں کے لیے کسی پریشانی کا

باعث نہ تھا۔ ان کی عزت اور آزادی کا محافظ ان کے ساتھ تھا۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ دشمن چند منٹ کے اندر اندر ہفتوں اور مہینوں کا سفر طے کر کے سرنگا پٹم میں داخل ہو چکا ہے۔ وہ یہ بھول چکے تھے کہ ان پر گولیوں کی بارش ہو رہی ہے۔ وہ اس حقیقت سے بے خبر نہ تھے کہ وہ عظیم رہنما جس نے ان کے سینوں میں زندگی کے ولولے بیدار کیے تھے اب موت کے دروازے پر دستک دے رہا تھا۔ لیکن اب موت کا چہرہ انہیں زندگی سے زیادہ حسین اور دلکش دکھائی دیتا تھا سلطان ٹیپو زخمی ہو چکا تھا اور وہ اپنے سینوں کے زخموں سے بھی ایک طرح کی آسودگی محسوس کرتے تھے۔ سلطان کا خون سرنگا پٹم کی خاک پر گر رہا تھا اور وہ اس خاک کے ہر ذرے کو اپنے خون سے سیراب کر دینا چاہتے تھے۔

دوسری گولی لگنے کے بعد شیرِ میسور پر نقاہت کے آثار ظاہر ہونے لگے، لیکن وہ لڑتا رہا۔ میسور کے جانباز زندگی اور موت سے بے پروا ہو کر اس کا ساتھ دے رہے تھے۔ اندرونی خندق کے آس پاس دشمن کی لاشوں کے ڈھیر لگے تھے۔ سینکڑوں انگریز زخمی ہونے کے بعد خندق میں گر کر دم توڑ رہے تھے۔ فصیلوں کے اوپر سے دشمن کی دوطرفہ فائرنگ ہر لحظہ شدت اختیار کرتی جا رہی تھی۔ میسور کے شہیدوں کی تعداد ہزاروں تک پہنچ چکی تھی۔ جب زخموں کے باعث سُلطان کی ہمت جواب دینے لگی تو باڈی گارڈ دستے کے افسر نے کہا۔ عالی جاہ اب اس کے سوا کوئی چارہ نہیں کہ اپنے آپ کو دشمن کے حوالہ کر دیں۔

نہیں۔ سُلطان نے فیصلہ کن انداز میں جواب دیا۔ میرے لیے شیر کی زندگی کا ایک لمحہ گیدڑ کی ہزار سالہ زندگی سے بہتر ہے۔

تھوڑی دیر بعد سلطان اپنے افسروں کے ساتھ دوبارہ گھوڑے پر سوار ہو گیا اور

میسور کے سپاہی اس کے پیچھے قلعے کے اندرونی حصے کی طرف سمٹنے لگے۔ لیکن جب وہ شمالی دروازے کے قریب پہنچا تو اسے معلوم ہوا کہ وہاں بھی بعض مورچوں پر دشمن کا قبضہ ہو چکا ہے۔ مسلح سپاہیوں کے علاوہ بچوں، بوڑھوں اور عورتوں کا ایک بے پناہ ہجوم باہر نکلنے کے لیے جدوجہد کر رہا تھا اور انگریزی سنگینوں کی مدد سے انہیں پیچھے ہٹنے پر مجبور کر رہے تھے۔ انہوں نے میسور کے سپاہیوں کو دروازے کی طرف آتے دیکھا تو پلٹ کر فائرنگ شروع کر دی۔ اس کے ساتھ ہی قعلے کی فصیل کے بعض مورچوں سے بھی گولیوں کہ بارش ہونے لگی۔ ایک گولی سلطان کے گھوڑے کے پیٹ میں لگی اور اس نے گرتے ہی دم توڑ دیا۔ گھوڑے کے ساتھ گرتے وقت سلطان کی دستار اس کے سر سے علیحدہ ہو گئی۔ سلطان لڑکھڑاتا ہوا اُٹھا لیکن ابھی وہ سنبھلنے نہ پایا تھا کہ اس کے سینے پر گولی لگی اور وہ نیم جان ہو کر گر پڑا۔ پاس ہی ایک انگریز نے سلطان کی کمر سے تلوار کی مرصع پیٹی اتارنے کی کوشش کی لیکن شیرِ میسور میں ابھی زندگی کے چند آخری سانس باقی تھے اور وہ یہ توہین برداشت نہ کر سکا۔ سلطان نے اچانک اُٹھ کر تلوار بلند کی اور پوری قوت کے ساتھ اس پر وار کر دیا۔ انگریز نے اپنی بندوق آگے کر دی۔ سُلطان کی تلوار بندوق پر لگی اور ٹوٹ گئی۔ اس کے ساتھ ہی ایک اور انگیریز سپاہی نے اپنی بندوقت کی نالی کا سرا سلطان کی کنپٹی کے ساتھ لگاتے ہوئے فائر کر دیا اور وہ آفتاب جس کی روشنی میں اہلِ میسور نے آزادی کی حسین منازل دیکھی تھیں۔ ہمیشہ کے لیے رُوپوش ہو گیا۔



انور علی نے سُلطان کو اس وقت گرتے دیکھا تھا جب کہ اس کی بائیں ران پر گولی لگ چکی تھی اس کے ساتھی دروازے کے قریب انگریزوں کے ساتھ گُتھم گُتھا

ہو چکے تھے۔وہ چند سپاہیوں کو موت کی گھاٹ اتارنے کے بعد سلطان کی لاش کے قریب پہنچا تو فصیل سے ایک گولی اس کے سر پر لگی اور وہ ایک ثانیہ لڑکھڑانے کے بعد منہ کے بل گر پڑا۔اس عرصہ میں سُلطان شہید کی لاش پر چند جانبازوں کی لاشیں گر چکی تھیں۔اور انور علی کو نیم بے ہوشی کی حالت میں صرف اس کے پاؤں دکھائی دے رہے تھے۔وہ رینگتا ہوا آگے بڑھا اور اپنا سر سلطان کے پاؤں پر رکھ دیا۔گولی کھوپڑی کے اوپر سے پھسل جانے کے باعث سر کا زخم زیادہ گہرا نہ تھا۔اس سے قبل ٹانگ کے زخم سے خون بہنے کے باعث اس کے جسم میں کافی نقاہت آ چکی تھی۔اس نے ہوش میں آتے ہی اُٹھنے کی کوشش کی لیکن یکے بعد دیگرے چند اور جانباز زخمی ہو کر اس کے اُوپر گر پڑے۔

کچھ دیر بعد وہ بڑی مشکل سے لاشوں کے انبار سے نکلا تو میدان صاف ہو چکا تھا اور انگریزی فوج کے دستے دروازے کے سامنے دور دور تک بکھری ہوئی لاشیں روندتے ہوئے اندر داخل ہو رہے تھے۔انور علی دوبارہ آنکھیں بند کر کے لیٹ گیا اور کچھ دیر دم سادھے پڑا رہا۔شہر کے دوسرے حصوں میں لوگوں کی چیخ و پکار یہ ظاہر کر رہی تھی کہ ابھی تک اہلِ میسور کا قتلِ عام جاری ہے۔

سُلطان شہید ہو چکا ہے۔ہماری آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔چند آدمیوں کی غداری کے باعث آج میسور کے کتنے بیٹے موت کے گھاٹ اتار دیے جائیں گے۔آج میسور کی کتنی بیٹیوں کی عصمت پر ڈاکے ڈالے جائیں گے کتنی عورتیں بیوہ اور کتنے بچے یتیم ہو چکے ہیں۔میرے بات،میرے بھائی اور میرے بے شمار دوستوں اور ساتھیوں کی قربانیوں کی ------ ہے؟ صرف چند گھنٹے قبل ہم ایک آزاد وطن کے مالک تھے۔ہم اپنے ماضی پر فخر کر سکتے تھے اور ہمارے دلوں

میں حال کے مصائب سے لڑنے کی ہمت تھی۔ ہم اپنے مستقبل کے متعلق حسین سپنے دیکھ سکتے تھے اور اب ہمارا ماضی، ہمارا حال اور ہمارا مستقبل سب لاشوں کے اس انبار کے نیچے دفن ہو چکا ہے۔ سُلطان فتح علی ٹیپو شہید نہیں ہوا بلکہ ہم سب مر چکے ہیں۔ جس خاک پر سُلطان ٹیپو کا خون گرا ہے، ہماری آئندہ نسلیں تا قیامت اسے اپنے آنسوؤں سے سیراب کرتی رہیں گی۔ آج کے بعد میسور کا آفتاب ہمارے چہروں پر مسرت کی مسکراہٹیں نہیں دیکھے گا۔ میسور کی ہواؤں کی سرسراہٹ ہمارے سپنوں میں آزادی کے نغمے بیدار نہیں کرے گی۔ جس قوم کے اکابر نے سُلطان ٹیپو جیسے مُحسن کو دھوکا دیا ہے اسے کارکنان قضاوقدر و رحم اور مُروت کا مستحق نہیں سمجھیں گے۔ انور علی اپنے دل میں اس قسم کے خیالات لے کر اُٹھا اور لڑکھڑاتا ہوا ایک طرف چل دیا۔ غیر شعوری حالت میں اس کے پاؤں اپنے گھر کی طرف اٹھ رہے تھے۔ کسی مکان سے چند عورتوں کی چیخیں سنائی دیں اور اس کی رفتار تیز ہونے لگی۔ اس کے تمام خیالات سمٹ کر منیرہ پر مرکوز ہو چکے تھے۔ سرنگاپٹم کی فضا میں اسے ہر چیخ منیرہ کی چیخ محسوس ہو رہی تھی۔ اچانک اسے خیال آیا کہ وہ اپنی تلوار لاشوں کے انبار میں چھوڑ آیا ہے۔ سامنے چند سپاہیوں کی لاشیں پڑی ہوئی تھیں۔ اس نے جلدی سے جھک کر ایک سپاہی کی تلوار اٹھالی۔ اب گھر تک پہنچنا اس کے لیے زندگی کا اہم ترین مسئلہ بن چکا تھا اور وہ دشمن کی نگاہوں سے بچنے کے لیے ایک تنگ گلی میں داخل ہو گیا۔

میسور کے سپاہی افراتفری کی حالت میں اِدھر اُدھر بھاگ رہے تھے۔ چند نوجوان انور علی کو پہچان کر اس کے گرد جمع ہو گئے۔ ایک آدمی، انور علی، انور علی کہتا ہوا آگے بڑھا اور اسے بازو سے کھینچتا ہوا قریب ہی ایک مکان کی ڈیوڑھی میں لے

گیا۔ یہ قید خانے کا داروغہ تھا۔ انور علی چلایا۔ مجھے چھوڑ دو تم مجھے کہاں لے جا رہے ہو؟

داروغہ نے کہا۔ آپ کے زخموں سے خون بند کرنا ضروری ہے۔

انور علی کے احتجاج کے باوجود داروغہ اور اس کے ساتھیوں نے اُسے زبردستی ایک کھاٹ پر لٹا دیا اور ایک سپاہی کا ٹپکا اتار کر اس کے زخموں پر پٹیاں باندھ دیں۔

آپ کے سر کا زخم زیادہ تشویشناک نہیں لیکن ٹانگ کا زخم بہت گہرا ہے۔ میں آس پاس کسی طبیب کو تلاش کرتا ہوں۔

انور علی کرب کی حالت میں اُٹھ کر چلایا۔ میرے پاس طبیب کا انتظار کرنے کے لیے وقت نہیں۔ داروغہ نے کہا۔ اگر آپ سلطانِ معظم کو تلاش کرنا چاہتے ہیں تو آپ کی کوشش بے سُود ہے۔ شہر میں یہ افواہ گرم ہے کہ وہ سرنگا پٹم سے نکل گئے ہیں۔

یہ جھوٹ ہے۔ انور علی نے کہا۔ میں نے انہیں اپنی آنکھوں سے شہید ہوتے ہوئے دیکھا ہے۔ انور علی کے گرد جمع ہونے والے آدمیوں کے چہرے پر مایوسی چھا گئی۔ اندر سے ایک عمر رسیدہ عورت دھاڑیں مارتی ہوئی ڈیوڑھی میں داخل ہوئی اور اس نے کہا۔ سلطانِ معظم شہید ہو گئے ہیں اور تم ایک دوسرے کا منھ دیکھ رہے ہو۔ کاش میرا بیٹا آج زندہ ہوتا۔

داروغہ نے کہا۔ میری بہن اب ہم کچھ نہیں کر سکتے۔ اگر سلطان شہید ہو چکے ہیں تو ہمارے تلواریں ٹوٹ چکی ہیں اور ہمارے بازو کٹ چکے ہیں۔

گلی میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔ ایک سپاہی نے نیم وا دروازے سے جھانک کر باہر دیکھا اور پھر جلدی سے دروازہ بند کرتے ہوئے کہا۔ یہ نظام علی کی

فوج کے سپاہی ہیں۔

انور علی اور اس کے ساتھی تھوڑی دیر دم بخود ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھتے رہے بالآخر جب سوار آگے نکل گئے تو ایک سپاہی نے آہستہ سے دروازہ کھولا اور باہر جھانکنے کے بعد کہا۔ وہ چلے گئے ہیں۔

انور علی نے داروغہ سے مخاطب ہو کر کہا۔ تم نے ملک جہان خاں کے متعلق کیا کیا ہے؟ کچھ نہیں داروغہ نے جواب دیا۔ ابھی تک قید خانے کی طرف نہیں جا سکا۔ میں میر صادق کی تلاش میں تھا۔ میرا خیال تھا کہ ایک غدار کو ٹھکانے لگا کر شاید میں اپنے گناہوں کو بوجھ ہلکا کر سکوں لیکن مجھے یہ سعادت بھی نصیب نہ ہو سکی۔ میں نے میر صادق کی بجائے اس کی لاش دیکھی ہے۔ چند آدمی تلوار کے پے در پے ضربوں سے اس کا حلیہ بگاڑ رہے تھے۔ میں نے سنا ہے کہ میر معین بھی مارا جا چکا ہے؟

انور علی نے کہا۔ اب ان غداروں کے متعلق سوچنے کا وقت نہیں تم فوراً قید خانے جاؤ اور ملک جہاں خان کو وہاں سے نکالنے کی کوشش کرو۔ میری ہمت جواب دے چکی ہے ورنہ میں تمہارے ساتھ چلتا۔

داروغہ نے کہا۔ آپ کو میرے ساتھ جانے کی ضرورت نہیں۔ اگر میں انگریزوں کے قبضہ سے پہلے قید خانے تک پہنچ سکا تو ملک جہان خاں کو آزاد کرنے میں مجھے کوئی دشواری پیش نہیں آئے گی۔

گلی میں عورتوں اور مردوں کی چیخ و پکار سنائی دی۔ انور علی نے جلدی سے آگے بڑھ کر دروازہ کھولا اور جھانکنے لگا۔ تباہ حال شہریوں کا ایک ہجوم مشرق سے مغرب کی طرف بھاگ رہا تھا اور ان کے پیچھے چند انگریز مار دھاڑ کرتے چلے آرہے تھے۔ انور علی کچھ دیر دروازے کے ساتھ کھڑا رہا۔ جب انگریز سپاہی لوگوں

کے ہجوم کو اپنی تلواروں سے ہانکتے ہوئے آگے نکل گئے تو وہ اپنے ساتھیوں کو لے کر ڈیوڑھی سے باہر نکلا اور عقب سے انگریزوں پر ٹوٹ پڑا۔ آن کی آن میں کوئی بیس انگریز زمین پر ڈھیر ہو گئے اس کے ساتھ ہی اہلِ شہر نے بھی پلٹ کر ان پر حملہ کر دیا۔ کوئی پانچ منٹ بعد انگریزی فوج کا پورا دستہ موت کی گھاٹ اتار جا چکا تھا۔ لیکن اس کے ساتھ ہی انور علی کی قوت جواب دے گئی اور وہ بے ہوش ہو کر گر پڑا۔ ایک سپاہی نے کہا انہیں گھر پہنچانا چاہیے۔

اٹھائیسواں باب

انور علی کو ہوش آیا تو ہوا اپنے مکان کی نچلی منزل کے ایک کمرے میں پڑا ہوا تھا۔ منیرہ، گھر کے نوکر اور محلے کا ایک طبیب اس کے بستر کے گرد کھڑے تھے۔ رات ہو چکی تھی اور کمرے کے اندر فانوس روشن تھا۔ ایک ثانیہ اپنے تیمارداروں کی طرف دیکھنے کے بعد انور علی کی نگاہیں منیرہ کے چہرے پر مرکوز ہو گئیں۔ منیرہ سکتے کے عالم میں کھڑی تھی۔ انور علی نے پانی مانگا اور منور جلدی سے پانی کا کٹورا بھر لایا۔ کریم خاں نے اسے سہارا دے کر اٹھایا اور انور علی نے پانی پینے کے بعد دوبارہ سر تکیے پر رکھ دیا۔ طبیب نے اپنے تھیلے سے ایک شیشی نکال کر دوائی کے چند گھونٹ ایک پیالی میں ڈالے اور انور علی کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ یہ دوائی پینے کے بعد آپ کچھ طاقت محسوس کریں گے۔ میں آپ کے زخم دیکھ چکا ہوں۔ سر کا زخم جلد سے نیچے نہیں گیا اور گولی نکل جانے کے بعد ٹانگ کا زخم بھی زیادہ خطرناک نہیں۔ اگر خون بروقت بند ہو جاتا تو آپ کی یہ حالت نہ ہوتی۔

انور علی نے کوئی جواب دیے بغیر دوائی پی لی اور احسان مندی سے طبیب کی طرف دیکھنے لگا۔ منیرہ جو چند ثانیے قبل حزن و یاس تصویر نظر آتی تھی اب قدرے پُر امید ہو کر اپنے شوہر کی طرف دیکھ رہی تھی۔ طبیب نے منیرہ سے مُخاطب ہو کر کہا۔ آپ ہر گھنٹے کے بعد انہیں اس دوائی کے دو گھونٹ پلاتی رہیں۔ اگر حالات نے اجازت دی تو میں صبح سے پہلے ایک بار پھر انہیں دیکھنے کی کوشش کروں گا۔

انور علی نے کہا۔ حکیم صاحب آپ اپنا وقت ضائع نہ کریں۔ آج سرنگا پٹم کی ہر گلی اور ہر گھر میں لاتعداد زخمی پڑے ہوئے ہیں آپ کو اُن کی طرف توجہ دینی چاہیے۔

طبیب نے اپنا تھیلا اٹھاتے ہوئے کہا۔ شہر میں یہ افواہ ہے کہ سلطانِ معظم شہید ہو چکے ہیں؟

ہاں! میں اُن کی لاش دیکھ چکا ہوں اور مجھے اس بات کا ملال ہے کہ میں ان کے قدموں میں سر رکھ کر جان نہ دے سکا۔

طبیب کچھ کہے بغیر باہر نکل گیا۔ منور کریم اور خادمہ کوئی ایک منٹ تذبذب کی حالت میں کھڑے رہے پھر خادمہ انہیں ہاتھ سے اشارہ کرنے کے بعد دروازے کی طرف بڑھی اور وہ اس کے پیچھے چل دیے۔ انور علی نے منیرہ کی طرف دیکھا اور بے اختیار اپنے ہاتھ پھیلا دیے۔ منیرہ نے جلدی سے آگے بڑھ کر اپنا سر اس کے سینے پر رکھ دیا۔

منیرہ! انور علی نے اس کے سنہری بالوں پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ میں جنت کے دروازے پر دستک دینے کے بعد واپس آ گیا ہوں۔ میں لاشوں کے انبار میں پڑا ہوا تھا۔ اور مجھے تمہاری آواز سنائی دے رہی تھی۔ مجھے یہ تمام واقعات ایک خواب معلوم ہوتے ہیں۔ آج سے کوئی چالیس سال قبل جب مُرشد آباد پر اسی قسم کی تاریکی چھا گئی تھی تو میرے والد نے میسور کے اُفق پر ایک نئی صبح کے آثار دیکھے تھے اور وہ سرنگا پٹم آ گئے تھے لیکن جو رات سرنگا پٹم پر آئی ہے وہ صبح کا پیام دینے والے ستاروں کے وجود سے خالی ہے۔ آج کے بعد آزادی کے متلاشیوں کے جو قافلے سرنگا پٹم سے نکلیں گے ان کے سامنے مُہیب تاریکیوں کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔

منیرہ تم جس ملک کی تاریکی سے گھبرا کر یہاں آئی تھیں آج اس کی فضاؤں میں آزادی کے نغمے گونج رہے ہیں۔ تمہارے ہم وطن اپنی قسمت پر ناز کر سکتے ہیں۔ لیکن میرے میسور کی عظمت قصہ ماضی بن چکی ہے۔ تمہاری رفاقت میں میری

زندگی کا ہر سانس مسرتوں سے لبریز تھا لیکن اگر مجھے یہ معلوم ہوتا کہ کسی دن میری قوم کی تقدیر میر صادق جیسے غداروں کے ہاتھ میں آجائے گی تو میں تمہارا رفیقِ حیات بننے کی تمنا نہ کرتا۔ میں رُوئے زمین کی تمام خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کرنا چاہتا تھا لیکن اب میری پونجی ایک لٹی ہوئی قوم کے آنسوؤں کے سوا کچھ نہیں۔ جب میں لاشوں کے انبار میں پڑا ہوا تھا تو میرے دل میں بار بار یہ خیال آتا تھا کہ کاش تم سرنگا پٹم میں نہ ہوتیں اور میں ایک شکست خوردہ قوم کی سسکیاں سُننے کی بجائے وہیں جان دے دیتا۔ میں مرنے سے پہلے تمہیں کسی محفوظ جگہ دیکھنا چاہتا تھا۔ کسی ایسی محفوظ جگہ جس کے مکین غداری اور ملت فروشی کے الفاظ سے ناآشنا ہوں۔

انور علی گفتگو کی دوران منیرہ کی آہیں سسکیوں اور سسکیاں دبی دبی چیخوں میں تبدیل ہو چکی تھیں۔ جب اس نے سر اُٹھایا تو اس کا چہرہ آنسوؤں سے بھیگا ہوا تھا۔

انور! اس نے اپنے شوہر کی طرف دیکھتے ہوئے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ میرا وطن فرانس نہیں سرنگا پٹم ہے اور مجھے اپنے حال یا مستقبل سے کوئی شکایت نہیں۔ مسرت کے وہ ایام جو مجھے آپ کی رفاقت میں نصیب ہوئے ہیں۔ میری زندگی کا سب سے بڑا سرمایہ ہیں۔ آپ کے ساتھ مستقبل کی تاریک ترین منازل کی طرف قدم اٹھاتے ہوئے میرے پاؤں نہیں ڈگمگائیں گے۔ اگر میسور کی زمین ہمارے لیے تنگ ہوگئی تو ہم کہیں دُور چلے جائیں گے۔ وہاں بھی مجھے اس سرنگا پٹم کی یاد ہمیشہ مسرور رکھے گی جس کا پہلا منظر میں نے آپ کے ساتھ کاویری کے کنارے ایک ٹیلے کی چوٹی سے دیکھا تھا۔ خوشی کے وہ لمحات جو میں نے آپ کے ساتھ اس گھر کی چار دیواری میں گزارے ہیں میری باقی زندگی کے مہینوں اور برسوں پر

حاوی رہیں گے۔

انور علی نے کہا۔منیرہ میں سرنگا پٹم چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔میں اس مٹی میں دفن ہونے کی سعادت سے محروم ہونا پسند نہیں کروں گا۔جس پر سلطان ٹیپو کا خون گرا ہے اور موت سے پہلے میسور میں میرے حصے کا بہت سا کام باقی ہے مجھے سرنگا پٹم کے شہیدوں کی ارواح کی قسم، میں اپنے ہم وطنوں کی عزت اور آزادی کو تجارت کا مال سمجھنے والے غداروں کو زندہ نہیں چھوڑوں گا۔یہ گدھ فرنگی بھیڑیوں کے ساتھ مل کر ہماری بوٹیاں نہیں نوچ سکیں گے۔

کسی نے کمرے کے دروازے پر دستک دی اور انور علی خاموش ہو گیا۔منیرہ نے پوچھا کون ہے؟

منور خاں نے اندر جھانکتے ہوئے کہا بی بی جی میں دودھ لایا ہوں۔

لے آؤ۔منیرہ نے کہا۔

منور خاں ایک طشت میں دودھ کا کٹورا لیے کمرے میں داخل ہوا۔منیرہ نے انور علی کو ہاتھ کا سہارا دے کر اٹھایا اور پھر طشت سے دودھ کا پیالہ اٹھا کر اس کے منھ سے لگا دیا۔دودھ کے چند گھونٹ پینے کے بعد انور علی دوبارہ بستر پر لیٹ گیا۔منور خاں پیالہ لے کر واپس جانے لگا تو انور علی نے کہا۔منور بالائی منزل کے بڑے کمرے سے تمام بندوقیں، طمنچے اور بارود لا کر میرے پاس رکھ دو۔

منیرہ نے کہا کیا یہ نہیں ہو سکتا کہ آپ کو کسی ایسی جگہ پہنچا دیا جائے جو اس گھر کی نسبت زیادہ محفوظ ہو۔شہر میں آپ کے کئی دوست ہیں؟

انور علی نے جواب دیا۔آج سرنگا پٹم میں میرے کسی دوست کا گھر محفوظ نہیں۔

منور خاں نے جلدی جلدی چار بندوقیں، دو طمنچے اور بارود کی پانچ تھیلیاں لا کر انور علی کے کمرے میں رکھ دیں اور کہا۔ جناب اگر حکم ہو تو بندوقیں بھر دوں؟

منور خاں نے فرش پر بیٹھ کر یکے بعد دیگرے بندوقیں بھر کر انور علی کے سرہانے دیوار کے ساتھ کھڑی کر دیں اور طمنچے تپائی پر رکھ دیے۔ اس کے بعد اس نے کہا۔ کریم خاں اور سائیں باہر ڈیوڑھی کے دروازہ پر پہرہ دے رہے ہیں۔ اگر اجازت ہو تو ایک بندوق یہاں سے لیتا جاؤں۔ نہیں انور علی نے جواب دیا۔ تم انہیں میری طرف سے حکم دو کہ اگر کوئی مکان میں داخل ہونے کی کوشش کرے تو وہ مداخلت نہ کریں۔ اب تم اپنی جانیں خطرے میں ڈال کر مجھے کوئی فائدہ نہیں پہنچا سکتے۔ میں صرف یہ چاہتا ہوں کہ اگر کوئی مکان کے اندر داخل ہونے کی کوشش کرے تو تم مجھے خبردار کر دو۔

منور خاں کچھ دیر تذبذب کی حالت میں انور علی کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہا۔ بھائی جان میری ایک درخواست مان لیجیے۔

کہو!

بھائی جان میں چاہتا ہوں کہ اگر دشمن آ جائے تو آپ میرے لیے کمرے کا دروازہ بند نہ کریں۔ میں آخری دم تک آپ کا ساتھ دینا چاہتا ہوں۔

نہیں منور۔ انور علی نے کرب انگیز لہجے میں کہا۔ تم جاؤ۔

منور نے آبدیدہ ہو کر انور علی کی طرف دیکھا اور سر جھکا کر دروازے کی طرف چل دیا۔

ٹھہرو! انور علی نے کہا

منور رک گیا۔ انور علی نے منیرہ سے مخاطب ہو کر کہا منیرہ۔ امی جان کو وہ تھیلی

جو مُراد ہمارے حوالہ کر گیا تھا کہاں ہے؟

وہ اُوپر ایک صندوق میں پڑی ہے۔

اُسے لے آؤ۔

منیرہ کمرے سے باہر نکل گئی اور تھوڑی دیر بعد مخمل کی ایک تھیلی اٹھائے کمرے میں داخل ہوئی۔ انور علی نے بستر پر لیٹے لیٹے منیرہ کے ہاتھ سے تھیلی لے کر کھولی اور ایک ہیرہ نکال کر منور خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ منور لو یہ تمہارے کام آئے گا۔

نہیں۔نہیں۔ منور نے پھوٹ پھوٹ کر روتے ہوئے کہا۔

منور! انور علی نے کہا۔ تم ہمیشہ میرا حکم مانا کرتے تھے یہ لے لو ورنہ میں خفا ہو جاؤنگا۔

منیرہ نے آگے بڑھ کر علی کے ہاتھ سے ہیرہ لے لیا اور منور کے ہاتھ پر رکھ دیا۔

انور علی نے تین اور چھوٹے چھوٹے ہیرے تھیلی سے نکالے اور منور خاں کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ یہ بھی لو منور۔ ان میں سے ایک کیم خاں دوسرا اور تیسرا خادمہ کو دے دو، اور انہیں یہ سمجھا دو کہ وہ کچھ عرصہ انہیں چھپا کر رکھیں۔ یہ بہت قیمتی ہیں۔

منور خاں نے ہیرے لے لیے اور پھر چند ثانیے غور سے انور علی کی طرف دیکھنے کے بعد کہا۔ بھائی جان آپ کی باتوں سے ایسا معلوم ہوتا ہے کہ آپ ہمیں یہاں چھوڑ کر کہیں جا رہے ہیں۔

انور علی نے جواب دیا۔ میں تمہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گا۔

تو پر یہ ہیرے اپنے پاس کیوں نہیں رکھتے؟

انور علی نے قدرے تلخ ہو کر کہا۔منور خدا کے لیے جاؤ!

منور اس تلخی کی وجہ نہیں سمجھ سکا۔اس نے سراپا احتجاج بن کر پہلے انور علی اور پھر منیرہ کی طرف دیکھا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔انور علی نے مخمل کی تھیلی اپنے تکیے کے نیچے رکھ دی۔



کسی نے دروازہ کھٹکھٹایا اور وہ دم بخود ہو کر ایک دوسرے کی طرف دیکھنے لگے۔کون ہے۔انور علی نے جلدی سے طمنچہ اُٹھا کر بیٹھتے ہوئے کہا۔

میں جہان خان ہوں مجھے اندر آنے کی اجازت ہے؟

انور علی نے منیرہ کی طرف دیکھا اور اس نے ایک کھونٹی سے ایک سفید چادر اُتار کر اپنے اُوپر ڈال لی۔انور علی نے آواز دی۔آیئے!

ملک جہان خاں کمرے میں داخل ہوا۔اس کے ہاتھ میں خُون آلود تلوار تھی اور لباس پر بھی خون کے چھینٹے نظر آتے تھے۔اس نے کسی تمہید کے بغیر کہا۔معاف کیجیے میں آپ کے نوکروں کو اطلاع کیے بغیر اندر آ گیا ہوں۔سڑک پر جگہ جگہ انگریز سپاہی گشت کر رہے ہیں اور مجھے عقب سے دیوار پھاند کر اندر آنا پڑا۔آپ کے متعلق داروغہ کی اطلاع بہت پریشان کن تھی۔اب آپ کا کیا حال ہے؟

میں زخموں سے زیادہ تھکاوٹ کے باعث نڈھال ہو گیا تھا۔آپ تشریف رکھیے!

نہیں میں راتوں رات یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے ایسے حالات میں بھی ایک ساتھی کو فراموش نہیں کیا۔

اب آپ کہاں جائیں گے؟

مجھے معلوم ہوا ہے کہ شہزادہ فتح حیدر کا لشکر کری گٹا کی پہاڑی کے عقب میں پڑاؤ ڈالے ہوئے ہے اور کسی تاخیر کے بغیر ان کے پاس پہنچنا چاہتا ہوں۔ اگر شہزادے نے میر قمر الدین جیسے غداروں کی باتوں میں آ کر ہتھیار ڈال دیے تو میں آخری دم تک اس کا ساتھ دوں گا۔ ابھی تک سلطان کا جن وفادار ساتھیوں سے میری ملاقات ہوئی ہے ان سب کی یہی رائے ہے کہ ہم شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچ جائیں۔ اب سرنگا پٹم کو تباہی سے بچانا ہمارے بس کی بات نہیں۔ شہر میں انگریزوں کی وحشت اور بربریت کی جو بھیانک مناظر دیکھنے میں آئے ہیں وہ ناقابل بیان ہیں۔ آج سرنگا پٹم میں کسی عورت کی عصمت محفوظ نہیں۔ میں نے اپنے ہاتھ سے پانچ انگریز قتل کیے ہیں۔ ایک گلی میں چند انگریز نے چار لڑکیوں کو گھیرے میں لے رکھا تھا اور حیدر آباد کے سپاہی منت درازی سے انہیں چھڑانے کی کوشش کر رہے تھے۔ میرے ساتھیوں نے اچانک حملہ کیا اور آن کی آن میں دس بارہ انگریزوں کو موت کی گھاٹ اتار دیا۔ حیدر آباد کے اکثر سپاہی غیر جانبدار رہے لیکن چند ایسے بھی تھے جنہوں نے لڑائی میں ہمارا ساتھ دیا۔

انور علی نے پوچھا آپ نے شاہی محل کے حالات معلوم کیے ہیں؟

نہیں، اس طرف کے تمام راستے بند ہیں۔ میں صرف اتنا معلوم کر سکا ہوں کہ آٹھ بجے تک محل کے دروازے پر شدید لڑائی ہو رہی تھی اور فرانسیسی دستہ محل کے محافظوں کے ساتھ تھا۔ اس کے بعد یک لخت فائرنگ بند ہو گئی تھی۔ مجھے یہ بھی معلوم ہوا ہے کہ قلعے کا کماندار میر ندیم دشمن کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ ان حالات میں اگر لڑائی جاری رہتی تو بھی انگریزوں کو محل پر قبضہ کرنے میں زیادہ دیر نہ لگتی۔ مجھے

افسوس ہے کہ آپ زخمی ہیں اور میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ دشمن شاہی محل سے فارغ ہوتے ہی ایک نئی شدت کے ساتھ لوٹ مار اور قتل و غارت شروع کریں گے اور آپ کا مکان انتہائی غیر محفوظ ہوگا کیا یہ بہتر نہیں ہوگا کہ آپ کو کسی ایسے دوست کے پاس پہنچا دیا جائے جس کا گھر نسبتاً محفوظ ہو؟

انور علی نے جواب دیا۔ آج میرے لیے سرنگا پٹم کے تمام گھر یکساں غیر محفوظ ہیں۔ مجھے اس وقت کوئی پریشانی ہے تو اپنی بیوی کے متعلق ہے اگر آپ انہیں شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچا سکیں تو یہ مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔

جہاں خاں نے کہا۔ اگر یہ فوراً چلنے کے لیے تیار ہو جائیں تو میں انہیں شہزادہ کے پاس پہنچانے کا ذمہ لے سکتا ہوں۔ لیکن چند گھنٹے بعد یہ کام بہت مشکل ہوگا۔

منیرہ نے سراپا احتجاج بن کر کہا۔ نہیں، نہیں، میں آپ کو اس حالت میں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔

انور علی نے کہا۔ منیرہ تمہارا میرے ساتھ رہنا ٹھیک نہیں۔ اگر میں گرفتار ہو گیا تو انگریز زیادہ سے زیادہ مجھے اس وقت تک قید میں رکھیں گے جب تک کہ میسور کے کسی لشکر کی طرف سے مزاحمت کا خدشہ باقی رہے گا لیکن ان درندوں کے ہاتھوں سرنگا پٹم کی کسی عورت کی عزت محفوظ نہیں اور اگر انہیں یہ پتہ چل گیا کہ تم فرانسیسی قوم سے تعلق رکھتی ہو تو تمہارا انجام شاید میری قوم کی بہو بیٹیوں سے زیادہ المناک ہوگا۔

منیرہ نے کہا۔ اب میں فرانسیسی نہیں بلکہ میسور کی بہو بیٹیوں میں سے ایک ہوں۔

جہاں خاں نے کہا۔ میری بہن سرنگا پٹم کے لیے یہ تین چار دن بہت خطرناک ہیں آپ کو معلوم نہیں کہ یہ قوم فتح کے نشے میں کیا کیا کرتی ہے۔

منیرہ نے کہا۔ مجھے معلوم ہے لیکن میری عزت، میری زندگی اور موت میرے شوہر کے ساتھ ہے۔ میں انہیں چھوڑ کر نہیں جاؤں گی۔

انور علی نے کہا۔ منیرہ! آئندہ ایک دو دن سرنگا پٹم پر فاتح لشکر کی حکومت ہو گی اور انسانیت کو سر چھپانے کے لیے جگہ نہیں ملے گی۔ جب یہ طوفان گزر جائے گا تو میں تم سے آملوں گا۔ میں منور اور کریم خاں کو تمہارے ساتھ بھیج دیتا ہوں۔ اگر ملک جہاں خاں تمہارے لیے میسور کی حدود میں کوئی جائے پناہ تلاش نہ کر سکے تو یہ تمہیں چچا اکبر خاں کے گاؤں پہنچانے کا انتظام کر دیں گے اور مجھے یقین ہے کہ حالات سازگار ہونے تک ثمینہ اور اس کی والدہ تمہیں اپنے گھر میں پناہ دے سکیں گی۔

منیرہ نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔ میں صرف اتنا جانتی ہوں کہ اس وقت آپ کو میری ضرورت ہے۔ اور ان الفاظ کے ساتھ منیرہ کی آنکھوں سے آنسو اُبل پڑے۔

جہاں خاں نے کہا۔ انور علی، میری بہن درست کہتی ہے۔ آپ کو ان کے متعلق فکر مند نہیں ہونا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ انگریز شراب کے نشے میں بھی ایک فرانسیسی لڑکی کے ساتھ کوئی بدسلوکی کرنے کی جرات نہیں کریں گے۔ ہمارا ٹیپو شہید ہو چکا ہے۔ ہم اپنی تلوار اور ڈھال سے محروم ہو چکے ہیں لیکن فرانس کا نپولین ابھی تک زندہ ہے۔ میں آپ سے اجازت لیتا ہوں۔

جہاں خاں دروازے کی طرف بڑھا لیکن انور علی نے کہا۔ ٹھہریے میں آپ سے ایک اور درخواست کرنا چاہتا ہوں۔

کہیے۔ جہاں خاں نے مُڑ کر دیکھتے ہوئے کہا۔

مُراد علی ابھی تک افغانستان کی مہم سے واپس نہیں آیا۔ اگر کوئی غیر معمولی واقعہ پیش نہیں آیا تو اُسے ایک یا دو ہفتوں کے اندر اندر یہاں پہنچ جانا چاہیے۔ اگر وہ کہیں

آپ سے ملے تو اسے موجودہ حالات میں سرنگا پٹم آنے سے منع کیجیے۔ اسے میری طرف سے کہیے کہ اکبر خان کے گھر میں تمھارا انتظار ہو رہا ہے۔ پچھلے دنوں ان کی طرف سے ایک ایلچی تمہارا حال معلوم کرنے آیا تھا۔ اگر آپ کو گھوڑے کی ضرورت ہو تو میرے اصطبل سے لے جایئے۔

نہیں، اس وقت گھوڑے پر سوار ہو کر سرنگا پٹم سے نکلنا بہت مشکل ہے۔

اچھا خدا حافظ۔ انور علی نے بستر پر لیٹے لیٹے اپنا ہاتھ بڑھا دیا۔ جہاں خاں نے اس کے ساتھ مصافحہ کرنے کے بعد منیرہ کو سلام کیا اور کمرے سے باہر نکل گیا۔

انور علی نے منیرہ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ منیرہ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔

کس بات پر؟

تم نے میرا کہا نہیں مانا۔ میں نے دل پر پتھر رکھ کر تمہیں یہاں سے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ اگر تم میرا مشورہ مان لیتیں تو ممکن تھا تمہیں رخصت کرنے کے چند ثانیے بعد دیوانگی کی حالت میں باہر نکل آتا اور چلا چلا کر کہتا۔ منیرہ منیرہ! واپس آجاؤ مجھے تمہاری ضرورت ہے۔ منیرہ تشکر کے آنسوؤں کے ساتھ اپنے شوہر کی طرف دیکھنے لگی۔

انور علی نے تھکی ہوئی آواز میں کہا۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ تم دروازہ بند کر دو اور روشنی بُجھا دو۔ اگر باہر سے کوئی آہٹ سُنائی دے تو مجھے جگا دینا۔ مجھے حبس محسوس ہو رہی ہے ایک کھڑکی کھول دو۔ لیکن جب تمہیں نیند آنے لگے تو اسے بند کر دینا۔



غروبِ آفتاب سے کوئی تین گھنٹے بعد سرنگا پٹم کے شہر، قلعے اور محل پر انگریزوں

کامکمل قبضہ ہو چکا تھا اور میر عالم کی قیادت میں دکن کی فوج کے چند دستے بھی شہر میں داخل ہو چکے تھے۔شہر کی چار دیواری کے اندر میسور کے بارہ ہزار سورماؤں کی لاشیں بکھری ہوئی تھیں لیکن ابھی تک ایسٹ انڈیا کمپنی اور میر نظام علی کے سپاہیوں کے لیے یہ فتح نامکمل تھی۔وہ سلطان کی تلاش میں محل کا کونا کونا چھان چکے تھے۔ غداروں کی نشاندہی پر سلطان کے وفادار افسروں کے گھروں کی تلاشی ہو رہی تھی۔ کمسن شہزادوں کو دھمکیاں دی جا رہی تھیں۔زخمیوں اور نہتوں کے سینوں پر سنگین رکھ کر یہ پوچھا جا رہا تھا کہ سلطان کہاں ہے؟ سرنگا پٹم کے بیشتر سپاہی سلطان کی شہادت کے وقت مختلف محاذوں پر لڑ رہے تھے اور وہ انگریزوں کو کوئی تسلی بخش جواب نہیں دے سکتے تھے لیکن جن سپاہیوں نے اپنی آنکھوں سے اپنے محبوب حکمران کو گرتے دیکھا تھا انہیں بھی کوئی خوف یا لالچ سلطان کی شہادت کے متعلق کچھ بتانے پر آمادہ نہ کر سکا۔ان میں سے بعض سلطان کو زندہ سمجھ کر اسے لاشوں کے انبار سے نکالنے کے لیے مناسب وقت کا انتظار کر رہے تھے اور جنہیں سلطان کی موت کا یقین ہو چکا تھا انہیں یہ گوارا نہ تھا کہ دشمن کہ ناپاک ہاتھ سلطان کی لاش تک پہنچ سکیں۔

سلطان شہید ہو چکا ہے لیکن اس کے وفادار ساتھیوں نے اس کی لاشیں کہیں گم کر دی ہے۔سلطان شہید نہیں ہوا۔سلطان زخمی ہونے کے بعد کہیں روپوش ہو گیا تھا۔سلطان حملے سے پہلے ہی سرنگا پٹم سے جا چکا تھا۔سلطان شہزادہ فتح حیدر کے پاس پہنچ چکا ہے۔سلطان سراپا چتل ڈرگ کو اپنا مستقر بنا کر لڑائی جاری رکھے گا۔اس قسم کی افواہیں صرف انگریزوں اور میر نظام علی کی فوج کے افسروں کیلئے ہی نہیں بلکہ ان غداروں کے لیے بھی انتہائی پریشان کن تھیں جو میسور کی آزادی کے عوض اپنے

آقاؤں سے بری بڑی جاگیروں کے وعدے لے چکے تھے۔ میر صادق اور معین الدین کا انجام دیکھنے کے بعد انہیں اپنے انجام کے متعلق کوئی خوش فہمی نہ تھی۔

آدھی رات کے قریب محل کے سامنے میر قمر الدین، پورنیا اور بدر الزماں چند انگریز افسروں کے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔ چند سپاہی مشعلیں لیے ان کے گرد کھڑے تھے۔ میر ندیم بھاگتا ہوا ان کے قریب پہنچا اور بلند آواز میں چلایا۔ مجھے ابھی سُلطان کے متعلق اطلاع ملی ہے اس کی لاش شمالی دروازے کے سامنے دوسری لاشوں کے انبار میں دبی ہوئی ملی ہے۔ چلیے میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔

وہ کسی توقف کے بغیر اس کے ساتھ چل دِیے۔

تھوڑی دیر بعد وہ لاشوں کے انبار کے گرد کھڑے تھے۔ انگریز افسر کا حکم سے تمام لاشیں ایک ایک کر کے علیحدہ کی جانے لگیں۔ چند لاشیں ہٹانے کے بعد ایک انگریز سپاہی نے ایک لاش کو بازو سے پکڑ کر گھسیٹنے کی کوشش کی تو اُسے اپنے ہاتھ میں کسی سخت چیز کی چبھن محسوس ہوئی۔ اس کی ساتھ ہی لاش کے سر سے پگڑی اُتر گئی اور اس کے لمبے لمبے سیاہ بال بکھر گئے۔ انگریز سپاہی نے انگریزی زبان میں کچھ کہہ کر اپنے افسروں کو اس طرف متوجہ کیا۔ انہوں نے مشعلیں قریب کر کے دیکھا تو یہ ایک عورت تھی جس کی باہوں میں سونے کے کنگن چمک رہے تھے۔ اس کے بعد ایک اور عورت کی لاش برآمد ہوئی جس کا جسم گولیوں سے چھلنی تھا۔ پورنیا نے ایک سپاہی کے ہاتھ سے مشعل لے کر غور سے اس کا چہرہ دیکھا اور چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑا رہا۔

آپ اسے پہچانتے ہیں؟ ایک انگریز افسر نے سوال کیا۔

ہاں، یہ ایک یتیم ہندو لڑکی ہے جسے سلطان نے اپنی بیٹی بنا لیا تھا۔ اس کا باپ

گزشتہ جنگ میں مارا گیا تھا۔

اور دوسری عورت کون ہے؟

اس کے متعلق مجھے کچھ معلوم نہیں۔ ممکن ہے کہ یہ شاہی خاندان سے تعلق رکھتی ہو۔

تھوڑی دیر بعد باقی تمام لاشیں ہٹائی جا چکی تھیں اور یہ لوگ سکتے کے عالم میں شیرِ میسور کی طرف دیکھ رہے تھے۔ سُلطان ٹیپو کا لباس خُون سے تر تھا لیکن اس کے چہرے کے رُعب وجلال میں کوئی فرق نہیں آیا تھا۔ ٹوٹی ہوئی تلوار کا قبضہ ابھی تک اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس کا لباس فوج کے افسروں سے مختلف نہ تھا۔ وہ دستار جو اسے دوسروں سے ممیّز کرتی تھی۔ چند قدم دُور پڑی ہوئی تھی۔ بدرالزمان نے آگے بڑھ کر دستار اٹھالی۔

ایک افسر نے پوچھا۔ یہ سلطان ٹیپو ہے؟

میر قمرالدین نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ جی ہاں۔ آپ کو فتح مبارک ہو۔

انگریز سپاہی چلایا۔ یہ زندہ ہے! اور چند آدمیوں نے اپنی بندوقیں سیدھی کر لیں۔ انگریز افسر جھجکتا ہوا آگے بڑھا اور سلطان کی نبض ٹٹولنے کے بعد اس کے سینے پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولا۔ یہ مر چکا ہے۔

بدرالزمان نے سلطان کی دستار کو اپنی آنکھوں سے لگاتے ہوئے کہا۔ اس کے قاتل آپ نہیں ہم ہیں۔ ہم نے اسے قتل کیا ہے اور ہماری آئندہ نسلیں اس کی قبر پر پھول چڑھایا کریں گی۔

ہم آپ کے شکر گزار ہیں۔ انگریز افسر یہ کہہ کر میر قمرالدین کی طرف متوجہ

ہوا۔آپ انہیں پالی میں ڈال کر محل میں پہنچانے کا انتظام کریں۔میں جنرل ہیرس کو اطلاع دیتا ہوں۔

تھوڑی دیر بعد قلعے کے ہر گوشے سے فتح کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔پھر انگریز سپاہی اُچھلتے کودتے، چیختے چلاتے قلعے سے نکلے اور لوگوں کے گھروں کا رُخ کرنے لگے۔وہ جتھے شہر کے مختلف حصوں میں سُلطان کو تلاش کر رہے تھے، ان کے ساتھ شامل ہو گئے اور لوٹ مار، قتل و غارت کا ایک نیا دور شروع ہوا۔

کارکنانِ قضاوقدر نے اس قوم کی ہزاروں بیٹیوں کی چیخ و پکار کی طرف سے کان بند کر لیے تھے جس کی چند ماؤں نے میر صادق جیسے غداروں کو دُودھ پلایا تھا۔سرنگا پٹم کا کوئی گھر وحشت اور بربریت کے اس طوفان سے محفوظ نہ تھا۔یہاں تک کہ وہ غدار بھی جنہوں نے میر صادق، پورنیا، قمرالدین اور معین الدین جیسے بے ضمیر انسانوں کا ساتھ دیا تھا اب یہ محسوس کر رہے تھے کہ انہوں نے صرف قوم کی آزادی اور قوم کے شہیدوں کی قیمت ہی وصول نہیں کی بلکہ اپنی بہو بیٹیوں کی عزت کا سودا بھی کر چکے ہیں۔میر صادق اور میر معین الدین اپنی غداری کا صلہ حاصل کرنے سے پہلے ہی قتل ہو چکے تھے لیکن ان کی ارواح انہی درندوں کے ہاتھوں اپنے گھروں کی بربادی کا تماشا دیکھ رہی تھیں۔جن کے لیے انہوں نے سرنگا پٹم کا راستہ صاف کیا تھا۔ان کہ بہو بیٹیوں کے لباس نوچے جا رہے تھے اور شراب سے بدست انگریز اُن کی چیخوں کے جواب میں قہقہے لگا رہے تھے۔

میں میر صادق کی بیوی ہوں۔میں میر صادق کی بہن ہوں۔میں میر صادق کی بیٹی ہوں۔یہ میر معین الدین کا گھر ہے۔وہ لارڈ ولزلی کے دوست تھے۔جنرل ہیرس انہیں جانتا ہے۔انہیں لوگوں نے انگریزوں کا دوست ہونے کے جُرم میں قتل

کر دیا ہے۔ تم دوسرے کمرے میں اس کی لاش دیکھ سکتے ہو۔ تمہیں ایسٹ انڈیا کمپنی کے دوست اور اپنی قوم کے محسن کی بہو بیٹیوں پر ہاتھ نہیں اٹھانا چاہیے۔ میں میر معین الدین کا بیٹا ہوں۔ یہ میری بیوی ہے۔ یہ میری بہنیں ہیں۔ ہمیں جنرل ہیرس کے پاس لے چلو۔ انگریزوں کے پاس مُہیب قہقہوں کے سوا ان کی التجاؤں کا کوئی جواب نہ تھا۔

جو لوگ سُلطان کی موت کے بعد جنگ کے نتائج کے متعلق مایوس ہو کر ہتھیار ڈالنے پر مجبور ہو گئے تھے وہ اب گھروں کی حفاظت کے لیے لڑ رہے تھے اور سرنگا پٹم کی گلیوں اور بازاروں میں خُون کی ایک نئی تہہ جم رہی تھی۔



انور علی بندوقوں کے لگاتار دھماکوں اور عورتوں اور بچوں کی چیخ و پکار سُن کر گہری نیند سے بیدار ہوا تو صبح کے آثار نمودار ہو رہے تھے۔ منیرہ ایک بندوق اٹھائے نیم وا دریچے کے سامنے کھڑی صحن کی طرف جھانک رہی تھی۔ انور علی نے اُٹھ کر دوسری بندوق پکڑتے ہوئے پوچھا کیا ہے منیرہ؟

ہمارے مکان کے آس پاس چاروں طرف لوٹ مار شروع ہو چکی ہے۔ انور علی جلدی سے دریچے کی طرف بڑھا تو اسے اپنے زخموں میں ٹیسیں محسوس ہونے لگیں۔ اس نے منیرہ کو ایک طرف ہٹا کر دریچہ سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ تم نے مجھے کیوں نہ جگایا؟

آپ گہری نیند سو رہے تھے اور آپ کو آرام کی ضرورت تھی۔ میں نے سوچا اگر کوئی اس طرف آیا تو آپ کو جگا دوں گی۔

انور علی نے دریچے کے سامنے گھٹنوں کے بل بیٹھتے ہوئے کہا۔ تمہیں اس

طرح دریچے کے سامنے کھڑا نہیں ہونا چاہیے تھا اور تمہیں بندوق چلانے کی بھی ضرورت نہیں تم اگر ضرورت کے وقت صرف خالی بندوق بھر بھر کر مجھے دیتی رہو تو یہ کافی ہوگا۔

منیرہ نے باقی تمام اسلحہ اٹھا کر دریچے کے قریب رکھ دیا اور انور علی کے قریب بیٹھ گئی۔ اسے خوف اور اضطراب کا ایک ایک لمحہ مہینوں سے زیادہ طویل معلوم ہوتا تھا۔ چند منٹ بعد ڈیوڑھی کی طرف شور سُنائی دیا اور انور علی ذرا گردن اُونچی کر کے باہر جھانکنے لگا۔

منور خاں بھاگتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور اس نے برآمدے کے قریب پہنچ کر بلند آواز میں کہا۔ بھائی جان۔ بھائی جان! وہ پڑوس کے مکان میں آگ لگا کر اس طرف آگئے ہیں اور ہماری ڈیوڑھی کا دروازہ توڑ رہے ہیں۔

انور علی نے دریچے سے باہر سر نکالتے ہوئے کہا۔ منور کریم خاں سے کہو کہ دروازہ کھول دے اور اپنی بندوق انکے سامنے پھینک دے۔

منور خاں نے بدحواس ہو کر جواب دیا۔ جناب اگر ڈیوڑھی کا دروازہ کھول دیا گیا تو وہ فوراً اندر آجائیں گے۔

تم ڈیوڑھی کا دروازہ بند کر کے بھی انہیں اندر آنے سے نہیں روک سکتے۔

منور خاں نے آگے بڑھ کر کمرے کے دروازے کو دھکا دیتے ہوئے کہا۔ بھائی جان خدا کے لیے مجھے اندر آنے دیجیے۔ میں آپ کے ساتھ رہنا چاہتا ہوں۔ میں بندوق چلا سکتا ہوں۔

انور علی مضطرب ہو کر آگے بڑھا اور دروازے کی کُنڈی کھولنے کے بعد منور خاں کو بازو سے پکڑ کر جھنجھوڑتے ہوئے بولا۔ تمہارا فائدہ اسی میں ہے کہ تم اپنی

رحم و کرم پر تھے۔ فوج کے بتہ کم سپاہی اور افسر ایسے تھے جو اپنے اندر گرتی ہوئی دیواروں کی پناہ لے کر جنگ جاری رکھنے کا حوصلہ پاتے تھے۔ سلطان کی شہادت اور سرنگاپٹم کے سقوط نے انہیں بد دل اور مایوس کر دیا تھا اور ان میں سے کئی ایسے تھے جن کے بال بچے سرنگاپٹم میں تھے۔

شہزادہ فتح حیدر کو جنرل ہیرس کے وعدوں کے باوجود انگریزوں سے کسی نیک سلوک کی توقع نہ تھی۔ اسے ان ملت فروشوں کے متعلق بھی کوئی خوش فہمی نہ تھی جو انگریزوں کے وکیل بن کر اسے اپنے خاندان کے مستقبل کے متعلق سبز باغ دکھا رہے تھے۔ اس کے نزدیک سلطان کی شہادت کے بعد میسور کی آزدی کا آفتاب غروب ہو چکا تھا اور وہ ایک بہادر سپاہی ہونے کے باوجود رات کی تاریکیوں میں ایک لٹے ہوئے قافلے کی رہنمائی کے لیے تیار نہ تھا۔

جب شہزادہ فتح حیدر انگریزوں کی اطاعت قبول کرنے کے لیے سرنگاپٹم کا رُخ کر رہا تھا تو ملک جہاں خاں گجل ہٹی کی ایک پہاڑی کے دامن میں چند سر پھروں کے سامنے یہ تقریر کر رہا تھا۔

شہزادے نے میرا کہا نہیں مانا اور میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ حالات نے اُسے بے بس و مجبور بنا دیا ہے۔ لیکن میں سلطان شہید کے مقدس خون کی قسم کھا کر یہ اعلان کرتا ہوں کہ جب تک میری رگوں میں خون کا ایک قطرہ باقی ہے میں میسور کی عزت اور آزادی کے دشمنوں کو چین سے نہیں بیٹھنے دوں گا۔ میں ان غداروں کو کبھی معاف نہیں کروں گا جنھوں نے میرے قوم کو یہ دن دکھایا ہے۔ ان حالات میں میں تم سے کسی شاندار فتح کا وعدہ نہیں کر سکتا۔ لیکن میں تمھارے ساتھ ایک وعدہ کر سکتا ہوں اور وہ یہ کہ انگریز اور انکے حلیف تمھارے ہاتھوں میں غلامی کی زنجیریں نہیں پہنا

سکیں گے۔ آزادی کی زندگی سے مایوس ہونے کے بعد ایک مسلمان جس چیز کی تمنا کر سکتا ہے وہ عزت کی موت ہے اور جو لوگ عزت کی موت کے لیے میرا ساتھ دینا چاہتے ہیں انہیں مایوس نہیں کروں گا۔

تھوڑی دیر بعد ملک جہان خاں کی رہنمائی میں ڈیڑھ سو سوار کسی نامعلوم منزل کا رُخ کر رہے تھے۔

شہزادہ فتح حیدر کے ہتھیار ڈالنے کے بعد میسور کی وہ داستان جس کے حسین عنوان حیدر علی اور سلطان ٹیپو نے اپنی تلواروں کی نوک سے لکھے تھے، ختم ہو چکی تھی۔ سرا اور چتل ڈرگ کے کمانڈر بھی میسور کے مستقبل سے مایوس ہو کر ہتھیار ڈال چکے تھے۔ اب سلطنت خداداد ایک لاش تھی جسے انگریز گدھوں کی طرح نوچ رہے تھے۔ ولزلی نے مالِ غنیمت کے چند ٹکڑے نظام کے آگے ڈال دیے اور ساحل کے تمام اضلاع او کوئمبتور کے علاوہ سرنگا پٹم کا جزیرہ اپنے قبضے میں لے لیا۔

سلطنتِ خداداد کی بندر بانٹ کے بعد انگریزوں نے سابق ہندو راجہ کے خاندان سے ایک پانچ سالہ بچہ تلاش کیا اور اسے تخت پر بٹھا دیا۔ نیا راجہ ہندوستان کی بساطِ ریاست پر ایسٹ انڈیا کمپنی کا سب سے بے بس اور حقیر مہرہ تھا۔ اس کی ریاست میسور کے چند وسطی اضلاع تک محدود تھی۔ غداری کے صلے میں پورنیا کو نئے راجہ کا دیوان مقرر کیا گیا۔ میر قمر الدین کو گرم کنڈہ کی جاگیر عطا کی گئی اور میر معین الدین کے جانشینوں اور دوسرے غداروں کو بھی ان کی سابقہ مراتب کے لحاظ سے جاگیریں دی گئیں۔ شہزادوں کو جلا وطن کر کے ولور بھیج دیا گیا۔ اب انگریز پورے وثوق کے ساتھ یہ کہہ سکتے تھے کہ ہم نے اہلِ میسور کی کتابِ زندگی سے آزادی کا لفظ خارج کر دیا ہے۔

لیکن میسور کی راکھ میں ابھی تک چند چنگاریاں سُلگ رہی تھیں۔ چنانچہ نئے راجہ کی تاجپوشی کے دو دن بعد جنرل ہیرس لارڈ ولزلی کو یہ خط لکھ رہا تھا کہ ہمارے خلاف ملک جہاں خاں کی

اے۔ میر نظام علی کی مربھر کی ملت فروشی کا یہ سلہ اس کے ساتھ ایک مذاق تھا۔ نظام کو گوٹی چتل ڈرگ کا کچھ حصہ دیا گیا۔ انگریزوں نے سب سڈیری سسٹم قبول کرنے کی شرط پر مرہٹوں کو تنگ بھدرہ کے شمال میں چند علاقے پیش کیے لیکن مرہٹوں کے پیشوا نے ان کی یہ پیش کش ٹھکرا دی اور یہ علاقے بھی ایسٹ انڈیا اور حیدر آباد کی حکومتوں نے آپس میں تقسیم کر لیے لیکن میر نظام علی کے لے ذلت کے یہ ٹکڑے حاصل کرنے کی خوشی بھی عارضی ثابت ہوئی ۱۸۰۰ء کے آغاز میں لارڈ ولزلی کی خواہشات کا احترام کرتے ہوئے یہ تمام علاقے ایسٹ انڈیا کمپنی کو واپس کر دیے۔

کاروائیں اب باقاعدہ ایک جنگ کی صورت اختیار کرتی جا رہی ہیں۔ آج یہ اطلاع آئی ہے کہ اس نے چتل ڈرگ کے مغرب میں ہماری ایک چوکی پر حملہ کر کے ہمارے پچاس آدمی موت کے گھاٹ اُتار دیے ہیں۔ پچھلے ہفتے انہوں نے حیدر آباد کی سرحد پر میر نظام علی کے چند دستوں کا صفایا کر دیا تھا۔ ہماری اطلاعات کے مُطابق ملک جہاں خاں کے ساتھ پانچ ہزار باغی جمع ہو چکے ہیں اور ان کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہوتا جا رہا ہے۔

تیسواں باب

ایک دوپہر بلقیس اپنے مکان کے صحن میں ایک درخت کے نیچے لیٹی ہوئی تھی۔ ثمینہ ایک کمرے سے نکلی اور بلقیس کی کھاٹ کے پاس ایک مونڈھے پر بیٹھ گئی۔ فضا میں حبس تھا۔ بلقیس نے پنکھے سے اپنے چہرے کو ہوا دیتے ہوئے کہا۔ آج ہوا بالکل بند ہے، بارش ضرور آئے گی۔

ثمینہ کچھ کہے بغیر ماں کے ہاتھ سے پنکھا پکڑ کر اسے جھلنے لگی۔

ایک نوکر تیزی سے قدم اٹھاتا ہوا صحن میں داخل ہوا اور اس نے بلقیس کی طرف ایک کاغذ بڑھاتے ہوئے کہا۔ بی بی جی۔ ہاشم بیگ صاحب کا آدمی آ گیا ہے اور اس نے یہ خط دیا ہے۔ اس کے ساتھ ایک اور آدمی بھی ہے اور وہ یہ کہتا ہے کہ میں مُراد علی کا نوکر ہوں۔

بلقیس نے ہاتھ بڑھا کر کاغذ پکڑ لیا اور نوکر واپس چلا گیا۔

ثمینہ کا دل دھڑک رہا تھا اور وہ انتہائی بے چینی کی حالت میں اپنی ماں کی طرف دیکھ رہی تھی۔ بلقیس نے خط کھولے بغیر ثمینہ کی طرف بڑھاتے ہوئے کہا۔ بیٹی مجھے پڑھ کر سُناؤ۔

ثمینہ نے کانپتے ہوئے ہاتھوں سے خط کھولا اور پڑھ کر سنانے لگی۔ ہاشم بیگ نے لکھا تھا۔

خالہ جان! السلام علیکم۔ مجھے افسوس ہے کہ مُراد علی کو آپ کا پیغام نہیں پہنچ سکا۔ وہ آپ کا خط موصول ہونے سے چار دن قبل رات کے وقت اپنے گھر پہنچا تھا اور تھوڑی دیر بعد شہر میں اپنے کسی دوست کا حال معلوم کرنے کے لیے چلا گیا تھا۔ اس کے بعد وہ ابھی تک واپس گھر نہیں آیا۔

علی الصباح اس کے نوکر نے مجھے یہ اطلاع دی تو میں نے سرنگا پٹم کا کونا کونا چھان مارا۔ اس کے نوکر کہتے ہیں کہ اپنے بھائی اور اس کی بیوی کی موت کے واقعات سُننے کے بعد اس نے ان کی قبریں دیکھیں۔ پھر کسی سے بات کیے بغیر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ایک نوکر نے اس کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی اور پوچھا کہ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ اور اس نے جواب دیا کہ میں ایک دوست کا حال معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ میرا خیال ہے کہ وہ رات کے وقت سرنگا پٹم میں نہیں ٹھہرا۔ ممکن ہے کہ میرے خط سے قبل وہ آپ کے پاس پہنچ چکا ہو۔

مجھے سرنگا پٹم سے ادھونی پہنچنے کا حکم مل چکا ہے اور میں اسی ہفتے یہاں سے روانہ ہو جاؤں گا۔ ممکن ہے کہ میری فوج کو مستقل طور پر وہیں روک لیا جائے۔ مُراد علی کے نوکروں کی حالت قابل رحم تھی۔ ایک نوکر میں نے اپنے پاس رکھ لیا ہے اور دوسرا آپ کے پاس بھیج رہا ہوں اور باقی سرنگا پٹم چھوڑنا پسند نہیں کرتے۔

اگر مراد علی آپ کے پاس پہنچ چکا ہو تو اسے میرا سلام پہنچا دیں۔ اس زخموں کا مداوا اب کسی انسان کے بس کی بات نہیں۔ ل اگر وہ آپ کے پاس نہیں پہنچا تو میں اس کی تلاش جاری رکھوں گا۔ مجھے صرف ایک بات کا خطرہ ہے کہیں وہ باغیوں کے ساتھ نہ مل گیا ہو۔ اس صورت میں اس کی مدد کرنا میرے لیے بہت مشکل ہو جائے گا۔ ثمینہ کو سلام۔

خط کے اختتام پر ثمینہ کی آواز اس کے قابو میں نہ تھی۔ اس نے آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ وہ ضرور آئیں گے امی جان انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ ممکن ہے کہ انگریزوں نے انہیں گھر سے نکلتے ہی گرفتار کر لیا ہو۔ یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ گرفتاری کا خطرہ محسوس کر کے کہیں چھپ گئے ہوں اور ان کے نوکروں نے بھائی

جان کو نا قابلِ اعتماد سمجھ کر ان کا پتہ نہ دیا ہو۔ آپ ان کے نوکر کو اندر بلا کر پوچھیں۔

بلقیس نے کہا۔ اچھی بیٹی خادمہ سے کہو اس کو بُلا لائے۔

ثمینہ اُٹھ کر خادمہ کو آوازیں دیتی ہوئی باورچی خانے کی طرف بڑھی۔

خادمہ نے باورچی خانے کے دروازے سے باہر جھانکتے ہوئے کہا۔ کیا بات ہے بی بی جی؟

ثمینہ نے کہا۔ تم باہر جاؤ اور نوکروں سے کہو سرنگاپٹم سے مُراد علی کا جو نوکر آیا ہے اسے اندر بھیج دو۔

خادمہ چلی گئی اور تھوڑی دیر بعد منور خاں صحن میں داخل ہوا۔ بلقیس اور ثمینہ کو سلام کرنے کے بعد وہ مودب کھڑا ہو گیا۔ ثمینہ نے اُٹھ کر اپنا مونڈھا ذرا آگے کر دیا اور خود ماں کے ساتھ کھاٹ پر بیٹھ گئی۔

بیٹھ جاؤ۔ بلقیس نے مونڈھے کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا اور منور خاں ہچکچاتا ہوا مونڈھے پر بیٹھ گیا۔ بلقیس اور اس کے بعد ثمینہ کے متعدد سوالات کے جواب میں اس نے سرنگاپٹم کے تمام واقعات بیان کر دیے۔ اپنی سرگزشت کا آخری حصہ سناتے وقت اس کی قوت گویائی جواب دے چکی تھی اور وہ بڑی مشکل سے اپنی سسکیاں ضبط کرنے کی کوشش کر رہا تھا۔ جب بلقیس نے مراد علی کے متعلق پوچھا تو اس نے انتہائی کرب کی حالت میں اپنا چہرہ دونوں ہاتھوں میں چھپا لیا اور ایک بچے کی طرح پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔ وہ کہہ رہا تھا۔ بی بی جی میرا خیال تھا کہ وہ آپ کے پاس پہنچ چکے ہوں گے لیکن آپ کے نوکر کہتے ہیں کہ وہ یہاں نہیں آئے۔ جب وہ گھر سے نکل رہے تھے تو میں نے ان کے گھوڑے کی باگ پکڑ لی تھی۔ میں نے پوچھا۔ آپ کہاں جا رہے ہیں؟ تو کہتے تھے مجھے معلوم نہیں۔ میں

نے ان کے ساتھ جانے کی ضد کی تو انہوں نے کہا اب تم لوگ میرا ساتھ نہیں دے سکتے۔ میں اور کریم خاں ڈیوڑھی تک ان کے ساتھ آئے۔ آخری بات جو انہوں نے ہماری تسلی کیلئے کہی تھی وہ یہ تھی کہ میں کسی دوست کا حال معلوم کرنے جا رہا ہوں۔ اس کے بعد ہمیں کچھ معلوم نہیں کہ وہ کہاں گئے۔ ہم سرنگا پٹم کا کونا کونا چھان چکے ہیں۔ لیکن شہر میں ان کے کسی دوست کو ان کا حال معلوم نہیں۔ مرزا ہاشم بیگ صاحب نے بھی انہیں تلاش کرنے کی بہت کوشش کی تھی اور انہیں اس بات کا یقین تھا کہ وہ سیدھے آپ کے پاس پہنچ چکے ہوں گے۔ بی بی جی اگر آپ کو ان کے متعلق کچھ معلوم ہو تو خدا کے لیے مجھ سے چھپانے کی کوشش نہ کیجیے۔

منور خاں کی آنکھیں دوبارہ آنسوؤں سے لبریز ہو رہی تھیں۔ بلقیس نے اسے تسلی دیتے ہوئے کہا۔ بیٹا تمہیں حوصلہ سے کام لینا چاہیے۔ مجھے یقین ہے کہ مُراد علی یہاں ضرور آئے گا۔ میں ہاشم کا پیغام بھیجوں گی کہ اس کی تلاش جاری رکھے اور میں یہ چاہتی ہوں کہ جب تک مُراد علی کا پتہ نہیں چلتا تم ہمارے پاس رہو۔



پانچ مہینے اور گزر گئے لیکن مراد علی کا کوئی سراغ نہ ملا۔

اس عرصہ میں انگریزوں کے خلاف ملک جہاں خاں کی سرگرمیاں ایک باقاعدہ جنگ کی صورت اختیار کر چکی تھیں۔ کبھی اس کے متعلق یہ اطلاع آتی کہ اس نے میسور کے فلاں علاقے پر اچانک حملہ کر کے انگریزوں کی چند چوکیوں کا صفایا کر دیا ہے اور کبھی یہ سُنا جاتا ہے کہ انگریزی فوج نے باغیوں کو شکست دے کر مرہٹہ علاقوں کی طرف سے ہٹنے پر مجبور کر دیا ہے۔ پھر کچھ عرصہ بعد یہ اطلاع آئی کہ ملک جہاں خاں کا لشکر مرہٹوں کے علاقے سے نکل کر مملکتِ نظام کی حدود میں داخل ہو

چکا ہے۔

ملک جہان خاں کے ساتھیوں کی تعداد میں آئے دن اضافہ ہو رہا تھا۔ میسور کے حریت پسند اسے اپنی آخری اُمید سمجھ کر جوق در جوق اس کے جھنڈے تلے جمع ہو رہے تھے اور بعض وہ مرہٹہ سردار بھی جنہیں سرنگا پٹم کی تسخیر کے بعد اس بات کا احساس ہو چکا تھا کہ سلطنتِ خداداد کے خاتمے کے بعد انگریزوں کی تلوار ان کی اپنی شہ رگ تک پہنچ چکی ہے۔ در پردہ ملک جہان خاں کی اعانت کر رہے تھے۔ میسور کی شمال اور مغربی سرحدوں پر بعض دُشوار گزار پہاڑ اور جنگل ان باغیوں کے لیے ناقابلِ تسخیر قلعوں کا کام دے رہے تھے۔ جب ایک مقام پر انگریزوں کا گھیرا تنگ ہونے لگتا تو یہ لوگ ایک حیرت انگیز رفتار کے ساتھ کوسوں دور کسی اور جگہ جا نکلتے۔ مقامی باشندوں کے عدم تعاون کے باعث انگریزوں کے لیے باغیوں کی نقل و حرکت معلوم کرنا مشکل تھا۔ رسد اور اسلحہ حاصل کرنے کے لیے باغیوں کو ہر جگہ مقامی لوگوں کا تعاون حاصل تھا۔

حیدر آبادی اور انگریزی سپاہیوں کی طرح ملک جہان خاں اُن مرہٹہ سرداروں کو بھی ناقابلِ معافی سمجھتا تھا۔ جنھوں نے میسور کے خلاف سابقہ جنگوں میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا تھیا۔ چنانچہ پرس رام بھاؤ کے بعض چیدہ چیدہ ساتھی قتل ہو چکے تھے اور بعض سرحدی علاقوں کو اپنے لیے غیر محفوظ سمجھ کر راہِ فرار اختیار کر چکے تھے۔ میسور کی جن غداروں نے ملت فروشی کے عوض انگریزوں سے بڑی بڑی جاگیریں حاصل کی تھیں ان پر ملک جہان خاں کی مصیبت کا یہ عالم تھا کہ وہ اپنے گھروں سے باہر جھانکنے میں بھی خطرہ محسوس کرتے تھے۔

ثمنہ کی زندگی کی تمام دلچسپیاں اب مُراد علی کے انتظار تک محدود ہو چکی تھیں۔

ایک شام وہ مغرب کی نماز ادا کرنے کے بعد مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ مغرب کے اُفق پر پہلی ارت کا چاند نمودار ہو چکا تھا۔ ثمینہ نے دُعا کے لیے ہاتھ اٹھائے اور اس کی نگاہوں کے سامنے آنسوؤں کے پردے حائل ہونے لگے۔

خادمہ سیڑھی سے نمودار ہوئی اور وہ ثمینہ کو دُعا میں مصروف دیکھ کر چند قدم دُور رُک گئی۔ ثمینہ نے دُعا ختم کی اور اس نے کہا۔ بی بی جی آپ کے بہنوئی تشریف لائے ہیں۔

ثمینہ نے اپنے دل کی دھڑکنوں پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا۔ وہ اکیلے آئے ہیں؟

جی نہیں ان کیساتھ نوکر بھی ہے۔

ثمینہ نے گھٹی ہوئی آواز میں پوچھا۔ وہ مراد علی کے متعلق کوئی خبر لائے ہیں؟

جی نہیں۔ ثمینہ کے دل کی دھڑکنیں اچانک خاموش ہو گئیں۔ وہ آہستہ آہستہ قدم اٹھاتی ہوئی زینے کی طرف بڑھی اور نیچے اترنے لگی۔ مکانکے ایک کمرے سے اس کی ماں اور ہاشم بیگ کی آوازیں سنائی دے رہی تھیں۔ وہ آگے بڑھی لیکن دروازے کے قریب پہنچ کر اس کی ہمت جواب دے گئی۔ ہاشم بیگ کہہ رہا تھا۔ خالہ جان! اب اس کا خیال چھوڑ دیجیے۔ اب وہ واپس نہیں آسکتا۔ اس ملک کی زمین اس کے لیے تنگ ہو چکی ہے، وہ مُراد جسے تم اپنا بیٹا سمجھتی تھی مر چکا ہے۔

بلقیس کی آواز آئی۔ نہیں بیٹا خدا کے لیے ایسی باتیں نہ کہو۔

خالہ جان! میں اس کے متعلق کم پریشان نہیں ہوں۔ لیکن وہ ایک ایسے گروہ میں شامل ہو چکا ہے جس کی جدوجہد کا انجام مجھے تباہی کے سوا کچھ نظر نہیں آتا۔ مجھے افسوس ہے کہ سرنگا پٹم میں اس کے ساتھ میری ملاقات نہیں ہو سکی۔ ورنہ میں اسے

ملک جہاں خاں کا ساتھی بننے سے روک لیتا۔

لیکن بیٹا تمہیں یہ کیسے پتہ چلا کہ وہ ملک جہاں خاں کے ساتھ شامل ہو چکا ہے؟

خالہ جان پچھلے دنوں انگریزوں نے اعلان کیا تھا کہ جو باغی ملک جہاں خاں کا ساتھ چھوڑ کر واپس آجائیں گے انہیں کوئی سزا نہیں دی جائے گی اور بعض آدمی جو اس کا ساتھ چھوڑ کر سرنگا پٹم واپس آگئے ہیں۔ میں ان سے مل چکا ہوں۔ انہوں نے یہ بتایا ہے کہ باغیوں کا لشکر ملک جہان خاں کے بعد مراد علی کو اپنا سب سے زیادہ ذہین اور قابلِ اعتماد افسر خیال کرتا ہے۔ وہ یہ بھی کہتے تھے کہ مراد علی کسی قیمت پر ملک جہاں خاں کا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہیں ہوگا۔ اسے اب زندگی کے ساتھ کوئی دلچسپی نہیں رہی۔

ثمینہ کی قوتِ برداشت جواب دے چکی تھی وہ اچانک کمرے میں داخل ہوئی اور پھٹی پھٹی آنکھوں سے ہاشم بیگ کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم بیگ نے قدرے توقف کے بعد کہا۔ بیٹھ جاؤ ثمینہ! مجھے افسوس ہے کہ میں مراد علی کے متعلق کوئی تسلی بخش خبر نہیں لایا۔

ثمینہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور لرزتی ہوئی آواز میں کہا۔ امی جان وہ ضرور آئیں گے۔ انہوں نے وعدہ کیا تھا۔ وہ کسی کے ساتھ جھوٹا وعدہ نہیں کر سکتے کاش میں ان کے پاس جا سکتی!

ان الفاظ کے ساتھ ثمینہ کی خوبصورت آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے اور وہ سسکیاں لیتی ہوئی برابر کے کمرے میں چلی گئی۔

ہاشم بیگ اور اضطراب کی حالت میں کچھ دیر بلقیس کی طرف دیکھتا رہا۔

بالآخر اس نے کہا۔ خالہ جان مجھے معلوم نہ تھا کہ ثمینہ۔۔۔۔۔۔۔۔ میں نے اس سے پہلے کبھی اس کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے۔

بلقیس نے گھٹی ہوئی آواز میں جواب دیا۔ بیٹا ثمینہ بدل چکی ہے۔

ہاشم نے کرسی سے اُٹھ کر برابر کے کمرے کی طرف بڑھتے ہوئے کہا۔ خالہ جان میں پتھر کے موم ہو جانے کا یقین کر سکتا ہوں ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو کا تصور نہیں کر سکتا۔ میں ابھی آتا ہوں۔

وہ برابر کے کمرے میں داخل ہوا۔ ثمینہ منہ کے بل بستر پر پڑی سسکیاں لے رہی تھی۔ اس نے جھک کر اس کے سر پر پیار سے ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا۔ ثمینہ! میری ننھی بہن! حوصلے سے کام لو۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ میں خود اس کے پاس جاؤں گا میں اسے یہ کہوں گا کہ ہماری ننھی ثمینہ تمہارا انتظار کر رہی ہے۔

ثمینہ اٹھ کر بیٹھ گئی اور ملتجی نگاہوں سے ہاشم کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم نے کہا۔ ثمینہ مجھے معلوم نہ تھا کہ اس بیوقوف نے تمہیں اس قدر پریشان کیا ہے۔

ثمینہ نے گردن جھکا لی۔ ہاشم بیگ نے اپنی قبا کی جیب میں ہاتھ ڈال کر مخمل کی ایک چھوٹی سی تھیلی نکالی اور دوسرا ہاتھ ثمینہ کی ٹھوڑی کے نیچے رکھ کر اسے اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے کہا۔ ثمینہ یہ لو۔ یہ مُراد علی کی امانت ہے اور مجھے یقین ہے کہ اُس کے آنے تک تم اس کی حفاظت کر سکو گی۔

ثمینہ مذبذب سی ہو کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

ہاشم بیگ نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور اس کی ہتھیلی میں جواہرات کی تھیلی رکھ کر کچھ کہے بغیر بلقیس کے کمرے میں چلا گیا۔

خالہ جان میں صبح ہوتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔

کہاں؟

میں مُراد علی کی تلاش میں جا رہا ہوں خالہ جان!



بیس دن بعد ایک دوپہر ہاشم بیگ ایک دشوار گزار پہاڑی علاقے میں سرف کر رہا تھا۔ ایک پہاڑ کے دامن میں گھنا جنگل عبور کرنے کے بعد اس نے ایک ندی کے کنارے رُک کر اپنے گھوڑے کو پانی پلایا۔ پھر نیچے اُتر کر اپنی پیاس بجھائی۔ اس کے بعد اپنی جیب سے ایک نقشہ کھولا اور ندی کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر دیکھنے لگا۔ چند منٹ بعد اس نے نقشہ لپیٹ کر جیب میں ڈال لیا اور اُٹھ کر گھوڑے پر سوار ہو گیا۔ ندی عبور کرنے کے بعد اس نے دوسرے کنارے ایک درخت کے قریب رُک کر اپنی تلوار نکالی اور ایک جھکے ہوئے درخت کی چند شاخیں کاٹنے کے بعد ندی کے ساتھ ساتھ بائیں طرف چل دیا۔ کوئی آدھ میل چلنے کے بعد اس ندی میں ایک اور ندی آملی اور ہاشم بیگ دائیں ہاتھ مڑ کر دوسری ندی کے کنارے ہو لیا۔ اچانک اسے گھنے درختوں میں کوئی آہٹ محسوس ہوئی اور اس نے گھوڑا روک لیا۔

درختوں سے ایک آدمی اس کی طرف بندوق سیدھی کیے نمودار ہوا اور اس نے کسی توقف کے بغیر آگے بڑھتے ہوئے کہا۔ تم کون ہو؟

ہاشم بیگ نے اطمینان سے جواب دیا۔ اگر تم ملک جہان خاں کے آدمی ہو تو مجھے ان کے پاس لے چلو۔

تمہیں یہ کیسے معلوم ہوا کہ ملک جہان خاں یہاں رہتے ہیں۔ اجنبی نے یہ کہہ کر آگے بڑھتے ہوئے بندوق کی نالی ہاشم بیگ کے منہ کے آگے کر دی۔

ہاشم بیگ نے قدرے پریشان ہو کر اِدھر اُدھر دیکھا تو اسے اپنے آگے پیچھے اور دائیں طرف چند مسلح آدمی دکھائی دیے۔ اجنبی نے کہا۔ تم گھوڑے سے اُترو اور اپنی تلوار اور بندوق ہمارے حوالے کر دو۔

ہاشم بیگ نے کسی پس وپیش کے بغیر اس کے حکم کی تعمیل کی اور کہا۔ تم لوگوں کو اطمینان رکھنا چاہیے کہ میں یہاں تک پہنچنے کے بعد بھاگنے کی کوشش نہیں کروں گا۔ مجھے ملک جہان خاں کے پاس لے چلو۔

اتنی دیر میں دس آدمی ہاشم بیگ کے گرد جمع ہو چکے تھے۔ ان میں سے ایک نوجوان نے کہا۔ تم دوسری ندی کے پار کوئی نقشہ دیکھ رہے تھے؟

ہاں!

لاؤ وہ نقشہ بھی ہمارے حوالے کر دو۔

ہاشم بیگ نے اپنی جیب سے نقشہ نکال کر اس کے ہاتھ میں دے دیا۔ نوجوان نے نقشہ کھول کر اپنے ساتھیوں کو دکھایا اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا تمہیں معلوم ہے کہ ملک جہان خاں انگریزوں کے جاسوسوں کے ساتھ کیا سلوک کرتے ہیں؟

مجھے معلوم ہے۔ ہاشم بیگ نے جواب دیا۔ میں یہاں سے دو تین میل دور ایک درخت پر لٹکی ہوئی پانچ لاشیں دیکھ چکا ہوں۔ لیکن میں جاسوس نہیں ہوں۔

یہ نقشہ تمہیں کس نے دیا؟

ہاشم بیگ نے کہا۔ دیکھو میں ملک جہان خاں سے ملنا چاہتا ہوں اور میں تمہیں یہ یقین دلاتا ہوں کہ ان کے ساتھ میری ملاقات کے بعد تمہیں ایسے سوالات پوچھنے کی ضرورت پیش نہیں آئے گی۔

نوجوان نے دو عمر رسیدہ آدمیوں کو ایک طرف لے جا کر ان کے ساتھ کچھ دیر باتیں کیں اور پھر ہاشم بیگ کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ ہم تمہاری آنکھوں پر پٹی باندھ کر ملک جہان خاں کے پاس لے چلیں گے۔

ہاشم بیگ نے جواب دیا۔ اگر یہ ضروری ہے تو مجھے کوئی اعتراض نہیں۔

تھوڑی دیر بعد ہاشم بیگ آنکھوں پر پٹی بندھوا کر گھوڑے پر سوار ہو گیا اور ایک آدمی نے باگ پکڑ لی۔

راستے میں ان لوگوں نے ہاشم بیگ سے کوئی ابت نہ کی۔ وہ گھوڑے کی زین پر سے صرف یہ اندازہ لگا سکتا تھا کہ وہ ایک جنگل کے ناہموار اور دشوار گزار راستے سے گزر رہا ہے۔ کوئی تین گھنٹے سفر کرنے کے بعد یہ لوگ رُک گئے اور کسی نے ہاشم بیگ کو گھوڑے سے اترنے کے لیے کہا۔ ہاشم بیگ نے حکم کی تعمیل کی اور کسی نے اس کی آنکھوں سے پٹی کھولتے ہوئے کہا۔ تم یہاں بیٹھ جاؤ۔ ہم ابھی ملک جہان خاں کو اطلاع دیتے ہیں۔

ہاشم بیگ کو تھکاوٹ محسوس ہو رہی تھی۔ وہ ایک درخت کے ساتھ ٹیک لگا کر بیٹھ گا۔ دو آدمی سامنے ایک بلند پہاڑی کی طرف چل دیے اور باقی اس کے گرد بیٹھ گئے۔ ہاشم نے چاروں طرف نظر دوڑائی تو اسے ایک تنگ وادی کا نشیب اور باقی تین اطراف بلند پہاڑیاں دکھائی دیں۔ چند منٹ وہ بے حس و حرکت بیٹھا ان لوگوں کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے جرات سے کام لیتے ہوئے سوال کیا۔ مجھے کب تک یہاں ٹھہرنا پڑے گا؟

ایک آدمی نے جواب دیا ہم نے ملک جہان خاں کو پیغام بھیج دیا ہے انہیں یہاں پہنچنے میں زیادہ دیر نہیں لگے گی۔

قریباً ایک گھنٹہ انتظار کرنے کے بعد ہاشم بیگ کو قریب ہی گھنے درختوں میں گھوڑوں کی ٹاپ سنائی دی۔

وہ آرہے ہیں۔ایک آدمی نے اُٹھتے ہوئے کہا اور اس کے ساتھی کھڑے ہو گئے۔ہاشم بیگ نے بھی ان کی تقلید کی۔

تین سوار ان کے قریب پہنچ کر گھوڑوں سے اُتر پڑے۔ان میں سے ایک کے ہاتھ میں وہ نقشہ تھا جو انہوں نے ہاشم بیگ سے چھینا تھا۔وہ فوراً ہاشم بیگ کی طرف بڑھا اور اسے نقشہ دکھاتے ہوئے بولا۔تم اس نقشے کی مدد سے یہاں تک پہنچے ہو؟

ہاں!ہاشم بیگ نے جواب دیا۔

تم نے یہ کہاں سے حاصل کیا تھا؟

ہاشم بیگ نے جواب دیا۔میں ایسے سوالات کا جواب صرف ملک جہان خاں کو دے سکتا ہوں۔

میں ملک جہاں خاں ہوں اور تمہیں میرے ساتھ کوئی بات کرنے سے پہلے یہی اچھی طرح سوچ لینا چاہیے کہ مجھے جھوٹ اور سچ پرکھنے میں دیر نہیں لگی۔اب بتاؤ کہ یہ نقشہ تم کو کہاں سے ملا؟

یہ نقشہ میں نے آپ کی ایک مفرور قیدی سے حاصل کیا تھا۔اس کے ساتھ میری ملاقات میر قمرالدین کے ہاں ہوئی تھی۔میرے لیے آپ تک رسائی حاصل کرنا ضروری تھا۔

تم مجھے اس شخص کا نام بتا سکتے ہو؟

اس کا نام سراج الدین تھا۔

تم جھوٹ کہتے ہو میں اس نام کے کسی آدمی کو نہیں جانتا۔

ملک جہان خاں کے ساتھی اب ہاشم بیگ کی طرف غضب آلودنگاہوں سے دیکھ رہے تھے۔اس نے سنبھل کر کہا۔ہوسکتا ہے کہ اس مے مجھے اپنا نام غلط بتایا ہو۔

ملک جہان خاں نے اپنے ساتھیوں کیطرف دیکھا اور ایک آدمی جلدی سے درخت پر چڑھ کر اس نے ایک مضبوط شاخ کے ساتھ ایک رسا باندھ کر نیچے لٹکا دیا۔ دو آدمی ہاشم بیگ کو پکڑ کر درخت کے نیچے لے گئے اور انہوں نے رسے کے سرے کا پھندا بنا کر ہاشم بیگ کے گلے میں ڈال دیا۔

ملک جہان خاں نے کہا۔اب بتاؤ تم یہاں کس لیے آئے ہو اور تمہارے ساتھ جو فوج آرہی ہے وہ یہاں سے کتنی دور ہے؟

ہاشم بیگ نے اطمینان سے جواب دیا۔ میں ایک عزیز کی تلاش میں آیا ہوں ۔اور میرے ساتھ کوئی فوج نہیں ائی ہے۔اس کے باوجود اگر مجھے پھانسی دے کر آپ کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو خوشی سے یہ شوق پورا کر لیجیے۔

یہاں تمہارا عزیز کون ہے؟

مُرادعلی۔

ملک جہان خاں چند ثانیے پریشانی اور تذبذب کی حالت میں اس کی طرف دیکھتا رہا۔بالآخر اس نے ہاشم بیگ کے گلے سے پھندا اُتارتے ہوئے کہا۔مُرادعلی کے ساتھ آپ کا کیا رشتہ ہے؟

آپ یہ سمجھ لیجیے کہ وہ میرا بھائی ہے۔

سرنگا پٹم میں جو لوگ مرادعلی کو اپنا بھائی کہہ سکتے ہیں ان کو جانتا ہوں ارو تمہاری شکل وصورت ان سب سے مختلف ہے۔

میرا گھر سرنگا پٹم نہیں حیدرآباد ہے۔

ملک جہان خاں نے جھنجھلا کر کہا۔ تم ابھی کہتے تھے کہ میں سرنگا پٹم سے آ رہا ہوں۔ میرے لیے معما بننے کی کوشش نہ کرو۔ تمہارا نام کیا ہے؟

میرا نام ہاشم بیگ ہے اور میں کئی دن شمال کی سرحد کی خاک چھاننے کے بعد آپ کی جائے پناہ کا پتہ معلوم کرنے کے لیے سرنگا پٹم گیا تھا لیکن اگر آپ مجھے مُراد علی کے سامنے لے جائیں تو یہ معما اسی وقت حل ہو سکتا ہے۔

ملک جہان خاں نے اپنے گھوڑے کی باگ پکڑتے ہوئے اپنے ساتھیوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ تم اسے پڑاؤ میں لے آؤ۔ پھر گھوڑے پر سوار ہوتے ہی اسے ایڑ لگا کر گھنے درختوں میں رُوپوش ہو گیا۔



ہاشم بیگ گھوڑے پر سوار ہو کر باقی آدمیوں کے ساتھ چل دیا۔ تھوڑی دیر بعد وہ بلند پہاڑی کی دوسری طرف ایک اور تنگ وادی میں جگہ جگہ بوسیدہ خیمے اور گھاس پھونس کے چھپر دیکھ رہا تھا۔ وادی میں داخل ہونے کے بعد ایک کُشادہ خیمے کے سامنے اسے ملک جہان خاں اور مُراد علی دکھائی دیے۔ وہ گھوڑے سے چھلانگ لگا بھاگتا ہوا آگے بڑھا لیکن مُراد علی نے منہ پھیر لیا اور ہاشم بیگ کے پاؤں زمین کے ساتھ پیوست ہو کر رہ گئے۔ پھر اس نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا۔ مُراد علی میں ہاشم ہوں۔

مجھے معلوم ہے لیکن آپ کو میری تلاش میں یہاں نہیں آنا چاہیے تھا۔

ہاشم کا دل بیٹھ گیا۔ تاہم اس نے آگے بڑھ کر دونوں ہاتھوں سے اس کا بازو جھنجھوڑتے ہوئے کہا۔ مُراد علی میں بے گناہ ہوں۔

مُراد علی نے جواب دیا۔ آپ کو صفائی پیش کرنے کی ضرورت نہیں۔ مجھے

معلوم ہے آپ نے میرے بھائی کی جان بچانے کی کوشش کی تھی اور میں آپ کا شکر گزار ہوں۔

ہاشم بیگ نے ملتجی ہو کر ملک جہان خاں کی طرف دیکھا اور کہا۔ اگر آپ اجازت دیں تو میں چند منٹ تنہائی میں ان سے باتیں کرنا چاہتا ہوں۔

مُراد علی نے کہا۔ اب باتوں سے کوئی فائدہ نہیں۔ اگر آپ مجھے یہ بتانے آئے ہیں۔ آپ کی سفارش پر انگریزوں نے میری خطائیں معاف کر دی ہیں اور میں اپنے گھر واپس جا سکتا ہوں تو آپ اپنا وقت ضائع کر رہے ہیں۔

مُراد علی کے بازو پر ہاشم بیگ کے ہاتھ کی گرفت اچانک ڈھیلی پڑ گئی اور وہ انتہائی مایوسی اور اضطراب کی حالت میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

مُراد علی نے ملک جہان خاں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ میں اس بات کی ضمانت دے سکتا ہوں کہ یہ ہمارے متعلق کوئی بُرا ارادہ لے کر نہیں آئے۔ آپ انہیں واپس پہنچانے کا انتظام کر دیجیے۔

ہاشم بیگ کچھ کہنا چاہتا تھا لیکن اس کی آواز بیٹھ گئی۔ مُراد علی خیمے کی طرف بڑھا ہاشم چند ثانیہ اپنے ہونٹ بھینچنے کے بعد پوری قوت سے چلایا۔ مُراد ٹھہرو! مجھے ثمینہ نے بھیجا ہے۔

مُراد علی کے پاؤں زمین میں گڑ گئے۔ لیکن وہ مُڑ کر ہاشم بیگ کی طرف دیکھنے کی بجائے گردن جھکائے کھڑا رہا۔

ہاشم بیگ بھاگ کر آگے بڑھا اور اسے بازو سے پکڑ کر اپنی طرف متوجہ کرتے ہوئے بولا۔ مُراد میں نے شہباز اور ان کے والد کی موت پر ثمینہ کی آنکھوں میں آنسو نہیں دیکھے تھے۔ لیکن اب کی وہ رو رہی تھی میں تمہیں لینے آیا ہوں۔

مرادعلی نے مضطرب ہو کر جواب دیا۔ میں نے ثمینہ کے ساتھ وعدہ کیا تھا کہ اگر میں زندہ رہا تو کسی دن ضرور واپس آؤں گا لیکن اب آپ اسے یہ پیغام بھیج دیجیے کہ مُراد مر چکا ہے اور آپ نے جس آدمی کے ساتھ اس جنگل میں ملاقات کی تھی وہ اس کی لاش تھی۔

مُراد میں اطمینان سے بیٹھ کر تمہارے ساتھ چند باتیں کرنا چاہتا ہوں میں نے تمہیں بڑی مشکل سے تلاش کیا ہے۔

بہت اچھا آیئے۔ لیکن مجھے ڈر ہے کہ میرے باتوں سے آپ کو تکلیف ہو گی۔

وہ خیمے میں داخل ہوئے اور چٹائی پر بیٹھ گئے۔ ہاشم بیگ نے کہا۔ مُراد مجھے معلوم ہے کہ میری باتوں سے تمہیں تکلیف ہو گی۔ لیکن تم مجھے اگر یہ سمجھا سکو کہ تمہاری اس جنگ سے اہلِ میسور کو کوئی فائدہ پہنچ سکتا ہے تو میں تمہارا ساتھ دینے کا وعدہ کرتا ہوں۔

مُرادعلی نے جواب دیا۔ دیکھیے ان باتوں سے کوئی فائدہ نہیں ہو گا۔ مجھے معلوم ہے کہ ہم لوگ اس قوم کے گناہوں کا کفارہ ادا نہیں کر سکتے جس کا دامن سُلطانِ شہید کے خون سے آلودہ ہے۔ ہم ان لوگوں کو عزت اور آزادی کا راستہ نہیں دکھا سکتے جن کی صفوں میں میر قمرالدین جیسے غدار گھسے ہوئے ہیں۔ ہم اُس ماضی کو واپس نہیں لا سکتے جس کا ہر لمحہ زندگی کی خواہشات سے لبریز تھا۔ یہ دُنیا ہمارے لیے تاریک ہو چکی ہے۔ ہماری عزت اور آزادی کے دشمن ہم سے زندگی کی تمام راحتیں چھین چکے ہیں۔ اب آخری جو چیز ہمارے لیے رہ گئی ہے وہ عزت کی موت ہے اور وہ ہمیں اس سے محروم نہیں کر سکتے۔ آپ مجھے زیادہ سے زیادہ سمجھا سکتے ہیں کہ ہماری جنگ بے سُود ہے۔ لیکن میرا آخری جواب یہی ہو گا کہ میں آخری دم تک ملک جہان

خاں کا ساتھ دینے کا وعدہ کر چکا ہوں میں آپ کا شکر گزار ہوں کہ آپ نے مجھے ڈھونڈنے میں اتنی تکلیف اٹھائی ہے لیکن مجھے یہ مشورہ نہ دیں کہ میں ملک جہان خاں سے بدعہدی کر کے واپس چلا جاؤں اپنے ساتھیوں سے بدعہدی اور بے وفائی کے بعد میں ان لوگوں کو منہ نہیں دکھا سکوں گا۔ جو مجھے انور علی کا بھائی اور معظم علی کا بیٹا سمجھتے ہیں۔ آپ کچھ اور کہنا چاہتے ہیں؟

ہاشم بیگ نے جواب دیا۔ کچھ نہیں۔ میں اب کچھ نہیں کہنا چاہتا۔ میں یہ محسوس کرتا ہوں کہ اب دلیلوں سے زیادہ آپ کو دُعاؤں کی ضرورت ہے۔

تو میرے لیے یہ دُعا کیجیے کہ زندہ رہنے کی خواہش مجھے قیامت کے دن سرنگاپٹم کے شہیدوں کے ساتھ اٹھنے کی سعادت سے محروم نہ کر دے۔

ہاشم بیگ نے کہا۔ مُراد بعض اوقات لڑنے کی بجائے اپنی تلوار نیام میں ڈالنے کے لیے زیادہ ہمت زیادہ حوصلہ اور زیادہ صبر کی ضرورت ہوتی ہے۔ میں خدا سے دُعا کروں گا کہ آپ کسی دن ان لوگوں کے متعلق بھی سوچ سکیں جنہیں مستقبل کے متعلق اپنے حوصلے اور ولولے بلند رکھنے کے لیے آپ جیسے اولوالعزم انسانوں کی رفاقت اور رہنمائی کی ضرورت ہے۔

میں جانے سے پہلے آپ کی یہ غلط فہمی دُور کر دینا چاہتا ہوں کہ میں آپ کو انگریزوں کی اطاعت قبول کر لینے کا مشورہ دینے آیا تھا۔ نہیں میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں آپ کو صرف قبول کر لینے کا مشورہ دینے آیا تھا۔ نہیں میں آپ کو یہ مشورہ نہیں دے سکتا۔ میں آپ کو صرف یہ بتانے آیا تھا کہ سُلطان ٹیپو کی شہادت کے بعد میسور کی حُریت پسندوں کا آخری قلعہ مسمار ہو چکا ہے۔ لیکن اگر آپ مستقبل کی اُمید پر زندہ رہنے کی کوشش کریں تو خدا کی رحمت سے یہ بعید نہیں کہ

آپ میسور سے باہر کوئی اور قلعہ تلاش کر سکیں۔ میں ملک جہان خاں کے جذبۂ حریت کی قدر کرتا ہوں۔ لیکن وہ ایک ایسی قوم کی ڈھال اور تلوار نہیں بن سکتا جس نے اپنے ہاتھوں سے اپنا گلا گھونٹ ڈالا ہو۔ میں یہ بھی محسوس کرتا ہوں کہ میں آپ کو کوئی نصیحت کرنے کا حق نہیں رکھتا۔ میں ان بدقسمت انسانوں میں سے ہوں جو اپنے ضمیر کی آواز کے خلاف حالات کی مجبوریوں کے سامنے سر جُھکا دیتے ہیں۔

ہاشم بیگ یہ کہہ کر کھڑا ہو گیا۔

مُراد علی نے کہا۔ آپ جا رہے ہیں؟

ہاں اب یہاں میرا کام ختم ہو چکا ہے۔

آپ تھکے ہوں گے لیکن میں آپ کو یہاں ٹھہرنے کی دعوت نہیں دے سکتا۔ ان دنوں ہمیں ہر وقت دشمن کے حملے کا خطرہ ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ آپ لڑائی کے وقت یہاں رہیں۔ مُراد علی یہ کہہ کر اُٹھا اور ہاشم بیگ کے ساتھ خیمے سے باہر نکل آیا۔

تھوڑی دیر بعد ہاشم بیگ کو جنگل سے باہر پہنچانے کے لیے بیس آدمیوں کا قافلہ تیار ہو چکا تھا۔ اس نے ملک جہاں خاں کے ساتھ مُصافحہ کرنے کے بعد مُراد علی کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا۔ میں نے آپ کو ایک بات نہیں بتائی۔ ثمینہ یہ کہتی تھی کہ وہ مرتے دم تک آپ کا انتظار کرے گی۔ ہاں مجھے ایک اور بات یاد آ گئی۔ تمہارے بھائی نے مرتے وقت جواہرات کی ایک تھیلی میرے حوالے کی تھی۔ میں تمہاری یہ امانت ثمینہ کے پاس چھوڑ آیا ہوں۔ اگر تم وہاں جانا پسند نہیں کرتے تو اپنی امانت کسی آدمی کو بھیج کر منگوا لینا۔

مُراد علی نے اس کا ہاتھ پکڑتے ہوئے کہا۔ آپ وہاں جائیں گے؟

ہاں پہلے میں وہاں جاؤں گا۔

ثمینہ سے کہیے۔ مُراد علی اپنا فقرہ پورا کرنے کی بجائے ہاشم بیگ کی طرف دیکھتا رہا۔

کیا کہوں؟ بولو مُراد خاموش کیوں ہو گئے؟

کچھ نہیں۔ خدا حافظ! مُراد علی یہ کہہ کہ لمبے لمبے قدم اُٹھاتا ہوا خیمے کی طرف چل دیا۔ خیمے میں داخل ہونے کے بعد وہ نڈھال سا ہو کر چٹائی پر لیٹ گیا۔ باہر گھوڑوں کی ٹاپیں سنائی دے رہی تھیں۔ ملک جہان خاں خیمے میں داخل ہوا اور وہ اُٹھ کر بیٹھ گیا۔

جہان خاں نے کہا۔ مُراد اگر تم جانا چاہتے ہو تو میں تم پر کوئی پابندی عائد نہیں کرونگا۔ مُراد علی نے کچھ کہے بغیر سر پھیر دیا۔

چند دن بعد ہاشم بیگ، بلقیس اور ثمینہ کے سامنے اپنے سفر کے واقعات بیان کر رہا تھا اور ثمینہ ماں اور بہنوئی کو قائل کرنے سے زیادہ اپنے دل کو جھوٹی تسلی دینے کے لیے بار بار یہ کہہ رہی تھی۔ وہ ضرور آئیں گے۔ بھائی جان وہ ضرور آئیں گے۔ امی جان مجھے یقین ہے کہ وہ ضرور آئیں گے۔

اکتیسواں باب

بلقیس کے ہاں قریباً ایک ہفتہ قیام کرنے کے بعد ہاشم بیگ ادھونی واپس چلا گیا اس کے بعد ثمینہ کچھ عرصہ جہان خاں کی سرگرمیوں کے متعلق مختلف اور متضاد خبریں سنتی رہی۔ کبھی یہ خبر آتی کہ وہ جنوب کی طرف پیش قدمی کرنے کے بعد فلاں علاقہ فتح کر چکا ہے اور کبھی یہ خبر آتی کہ وہ فلاں مقام پر انگریزوں کے ہاتھوں شکست کھانے کے بعد پسپا ہو چکا ہے۔

۱۸۰۰ء کے موسمِ برسات میں انگریزوں کے لیے **ملک** جہان خاں کی سرگرمیاں کافی پریشان کن ثابت ہو رہی تھیں۔ لیکن میسور کی ہمسایہ ریاستوں کے حکمرانوں کی غیر جانبداری کے باعث جہان خاں کا اکا دکا لڑائیاں ایک وسیع پیمانے پر جنگ آزادی کا پیش خیمہ نہ بن سکیں۔ گزشتہ جنگوں میں اس کے کئی ساتھی مارے جا چکے تھے۔ اور کئی مایوس اور بد دل ہو کر اس کا ساتھ چھوڑ چکے تھے۔ انگریزوں نے ان سرفروشوں کی جماعت کے ساتھ اپنے جاسوسوں کی ایک اچھی خاصی تعداد شامل کر دی تھی۔ یہ لوگ ایک طرف جہان خاں کے ساتھیوں میں مایوسی اور بد دلی پھیلاتے اور دوسری طرف انگریزوں کو جہان خاں کی سرگرمیوں سے باخبر رکھتے۔

موسمِ برسات کے اختتام پر میسور کی شمالی سرحد سے اس قسم کی خبریں آ رہی تھیں کہ کرنل آرتھر ولزلی جسے ایسٹ انڈیا کمپنی نے **ملک** جہان خاں کی سرکوبی کی مہم سونپی تھی ایک بھاری لشکر کے ساتھ شمالی سرح کے جنگلوں اور پہاڑوں میں باغیوں کا پیچھا کر رہا ہے۔ پھر ایک دن یہ خبر مشہور ہوئی کہ **ملک** جہان خاں ایک خونریز معرکے میں شکست کھانے کے بعد شہید ہو چکا ہے اور کرنل ولزلی کے دستے ان کے رہے سہے ساتھیوں کی سرکوبی میں مصروف ہیں

بلقیس نے صحیح حالات معلوم کرنے کے لیے گاؤں کا ایک آدمی ہاشم بیگ کے پاس بھیجا۔ ہاشم بیگ نے اس خط کے جواب میں ملک جہان خاں کی موت کی خبر کی تصدیق کردی۔ لیکن مراد علی کے بارے میں اس کا جواب یہ تھا کہ مجھے انتہائی کوشش کے باوجود اس کا کوئی سراغ نہیں ملا۔

ملک جہان خاں کی موت کی خبر سننے کے بعد مراد علی کے متعلق ثمینہ کی بے قراری اور بے چینی میں آئے دن اضافہ ہوتا گیا۔ انتظار کے لمحات اسے برسوں سے زیادہ طویل محسوس ہوتے تھے۔ ماہِ اکتوبر کی ایک شام وہ حسب معمول تنہا اپنے مکان کی چھت پر کھڑی تھی۔ ہوا خوشگوار تھی۔ گاؤں کے چرواہے اور کسان دن بھر کی محنت و مشقت کے بعد اپنے گھروں کو واپس آرہے تھے۔ دُور دُور کی بستیوں کے گھروں سے ہلکا ہلکا دھواں اُٹھ رہا تھا۔ گاؤں کی فضا اردگرد درختوں پر جمع ہونے والے پرندوں کے چہچہوں سے لبریز تھی۔

تھوڑی دیر بعد گاؤں پر رات کا سکوت طاری ہوگیا اور آسمان پر اکا دکا ستارے نظر آنے لگے۔ پھر مشرق کی ایک پہاڑی کے عقب سے چاند نمودار ہونے لگا۔ ڈیوڑھی سے باہر آنکھ مچولی کھیلنے والے بچوں کے قہقہے سنائی دے رہے تھے۔ ثمینہ تھوڑی دیر چھت پر ٹہلنے کے بعد منڈیر پر بیٹھ گئی۔ چاند اب پوری آب و تاب کے ساتھ نمودار ہو چکا تھا۔ نیچے مردانہ حویلی کے صحن میں نوکر باتیں کر رہے تھے۔ تھوڑی دیر بعد گاؤں کی مسجد سے عشاء کی اذان سنائی دینے لگی۔ ثمینہ نیچے جانے کا ارادہ کر رہی تھی کہ اسے ڈیوڑھی کی طرف گھوڑے کے قدموں کی آہٹ سنائی دی اور وہ آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ ایک گھوڑا جس کا سوار زین پر جھکا ہوا تھا۔ آہستہ آہستہ قدم بڑھاتا ہوا ڈیوڑھی کے راستے بیرونی صحن میں داخل ہوا۔

کون ہے؟ ایک نوکر نے کہا۔

سوار نے کوئی جواب دیے بغیر گھوڑے سے اترنے کی کوشش کی لیکن زمین پر پاؤں رکھتے ہی وہ منھ کے بل گر پڑا۔ نوکر بھاگتے ہوئے اس کی طرف بڑھے۔

یہ کون ہے؟ اسے کیا ہوا؟

یہ زخمی ہے۔ یہ بے ہوش ہے۔ یہ بیمار ہے۔ وہ ایک دوسرے کو سمجھانے کی کوشش کر رہے تھے۔

ثمینہ اُٹھ کر زینے کی طرف بڑھی۔ اس کا دل دھڑک رہا تھا اور اس کی ٹانگیں لڑکھڑا رہی تھیں۔ وہ نیچے اتر کر باہر کی حویلی کیطرف بڑھی۔ پیچھے سے ماں کی آواز آئی۔ ثمینہ کہاں جا رہی ہو؟

ثمینہ نے مُڑ کر دیکھے بغیر جواب دیا۔ امی جان میں یہیں ہوں۔ میں ابھی آتی ہوں۔

اتنی دیر میں نوکر نووارد کو ایک کھاٹ پر لٹا چکے تھے۔ منور خاں ثمینہ کو دیکھ کر چلایا۔

بی بی جی۔ یہ آ گئے۔ میرا خواب درست نکلا۔ لیکن یہ بے ہوش ہیں۔ یہ بخار سے جل رہے ہیں۔ اگر گاؤں میں کوئی اچھا طبیب ہو تو اسے بلوائیے!

ثمینہ کی نگاہیں نووارد کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ چند ثانیے بے حس و حرکت کھڑی رہی۔ پھر وہ اچانک آگے بڑھی اور مراد علی کی نبض پر ہاتھ رکھتے ہوئے چلائی۔ انھیں اندر لے چلو اور طبیب کو فوراً بلاؤ۔ منور تم امی جان کو اطلاع دو۔



کوئی ایک گھنٹے بعد مراد علی نے ہوش میں آ کر آنکھیں کھولیں تو وہ ایک کمرے

میں لیٹا ہوا تھا۔ ایک عمر رسیدہ طبیب اس کی زخمی بازو پر پٹی باندھ رہا تھا اور گھر کے نوکر اور گاؤں کے چند آدمی اس کے گرد جمع تھے۔ اس نے اِدھر اُدھر دیکھنے کے بعد منور خاں کی طرف نظریں گاڑ دیں اور اسے پانی لانے کے لیے کہا۔

منور بھاگتا ہوا باہر نکلا اور پانی کا کٹورا لے آیا۔ مراد علی نے پانی پینے کے لیے سر اٹھایا لیکن نقاہت کے باعث اس کی آنکھوں کے سامنے اندھیرا چھا گیا اور اس نے دوبارہ اپنا سر تکیے پر رکھ دیا ایک آدمی نے جلدی سے بڑھ کر اسے سہارا دیا اور پانی کے چند گھونٹ پلانے کے بعد دوبارہ لٹا دیا۔

طبیب نے مرہم پٹی سے فارغ ہونے کے بعد اسے ایک دوائی پلائی اور کمرے میں جمع ہونے والے لوگوں کی طرف متوجہ ہو کر کہا۔ انہیں آرام کی ضرورت ہے اس لیے آپ تشریف لے جائیں۔

وہ یکے بعد دیگرے کمرے سے نکل گئے۔ لیکن منور اپنی جگہ کھڑا رہا۔ مُراد علی نے نحیف آواز میں کہا۔ منور تم کیسے پہنچ گئے؟

منور کی آنکھوں سے آنسو اُمڈ آئے اور کچھ دیر اس کے حلق سے آواز نہ نکل سکی۔ بالآخر اس نے اپنی سسکیاں ضبط کرتے ہوئے کہا۔ مجھے ہاشم بیگ صاحب نے یہاں بھیج دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ آپ یہاں پہنچ چکے ہوں گے۔

مُراد علی نے اس کا ہاتھ پکڑ لیا اور آنکھیں بند کر لیں۔ منور کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا اور جب مراد علی نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا تو وہ مضطرب سا ہو کر چلایا۔

بھائی جان! بھائی جان!

طبیب جلدی سے اس کی نبض ٹٹولنے لگا۔

مُراد علی نے آنکھیں کھولیں اور اپنے ہونٹوں پر مسکراہٹ لاتے ہوئے کہا میں

ٹھیک ہوں۔ مجھے نیند آرہی ہے۔ میں بہت تھک گیا ہوں۔ آپ تھوڑا سا دودھ پی لیں۔ طبیب نے کہا۔

نہیں ابھی نہیں، مراد علی نے آنکھیں بند کرتے ہوئے جواب دیا، طبیب نے منور کی طرف متوجہ ہوکر کہا، میں جاتا ہوں تم بیگم صاحبہ کو اطلاع دے دو، اب ان کی طبیعت ٹھیک ہے، لیکن انھیں آرام کی اشد ضرورت ہے، اگر رات کے وقت ضرورت پڑے تو مجھے اطلاع دیں،

مراد علی کی آنکھ کھلی تو صبح ہو چکی تھی، روشن دان سے سورج کی ابتدائی کرنیں کمرے میں آرہی تھیں۔ ثمینہ اس کے بستر کے قریب ایک کرسی پر بیٹھی سو رہی تھی، اور منور دروازے کے پاس ایک چٹائی پر لیٹا خراٹے لے رہا تھا، ثمینہ کی گردن ایک طرف جھکی ہوئی تھی، اور بالوں کی ایک لٹ اس کے چہرے پر بکھری ہوئی تھی۔

یہ کمرہ وہی تھا جہاں ثمینہ کے ساتھ اس کی آخری ملاقات ہوئی تھی، شہباز کی یادگاریں اس طرح پڑی ہوئی تھیں۔ کچھ دیر وہ بستر پر پڑا ثمینہ کی طرف دیکھتا رہا۔ پیاس کی شدت سے اس کا گلا خشک ہو رہا تھا، اس کے بستر کے دائیں طرف ایک تپائی پر پانی کی صراحی پڑی ہوئی تھی، مراد علی ثمینہ یا منور کو آواز دینے کی بجائے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ اس نے صراحی سے پانی کا ایک کٹورہ بھر کر پیا، اور جب وہ دوسری بار کٹورے میں پانی ڈال رہا تھا۔ تو ثمینہ نے اچانک آنکھیں کھول دیں۔ مراد علی کی طرف ایک نظر دیکھنے کے بعد اس نے جلدی سے آگے بڑھ کر اس کے ہاتھ سے صراحی پکڑ لی۔ اور کٹورے میں پانی بھر کر اسے پیش کر دیا۔ مراد علی کا سر چکرا رہا تھا، وہ پانی پینے کے بعد لیٹ گیا، اور ثمینہ اپنے بالوں کو درست کرتی ہوئی کرسی سے اٹھی،

اور اس نے کہا، امی جان رات کے وقت آپ کے لیے دودھ لائی تھیں، اور وہ یہاں پڑا پڑا خراب ہو گیا۔ آپ سو رہے تھے۔ ہم نے جگانا مناسب نہیں سمجھا۔ امی جان ابھی اٹھ کر گئی ہیں۔ آپ کو بھوک لگی ہو گی، میں تازہ دودھ لے آؤں؟۔

مراد علی نے نحیف آواز میں کہا ثمینہ بیٹھ جاؤ۔

وہ سر جھکا کر بیٹھ گئی، اور کچھ دیر توقف کے بعد بولی، رات کے وقت آپ کو بہت بخار تھا۔ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے؟

میں ٹھیک ہوں، راستے میں مجھے بار، بار یہ خیال آتا تھا کہ میں شاید یہاں تک نہ پہنچ سکوں، رات کے وقت مجھے یہ بھی معلوم نہ تھا کہ میں کہاں ہوں، میں ایک مدت بعد اس طرح سویا ہوں، مجھے افسوس ہے کہ میں نے آپ کو اتنی تکلیف دی، آپ شاید ساری رات نہیں سوئیں۔

مجھے یقین تھا آپ ضرور آئیں گے۔ یہ کہتے ہوئے ثمینہ نے ذرا گردن اٹھا کر مراد علی کی طرف دیکھا

اس کی آنکھوں میں آنسو چھلک رہے تھے۔ مراد علی نے کہا، ثمینہ میرے لیے ساری دنیا میں اس گھر کے سوا کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ میں تمہارا شکر گزار ہوں۔

ثمینہ نے جلدی سے اپنے آنسو پونچھ ڈالے، اور گفتگو کا موضوع بدلتے ہوئے کہا، گاؤں کا طبیب زیادہ تجربہ کار نہیں۔ امی جان نے ادھونی میں بھائی جان ہاشم بیگ کو پیغام بھیج دیا ہے۔ کہ وہ کوئی اچھا طبیب لے کر یہاں پہنچ جائیں۔

مراد علی نے کہا، انھیں تکلیف دینے کی ضرورت نہیں تھی۔ میں امی جان کو اطلاع دیتی ہوں۔ ثمینہ یہ کہہ کر اٹھی، اور کمرے سے باہر نکل گئی۔

رہائشی مکان کا صحن عبور کرنے کے بعد وہ ایک کمرے میں داخل ہوئی۔ بلقیس

جس نے کہ ساری رات اس کے ساتھ آنکھوں میں کاٹی، اپنے بستر پر پڑی گہری نیند سو رہی تھی۔ ثمینہ بے اختیار آگے بڑھی اور اس کے ساتھ لپٹ کر سسکیاں لینے لگی۔

ماں نے انتہائی گھبراہٹ کی حالت میں کہا، کیا ہوا ثمینہ بولتی کیوں نہیں، مراد کیسا ہے،، امی جان،، امی جان وہ ٹھیک ہیں۔ وہ ابھی میرے ساتھ باتیں کر رہے تھے۔



تھوڑی دیر بعد بلقیس اور ثمینہ مراد علی کے پاس بیٹھی ہوئی تھیں۔ اور وہ انھیں اپنی سرگزشت سنا رہا تھا۔ انگریزوں کے ساتھ اپنی آخری جنگ اور اپنے زخمی ہونے کے واقعات بیان کرنے کے بعد اس نے بلقیس سے مخاطب ہو کر کہا، چچی جان شکست کے بعد میسور کی حدود میں میرے لیے کوئی جائے پناہ نہ تھی۔ انگریزوں نے میرے سر کی قیمت مقرر کر رکھی تھی۔ میرے ساتھ پچاس آدمیوں نے سرحد کے ایک مرہٹہ سردار کے پاس پناہ لی تھی۔ ہم اسے اپنا دوست سمجھتے تھے، وہ گزشتہ لڑائیوں میں درپردہ ہماری مدد کرتا تھا۔ لیکن ملک جہان خاں کی موت کے بعد دنیا بدل چکی تھی۔ اور ہمیں پتا چلا کہ یہ شخص ہمیں انگریزوں کے حوالے کرنا چاہتا تھا۔ اس کے ایک رشتہ دار نے ہمیں باخبر کر دیا۔ اور ہم وہاں سے نکل آئے۔ زخمی اور بیمار ہونے کے باعث میں زیادہ دیر تک اپنے دوستوں کا ساتھ نہ دے سکا۔ اور وہ میرے اصرار پر مجھے جنگل کی ایک بستی میں چھوڑ کر چلے گئے، اس بستی کے کسان اور چرواہے نہایت نیک دل ثابت ہوئے۔ لیکن میری حالت بہت خراب تھی۔ اور مجھے وہاں مرنا پسند نہ تھا۔

بلقیس نے آب دیدہ ہو کر کہا، بیٹا تم یہاں سیدھے کیوں نہ آئے۔

چچی جان مجھے ڈر تھا کہ آپ میری وجہ سے کسی مشکل میں نہ پھنس جائیں۔ اور اب بھی میں جلد از جلد یہاں سے نکل جانا چاہتا ہوں۔ میں سواری کے قابل ہوتے ہی آپ سے اجازت چاہوں گا۔ ثمینہ کے چہرے پر غم کے بادل چھا گئے۔

بلقیس نے کہا بیٹا یہاں تمہیں کوئی خطرہ نہیں، اگر کوئی مشکل پیش آئی تو مجھے یقین ہے کہ ہاشم تمہاری مدد کر سکے گا۔ حیدر آباد اور ادھونی کے کئی با اثر حکام اس کے دوست ہیں۔

مراد علی نے کہا چچی جان جو امراء دکن کی حکومت کو سلطان ٹیپو کے قتل میں حصہ دار بننے سے نہیں روک سکے۔ وہ میرے لیے کچھ نہیں کر سکتے۔ نظام نے انگریزوں کی خوشنودی حاصل کرنے کے لیے صرف اہل میسور کے قتل عام میں حصہ ہی نہیں لیا۔ بلکہ اپنی رعایا کو بھی بے دست و پا کر کے ان کے آگے ڈال دیا۔ اس سے یہ توقع رکھنا خود فریبی ہے۔ کہ وہ میری خاطر اپنے انگریز آقاؤں کو ناراض کرنا پسند کرے گا۔ اگر مجھ اس سے کوئی نیک سلوک کی توقع ہوتی تو بھی میں اس کی پناہ لینا گوارہ نہ کرتا، اگر مجھے یہ یقین ہو جائے کہ اب ذلت اور غلامی کی زندگی اختیار کیے بغیر کوئی چارہ نہیں، تو بھی میں ایسے آقا کی اطاعت قبول نہیں کروں گا جو خود انگریزوں کا غلام ہو۔

لیکن تم کہاں جاؤ گے؟ بلقیس نے مغموم لہجے میں سوال کیا۔

مراد علی نے جواب دیا،، چچی جان میں ایک ایسا ملک دیکھ آیا ہوں جس کے کسان اور چرواہے ابھی تک آزادی کے گیت گا رہے ہیں، میں افغانستان جاؤں گا۔ مجھے یقین ہے وہ لوگ مجھے مایوس نہیں کریں گے۔ جنھیں دلی کے مسلمانوں کی فریاد پانی پت کے میدان میں لے آئی تھی، دریائے کابل کے کنارے ایک چھوٹی

سی بستی ہے، اور اس بستی کا عمر رسیدہ سردار پانی پت کے مجاہدوں کے ساتھ تھا۔ وہ چچا اکبر خاں اور ابا جان کو جانتا تھا۔ اور اس نے مجھے آپ کے قبیلے کے ان لوگوں کا پتا دیا تھا۔ جو روہیل کھنڈ سے ہجرت کرنے کے بعد وہاں آباد ہو گئے تھے۔

ثمینہ کچھ کہنا چاہتی تھی۔ لیکن اس کی قوت گویائی گویا جواب دے چکی تھی۔ بلقیس نے انتہائی کرب کی حالت میں مراد علی کی طرف دیکھا۔ اور کہا بیٹا تم افغانستان کے تازہ حالات سے باخبر نہیں ہو۔ وہاں خانہ جنگی شروع ہو چکی ہے اور زمان شاہ کے متعلق تو یہاں تک مشہور ہے، کہ وہ باغیوں کے ہاتھوں شکست کھا کر بھاگ چکا ہے۔

مراد علی نے کہا چچی جان میں اپنے مصائب کے بدترین ایام میں بھی افغانستان کے حالات سے بے خبر نہیں تھا۔ میں زمان شاہ کے متعلق تمام افواہیں سن چکا ہوں۔ اور ممکن ہے یہ افواہیں صحیح ہوں۔ لیکن اگر قوم زندہ ہو تو وہ بدترین حالات کو بھی اپنے لیے سازگار بنا لیتی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ افغانستان کے باشندے زمان شاہ کے بعد بھی آزادی کے پرچم کو سرنگوں نہیں ہونے دیں گے، جب کوئی بیرونی خطرہ پیش آئے گا، تو افغان سرداروں کو متحد اور منظم ہونے میں دیر نہیں لگے گی۔ ان تشویش ناک خبروں نے افغانستان جانے کے متعلق میرا ارادہ اور بھی پختہ کر دیا ہے۔ ممکن ہے میں ان لوگوں کی خدمت کر سکوں۔ اور انھیں انگریزی استبداد کیا س سیلاب کی تندی و تیزی سے آگاہ کر سکوں، جو میسور کے عظیم قلعے مسمار کرنے کے بعد بڑی تیزی سے شمال کی طرف بڑھ رہا ہے۔ میں احمد شاہ ابدالی کے پاس اسلام کی ان بیٹیوں کی فریاد لے کر جاؤں گا۔ جنھوں نے اپنی آنکھوں سے سرنگاپٹم کا روز قیامت دیکھا تھا۔ میں انھیں یہ بتاؤں گا کہ قوموں کی عزت اور آزادی کے

لیے اندرونی غدار کس قدر خطرناک ثابت ہوتے ہیں۔ اسلام کی ناموس کے رکھوالو تمسر نگ اپٹم ک یواقعات سے سبق سیکھو، اگر تمھاری صفوں میں کوئی میر صادق ہے۔ تو وقت آنے سے پہلے اس سے نجات حاصل کر لو۔ اگر تم بیرونی خطرات سے آنکھیں بند کرکے آپس میں الجھ گئے تو تمہارا انجام ہم سے مختلف نہ ہوگا۔

مراد علی جوش کی حالت میں بستر سے اٹھ کر بیٹھ گیا۔ بلقیس اضطراب کی حالت میں اٹھ کر آگے بڑھی اور اس کی پیشانی پر ہاتھ رکھتے ہوئے بولی۔ بیٹا تم کو بخار ہے۔ لیٹ جاؤ۔ جب تم تندرست ہو جاؤ گے تم میں تمہارا راستہ نہیں روکوں گی۔

وہ لیٹ گیا۔ بلقیس نے ثمینہ کی طرف دیکھا اور کہا آؤ بیٹی انھیں آرام کرنے دو۔

چار دن بعد ادھونی کا طبیب بلقیس کے گھر پہنچ گیا، اور اس نے مراد علی کے ساتھ رسمی علیک سلیک کے بعد اپنی جیب سے ایک خط نکال کر اسے پیش کر دیا۔

مراد علی نے خط کھول کر پڑھا۔ ہاشم بیگ نے لکھا تھا۔

عزیز بھائی خدا کا شکر ہے آپ خالہ جان کے پاس پہنچ گئے ہیں۔ میں ادھونی کے قابل ترین طبیب حکیم مصطفٰے کو آپ کے پاس علاج کے لئے بھیج رہا ہوں۔ میں خود حاضر ہونا چاہتا تھا، لیکن مجھے شاید ایک ہفتے تک چھٹی نہ مل سکے۔ تنویر اور امی جان میرے ساتھ ہیں۔ اور وہ بھی آپ کو دیکھنا چاہتی ہیں۔ ہم انشا اللہ زیادہ سے زیادہ دس یا پندرہ دن تک آپ کے پاس پہنچ جائیں گے۔

تمہارا بھائی ہاشم

حکیم مصطفٰے کا علاج شروع کرنے سے پانچ دن بعد مراد علی کا بخار اتر چکا تھا۔ اور اس کا زخم آہستہ آہستہ مندمل ہو رہا تھا۔ آٹھ دن بعد اس نے پہلی بار گھر سے نکل

کرگاؤں کی مسجد میں نماز ادا کی ۔اور اس سے اگلے روز حکیم مصطفےٰ خاں واپس چلا گیا۔



مراد علی کی علالت کے ایام میں ثمینہ یہ بات بڑی شدت کے ساتھ محسوس کرتی تھی کہ زمانے کے انقلاب نے ان کے درمیان ایکنا قابل عبور دیوار کھڑی کر دی ہے۔اس کی آمد سے قبل وہاں جنگلوں اور پہاڑوں کا تصور کیا کرتی تھی ، جہاں ملک جہان خان کے ساتھی مصروف پیکار تھے۔ان سرپھروں کی رفاقت میں مراد علی کی زندگی کی مختلف تصویریں اس کی آنکھوں کے سامنے آجاتیں۔کبھی وہ دیکھتی کہ وہ جنگ کے میدان میں شمشیر بکف کھڑا ہے۔اور اسے بندوقوں کے دھماکے،تلواروں کی جھنکار اور زخمیوں کی چیخیں سنائی دینے لگتیں۔کبھی وہ یہ دیکھتی کہ وہ بھوکے پیاسے زخمیوں کے ساتھ کسی تاریک غار میں پڑا ہوا ہے۔اور دشمن کی افواج جنگلوں اور پہاڑوں میں اسے تلاش کر رہی ہے۔رات کو سوتے وقت یہ اضطراب انگیز خیالات بھیانک سپنوں میں تبدیل ہو جاتے۔

باغیوں کی شکست اور ملک جہان خاں کی موت کی خبر سننے کے بعد اس کا اضطراب جنون کی حد تک پہنچ چکا تھا۔تاہم اس کی یہ امید آخری وقت قائم رہی کہا گر مراد علی زندہ ہےتو وہ ضرور آئے گا۔وہ اس حقیقت سے بے خبر نہیں ہوسکتا کہ میری زندگی کا ہر لمحہ اس کی یاد سے لبریز ہے۔

وہ اٹھتے ، بیٹھتے ،سوتے ، جاگتے اس کی واپسی کا تصور کیا کرتی۔پھر بارگاہ ایزدی میں اسکی دعائیں مستجاب ہوئیں ،اور مراد علی اس کے گھر پہنچ گیا۔لیکن یہ وہ

نوجوان نہ تھا جو چند برس قبل اس سے دوبارہ ملنے کا وعدہ کر کے رخصت ہوا تھا۔ جس کے تصورات سے اس کی امیدوں اور سپنوں کی دنیا آباد تھی۔ مراد علی بدل چکا تھا۔ اب اس کی اجڑی ہوئی دنیا میں ثمینہ کے لیے کوئی جگہ نہ تھی۔ افغانستان کا ارادہ ظاہر کرنے کے بعد اس نے مستقبل کے متعلق ثمینہ کی آرزوں اور امیدوں کے ٹمٹماتے چراغ بجھا دیے تھے۔

اسے یہ شکایت نہ تھی کہ وہ افغانستان کیوں جا رہا ہے۔ ثمینہ کو صرف یہ گلہ تھا کہ مراد نے اپنے زخموں کا مداوا کرتے وقت اسے قطعاً نظر انداز کر دیا تھا۔ کاش وہ صرف ایک بار یہ کہہ سکتا کہ ہمیں مستقبل کی تاریکیوں کا مقابلہ کرنے کے لیے ایک دوسرے کے سہارے کی ضرورت ہے۔ اگر تم چاہو تو میں تمہارے لیے دریائے کابل کے کنارے ایک جھونپڑی تعمیر کر سکتا ہوں۔

وہ بار، بار یہ سوچتی کہ کیا یہ ہو سکتا ہے کہ مراد علی میرے احساست سے بالکل غافل ہو۔ کیا میرے تمام سپنوں کی تعبیر یہی تھی کہ وہ یہاں چند دن کے لیے آئے اور پھر ہمیشہ کے لیے کہیں چلا جائے۔۔۔ وہ اپنے دل میں شکایات کا ایک طوفان لیے ہوئے داخل ہوتی، لیکن مراد علی کا نحیف و لاغر چہرہ اور اس کی کھوئی، کھوئی آنکھیں اس کے ہونٹوں پر مہر لگا دیتیں۔ وہ ایک ثانیہ کے لئے ثمینہ کی طرف دیکھتا اور پھر نگاہیں کمرے کی چھت یا کسی دیوار کی طرف گاڑھ دیتا۔ اور وہ انتہائی کوشش کے باوجود اس سے زیادہ کچھ نہ کہہ سکتی کہ اب آپ کی طبیعت کیسی ہے۔

ادھونی کے طبیب کی واپسی کے دو دن بعد ایک دوپہر مراد علی نیم خوابی کی حالت میں بستر پر پڑا ہوا تھا۔ ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی۔ مراد علی نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔ اور وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ وہ بولی ہاشم بھائی جان اور تنویر آپا کا پیغام

آیا ہے۔وہ ادھونی سے روانہ ہو چکے ہیں۔

اور کل یا پرسوں تک پہنچ جائیں گے۔منور کہتا تھا کہ آج آپ سیر کے لیے گئے تھے۔حکیم صاحب نے تاکید کی تھی کہ ابھی چند دن تک چلنے پھرنے سے پرہیز کیا جائے۔

میں زیادہ دور نہیں گیا تھا۔

ثمینہ چند ثانیے تذبذب کی حالت میں کھڑی رہیاور پھر آہستہ، آہستہ قدم بڑھاتی ہوئی دروازے کی طرف بڑھی۔

ثمینہ مراد علی نے کہا۔

وہ رک گئی اور مڑ کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔

بیٹھ جاؤ ثمینہ میں تم سے کچھ کہنا چاہتا ہوں۔

ثمینہ نے اپنے دل میں کچھ خوشگوار دھڑکنیں محسوس کیں۔اور وہ آگے بڑھ کر اس کے دائیں ہاتھ کرسی پر بیٹھ گئی۔

ثمینہ مراد علی نے قدرے توقف سے کہا،، تم مجھ سے خفا ہو۔

،، وہ کس بات پر؟ ثمینہ نے اس کی طرف دیکھے بغیر گھٹی ہوئی آواز میں کہا۔

تم اس بات پر خفا ہو کہ میں افغانستان جا رہا ہوں۔

ثمینہ نے اپنے ہونٹوں پر مغموم مسکراہت لاتے ہوئے کہا میرے خفا ہونے سے کیا ہوتا ہے۔

ثمینہ میں تم سے یہ کہنا چاہتا ہوں کہ پہلی بار جب میں آخری بار تم سے رخصت ہوا تھا، ت ومیسور کے افق پر ایک تاریک اندھی کے آثار دیکھنے کے باوجود میری دنیا زندگی کے ولوں سے لبریز تھی۔اور مجھے یقین تھا کہ میں کسی دن واپس آ کر روئے

زمین کی تمام خوشیاں تمہارے قدموں میں ڈھیر کر دوں گا۔ میں تمھیں اس وطن اور اس گھر کی زینت بناؤں گا۔ جو تمھارے وطن اور تمھارے گھر سے بہتر ہے۔ لیکن اب میری دنیا بدل چکی ہے میرا کوئی گھر نہیں میرا کوئی وطن نہیں۔ میں وہ تہی دست مسافر ہوں جس کا قافلہ لٹ چکا ہے۔ اب میں تمھیں اپنے آلام و مصائب میں اپنا حصہ دار نہیں بنا سکتا۔ میں ہاشم بیگ سے ملتے ہی یہاں سے چلا جاؤں گا۔ مجھے آپ کی مجبوریوں کا علم ہے اور میں آپ کا راستہ نہیں روک سکتی۔ لیکن آپ یہاں سے تنہا نہیں جائیں گے۔ ثمینہ یہ کہہ کر اٹھی اور دروازے کی طرف چل دی۔

ثمینہ، ثمینہ مراد علی نے لرزتی ہوئی آواز میں کہا

اور وہ دروازے کے قریب رک کر اس کی طرف دیکھنے لگی۔ مراد علی نے کرب انگیز لہجے میں کہا، تم ایک ایسے انسان کی رفاقت قبول کرلو گی جس کے دامن میں کانٹوں کے سوا کچھ نہیں

ثمینہ جواب دینے کی بجائے مسکرائی اور اس کے ساتھ ہی اس کی آنکھوں سے آنسو امڈ پڑے۔

ثمینہ میری بات کا جواب دو میں شہباز کی بہن اور سردار اکبر خان کی بیٹی سے پوچھتا ہوں۔ کیا وہ ایک معمولی چرواہے یا کسان کے ساتھ ایک تنگ جھونپڑے میں زندگی بسر کر سکے گی۔

اس نے جواب دیا آپ کی تنگ جھونپڑی مجھے نظام کے محلات سے زیادہ کشادہ نظر آئے گی۔

بلقیس کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے کہا بیٹا ہاشم بیگ کا پیغام آیا ہے۔

ہاں چچی جان مجھے ثمینہ نے بتایا ہے۔

بلقیس ایک کرسی پر بیٹھ گئی اور ثمینہ کمرے سے باہر نکل گئی۔

مراد علی نے کہا چچی جان اگر آپ کی اجازت ہو تو میں کچھ کہوں، بلقیس شفقت آمیز نگاہوں سے اس کی طرف دیکھ کر بولی، کہو بیٹا۔

مراد علی کچھ دیر مذبذب سا اس کی طرف دیکھتا رہا۔ بالآخر اس نے کہ اچچی جان لوگ کہتے ہیں کہ رات کی تاریکی میں انسان کا سایہ بھی ساتھ چھوڑ دیتا ہے۔ لیکن آپ ک یپاس آ کر میں نے یہ محسوس کیا ہے کہ میں تنہا نہیں ہوں۔۔۔ میں آپ سے یہ کہنا چاہتا تھا کہ۔۔۔

تم کیا کہنا چاہتے تھے بیٹا خاموش کیوں ہو گئے؟

چچی جان اس نے اپنی آنکھوں میں آنسو بھرتے ہوئے کہا۔ آج ثمینہ کے ساتھ گفتگو کے بعد میں اپنے دل میں زندگی کے دامن کی طرف ہاتھ بڑھانے کی ضرورت محسوس کرتا ہوں۔ میرا حال آپ سے پوشیدہ نہیں، اور اپنے مستقبل کے متعلق بھی میں کوئی حوصلہ افزا بات نہیں کہہ سکتا۔ میری تمام پونجی صرف ماضی کی یادو ں تک محدود ہے۔ لیکن اپنی کم مائیگی، بے بسی اور بے چارگی کے باوجود میں ثمینہ کو اپنے مستقبل کی تاریکی میں حصہ دار بنانا چاہتا ہوں۔

بلقیس نے پیار سے اپنے دونوں ہاتھ اس کے سر پر رکھ دیے اور کہا میرے بیٹے تمہیں یہ بات کہنے کے لیے اتنی لمبی تمہید کی ضرورت نہ تھی۔ میں ثمینہ کی ماں ہوں اور سمجھتی ہوں کہ وہ تمھارے راستے کے کانٹوں کو پھولوں سے زیادہ دلفریب سمجھتی ہے۔ میں اپنے دل میں ثمینہ کے مستقبل کا فیصلہ اسی دن ک رچکی تھی، جب تم پچھلی بار یہاں آئے تھے۔

مراد علی نے تشکر اور احسان مندی کے جذبات سے مغلوب ہو کر کہا۔ چچی

جان وہ زمانہ اور تھا، اس وقت میں فخر اور غرور سے سر اونچا کر کے آپ سے کوئی بات کر سکتا تھا۔ لیکن اب وہ غرور سرنگا پچُم کی خاک میں دفن ہو چکا ہے۔

بلقیس نے کہا میرے لئے صرف یہ جاننا کافی ہے کہ تم معظم علی کے بیٹے ہو۔

ثمینہ کمرے میں داخل ہوئی اور اس نے مراد علی کی طرف مخمل کی ایک چھوٹی سی تھیلی بڑھاتے ہوئے کہا، لیجیے یہ آپ کی امانت ہے میں بھول گئی تھی،

آن کی آن میں مراد علی کے خیالات کہیں سے کہیں پہنچ گئے، اس نے تھیلی کو ہاتھ لگائے بغیر بھرائی ہوئی آواز میں کہا، ثمینہ اسے اپنے پاس رہنے دو۔ ثمینہ نے اپنی ماں کی طرف دیکھا اور اس کے ہاتھ کا اشارہ پا کر تھیلی سنبھالے کمرے سے باہر نکل گئی۔ بلقیس نے کہا،، بیٹا ہاشم کہتا ہے وہ جواہرات بہت قیمتی ہیں۔ لیکن فرض کرو تم دنیا کے غریب ترین انسان بھی ہوتے تو بھی میں ثمینہ کا ہاتھ تمہارے ہاتھ میں دیتے ہوئے فخر محسوس کرتی۔



اگلے روز مراد علی عشا کی نماز ادا کرنے کے بعد واپس آیا تو اسے پتا چلا کہ ہاشم بیگ پہنچ چکا ہے۔ وہ اپنے کمرے کے قریب پہنچا تو خادمہ نے اس کا راستہ روکتے ہوئے کہا،، جناب آپ کو بیگم صاحبہ بلاتی ہیں۔

وہ اس کے ساتھ چل دیا۔ دو منٹ بعد وہ رہائشی مکان کے ایک کشادہ کمرے میں داخل ہوا، وہاں ہاشم بیگ، تنویر اور بلقیس آپس میں باتیں کر رہے تھے، مراد علی نے السلام علیکم کہا اور ہاشم بیگ نے جلدی سے اٹھ کر گلے سے لگا لیا، اور پھر اپنے قریب بٹھاتے ہوئے کہا۔ ہم ابھی، ابھی آپ کے متعلق باتیں کر رہے تھے، میں ثمینہ اور خالہ جان کو مبارک دے چکا ہوں۔ اور مجھے اس بات پر اصرار ہے کہ بغیر کسی

تاخیر کے آپ کی شادی کر دی جائے۔

موجودہ حالات میں آپ زیادہ دیر یہاں ٹھہر نہیں سکتے۔ جنوبی ہندوستان کے کونے کونے میں جہان خاں کے ساتھیوں کی تلاش جاری ہے۔ جس دن مجھے آپ کے یہاں پہنچنے کی اطلاع ملی تھی۔ اس سے دو دن بعد دکن کی حکومت نے ادھونی کے قریب ایک جنگل سے دس آدمیوں کو پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا تھا۔ میں نے انہیں بچانے کی کوشش کی تھی لیکن وہاں میرا بس نہیں چلا۔ مجھے معلوم ہوا ہے کہ بعض مرہٹہ سرداروں نے بھی آپ کے کئی ساتھیوں کو انگریزوں کے حوالے کر دیا ہے۔ ابھی تک انگریزوں کو شاید آپ کے بارے میں علم نہیں، لیکن آپ زیادہ عرصہ یہاں چھپ کر نہیں رہ سکتے۔ میرے لیے یہ کہنا بہت تکلیف دہ ہے کہ آپ کے لیے یہ علاقہ محفوظ نہیں۔ لیکن آپ کی سلامتی ہمارا پہلا فرض ہے۔

مراد علی نے جواب دیا میں صرف آپ کی آمد کا انتظار کر رہا تھا۔

ہاشم بیگ نے کہا، خالہ جان نے مجھے بتایا ہے کہ آپ افغانستان جانا چاہتے ہیں۔

ہاں

ہاشم بیگ بلقیس کی طرف متوجہ ہو کر بولا، خالہ جان اگر آپ میری رائے سے اتفاق کریں تو کل یا پرسوں ان کی شادی کا انتظام کر دیا جائے، ہمیں کسی لمبی چوڑی تیاری کی ضرورت نہیں صرف خان دان کے چند معززین کو بلا لیا جائے، انھیں رخصت کرنے کے بعد ہم آپ کو اپنے ساتھ ادھونی لے جائیں گے۔

ایک کم سن لڑکا دوسرے کمرے سے نکلا اور سید حامد مراد علی کے قریب آ کر بولا، آپ کا نام مراد علی ہے۔

ہاں میرا نام مراد علی ہے۔اس نے مسکرا کر جواب دیا۔

ہاشم بیگ نے کہا یہ آپ کا بھتیجا ہے۔

کم سن لڑکے نے کہا بھتیجا نہیں بھانجا ہوں، کیوں جی آپ میرے ماموں ہیں نا۔

ہاں لیکن تمہیں کس نے بتایا۔

مجھے خالہ ثمینہ نے بتایا ہے

تنویر نے اسے ہاتھ کے اشارے سے اپنے قریب بلاتے ہوئے کہا۔ یہ تمہارے خالو ہیں بیٹا۔

لڑکا مراد علی کو ایک ثانیہ بغور دیکھنے کے بعد بھاگ کر دوسرے کمرے میں ثمینہ کے پاس پہنچا اور بلند آواز میں بولا خالہ جان امی کہتی ہیں وہ میرے ماموں نہیں خالو ہیں۔۔۔ اور ثمینہ نے آگے بڑھ کر اس کے منہ پر ہاتھ رکھ دیا۔

تین دن بعد مراد علی اور ثمینہ کی شادی ہو چکی تھی۔



دو ماہ بعد مراد اور ثمینہ پہاڑی کے دامن میں بل کھاتی ہوئی ایک سڑک پر گھوڑے روک کر نیچے وادی میں بہتے ہوئے دریا کا دل کش منظر دیکھ رہے تھے۔ منور خان کے علاوہ پانچ چار نوکران سے چند قدم آگے سڑک کے ایک موڑ پر سامان سے لدے ہوئے چار اونٹوں کے پاس کھڑے تھے۔ کابل کا رخ کرنے والے تاجروں کا ایک قافلہ جس کے ساتھ انہوں نے پشاور سے آگے چند منازل طے کی تھیں۔کوئی دو میل پیچھے ایک گھاٹی سے گزر رہا تھا۔

مراد علی نے ایک بستی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے کہا، ثمینہ وہ سردار مکرم خاں

کی بستی ہے۔ اور وہ ہماری آخری منزل ہے۔ اور دریا کے دوسرے کنارے ان سنگلاخ چٹانوں کے پیچھے تمھارے قبیلے کے لوگ آباد ہیں۔ ہم کسی دن ان کے پاس جائیں گے۔ یہ وہ زمین ہے۔ جس نے محمود غزنوی اور احمد شاہ ابدالی کا جاہ جلال دیکھا تھا۔ یہ وہ مقدس خاک ہے جس کے ذرے ذرے پر مسلمانوں کی عظمت کی داستانیں لکھی ہوئی ہیں۔ ہندوستان میں ہمارے آزادی کے پرچم سرنگوں ہو چکے ہیں۔ اور تلوار ٹوٹ چکی ہے۔ جو برسوں سے جنوب میں انگریزوں کی جارحیت کا سیلاب روکے ہوئے تھی۔ ہمارے تمام حوصلے اور ولولے سلطان شہید کے ساتھ سرنگاپٹم کی خاک میں دفن ہو چکے ہیں۔ اب ہندوستان کا کوئی قلعہ کوئی دریا، یا پہاڑ فرنگی جارحیت کے سیلاب کو نہیں روک سکے گا۔ افغانستان کے موجودہ حالات بھی کافی حوصلہ شکن ہیں۔ لیکن مجھے یقین ہے کہ یہ سنگلاخ چٹانیں اس سیلاب کے سامنے آخری دیوار ثابت ہونگی۔ مین یہاں کے امراء کی خانہ جنگیوں سے متاثر نہیں ہوں۔ مجھے ان کسانوں اور چرواہوں کی ہمت پر بھروسہ ہے۔ جو خطرے کے وقت اپنے جھونپڑوں کو اسلام کے ناقابل تسخیر قلعوں میں تبدیل کر سکتے ہیں۔ مین اس ملک میں یہ امید لے کر آیا ہوں کہ کسی دن ہندوستان میں میرے مظلوم بھائیوں اور بہنوں کی فریاد ان لوگوں کو بے چین کر دے گی۔ ان پہاڑوں سے کوئی محمود نمودار ہو گا اور سلطان شہید کی روح دریائے کاویری کے کنارے اس کا استقبال کرے گی۔ اس دن کوئی احمد شاہ ابدالی اٹھے گا اور ہندوستان کے مسلمان اپنے ظلمت کدوں میں ایک نئی صبح کے آفتاب کی روشنی دیکھیں گے۔ پھر اگر ہم نہ ہونگے تو ہماری اگلی نسلیں یہاں سے جنوب اور مشرق کا رخ کرنے والے مجاہدین کے ہم رکاب ہوں گی۔

ثمینہ اس ملک کے غیور اور بہادر انسانوں کے دلوں میں ہمیں اسلام کی وہ

تڑپ اور ولولہ پیدا کرنے کی ضرورت ہے۔ جو محمود غزنوی کو سومنات اور احمد شاہ ابدالی کو پانی پت کے میدان میں لے گیا تھا۔ مکرم خاں سے ملاقات کے بعد میں یہ احساس لے کر گیا تھا۔ کہ اگر افغانستان مین کوئی خدا کا بندہ اسلام کی صحیح روح بیدار کر سکا، تو یہ سرزمین اسلام کا ایک ناقابل تسخیر قلعہ ثابت ہو گی۔ میں یہ نہیں کہہ سکتا کہ یہاں میں نے اپنے مستقبل کے متعلق جو خواب دیکھے ہیں۔ وہ کس حد تک پورے ہوں گے۔ لیکن مین تم سے ایک وعدہ کر سکتا ہوں کہ اب ہمارے مقدر میں انگریزوں کی غلامی نہیں ہو گی۔

چند منٹ بعد وہ اپنے حال اور مستقبل کے متعلق باتیں کرتے ہوئے آگے بڑھے۔ اور ان کے تھکے ہوئے گھوڑے آہستہ آہستہ وادی کی طرف اترنے لگے، اگلے موڑ پر منور اور دوسرے آدمی ان کے ساتھ آ ملے۔ عصر کی نماز کا وقت ہو چکا تھا۔ تھوڑی دیر بعد وہ دریائے کابل کے کنارے پہنچ گئے۔ مراد علی گھوڑے سے اترا اور وضو کے لیے ایک پتھر پر بیٹھ گیا۔ اچانک اس کی آنکھوں کے سامنے دریائے کاویری کے دل کش مناظر آ گئے۔ وہ تصور کے عالم میں سرنگا پٹم کے قلعے کی فصیلیں اور برج دیکھ رہا تھا، وہ شہر کی پر رونق گلیوں میں گھوم رہا تھا۔ وہ اپنے بچپن اور جوانی کے ساتھیوں کے ہمراہ سرنگا پٹم کے خوب صورت باغات کی سیر کر رہا تھا۔ وہ ان دل کش مساجد کا طواف کر رہا تھا۔ جہاں کبھی ہر نماز کے بعد سلطان ٹیپو کی فتح کی دعائیں مانگی جاتی تھیں۔۔۔ پھر یکے بعد دیگرے اس کے سامنے اپنے گھر کی مختلف تصویریں آنے لگیں۔ زندگی کی کتنی مسرتیں تھیں جو وہاں دفن ہو چکی تھیں۔ کتنے قہقہے تھے، جو گم ہو گئے تھے۔ جب کافی دیر ہو گئی تو ثمینہ نے پیچھے سے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔ آپ کیا سوچ رہے ہیں؟ مراد نے مڑ کر دیکھا اور اس کی چھلکتی

ہوئی آنکھوں سے آنسو ٹپک پڑے۔

کیا ہوا ثمینہ نے بھرائی ہوئی آواز میں کہا آپ رو رہے ہیں؟

کچھ نہیں ثمینہ یہ آنسو دریائے کاویری سے دریائے کابل تک پہنچنے والے مسافر کی زندگی کی آخری متاع ہیں۔۔

ختم شد ---- THE END